باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

افسانے

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ)......890 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی
Phone : 021-35893121 - 35893122
Email : pearlpublications@hotmail.com

ہم نہیں بھولے......
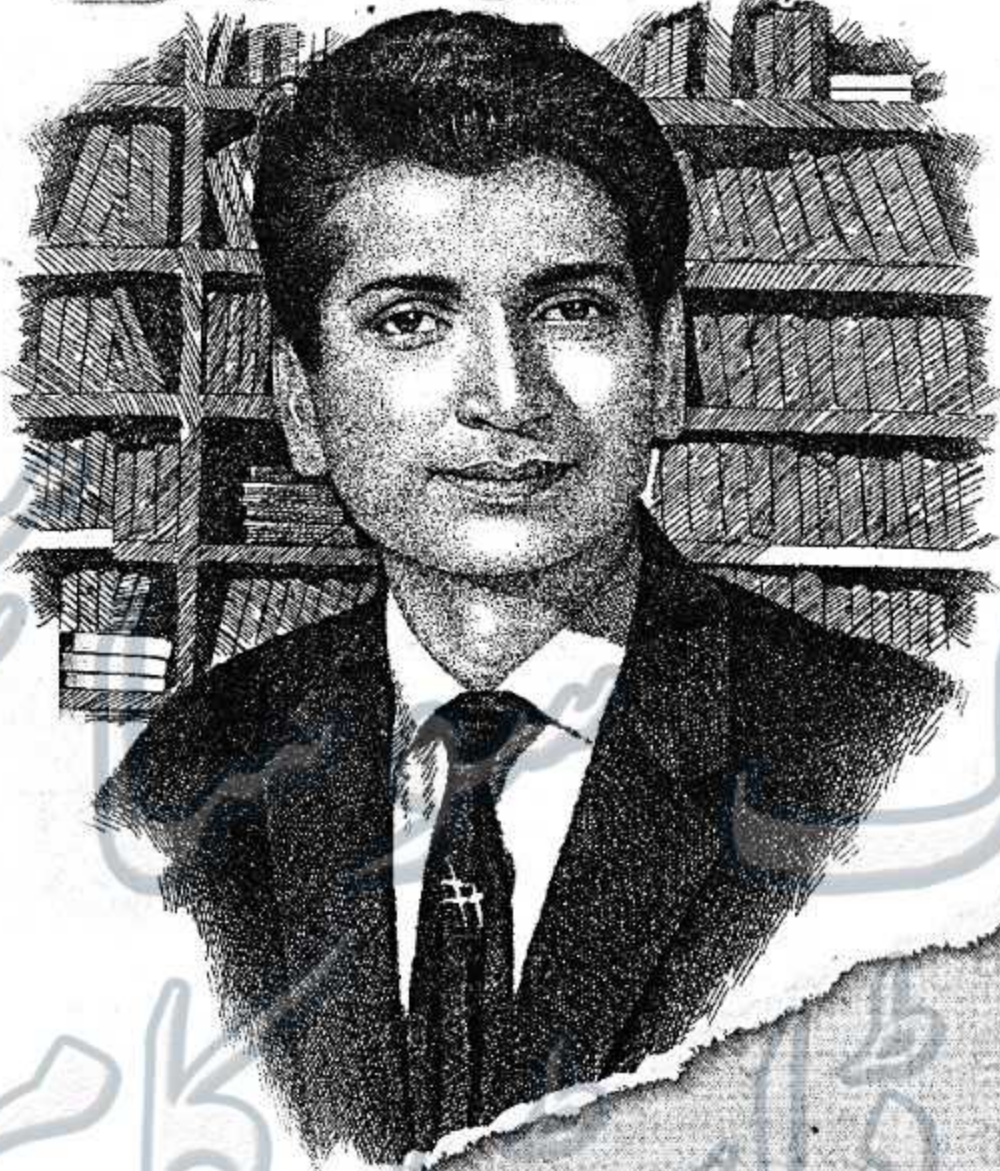
1932ء......2002ء

یہ رنگ رنگ کہانی ، یہ حرف حرف فسوں
تمہارے عزم کو ہم سب سلام کرتے ہیں

قدم بڑھاؤ

کچھ دن قبل صوبائی وزیر اطلاعات مولا بخش چانڈیو صاحب نے بہت اچھا بیان دیا، ویسے وہ اکثر و بیشتر اچھی باتیں ہی کرتے ہیں کیونکہ وہ درحقیقت ایک نیک انسان ہیں پھر ماہِ رمضان کی برکتوں اور شیطان کے پابند سلاسل ہونا بھی اس اچھے بیان کا سبب رہا ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ دہشت گرد معصوم لوگوں، قومی ہیروز اور امن کے سفیروں کو نشانہ بناتے ہیں۔تو چانڈیو صاحب حکومت کے ایوانوں میں بیٹھے لوگ تو ان تمام صفات سے عاری ہیں، یہ بات تو طے ہے لہٰذا اس قدر بڑے بڑے پروٹوکول' سکیورٹی' چہ معنی دارد فخر عالم صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ یا تو حکومت عام آدمی کی زندگی کی حفاظت کرے یا بلاوجہ عوام کا ٹیکس کا پیسہ اپنی حفاظت پر خرچ نہ کرے۔ ہمارا پیسہ ہم ہی پر لگنا چاہیے۔فخر عالم صاحب تمام پاکستانی آپ کی بات کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں قدم بڑھاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ آخر میں دوشیزہ پڑھنے والے تمام ساتھیوں کو عیدالفطر مبارک......

منزہ سہام

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت

رابطوں کی دلفریب محفل

منزہ علی

میرے عزیز لکھاری اور قارئین عید الفطر کی ڈھیروں مبارک باد۔ یقیناً یہ خوشیوں بھرے دن آپ سب نے اپنے پیاروں کے ساتھ گزارے ہوں گے۔ اس بار رمضان سے قبل مینا تاج نے بڑا دکھ دے ڈالا۔ جس شخص سے روز کا ملنا ہو اور پھر وہ اچانک خبر کی صورت آپ تک پہنچے...... یہ صورت حال بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بہر حال یہی زندگی ہے خوشیاں اور غم ساتھ ساتھ ہیں۔ اللہ مینا کو جنت الفردوس میں جگہ دے امجد صابری صاحب کے ایصال ثواب کے لیے یقیناً ہم سب ہی دعا گو ہیں۔ ایک رمضان اور تمام ہوا اور جب یہ سطور آپ کی نظروں سے گزر رہی ہوں گی عید الفطر بھی کافی باسی ہو چکی ہوگی۔ ہماری ننھی منی لکھاری دانیہ آفرین 15 جولائی کو پیا کے گھر جا رہی ہیں۔ میری اور ادارے کی جانب سے بے شمار دعائیں اور نیک تمنائیں...... میں ان تمام لکھاریوں کا دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جنہوں نے میری بات کا مان رکھا اور اپنی تحریر ارسال کی اور میں اُن کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے میری آواز کو نقار خانے کی گونج جانا کوئی بات نہیں کبھی نہ کبھی تو سامنا ہوگا۔ پھر میں وہ غزل کا مصرعہ ضرور پڑھوں گی۔ ''ہم بھی دیکھیں گے'' اور اب بڑھتے ہیں پہلے خط کی طرف۔ کراچی سے طویل مدت بعد دوشیزہ کی سابق ایڈیٹر غزالہ رشید تشریف لائی ہیں لکھتی ہیں ''منزہ تم نے مینا تاج کی خبر دی یقین مانو سانسیں تھم سی گئیں حالانکہ موت اٹل ہے مگر پھر بھی کل تک جو لوگ ہنستے مسکراتے نظر آتے تھے آج جب بند آنکھوں اور ساکت وجود کے ساتھ نظروں کے سامنے ہوتے ہیں تو دل دہل جاتا ہے۔ میرا دل بہت اُداس ہے اور ابھی اُس کیفیت سے باہر نہیں آئی تھی کہ امجد صابری کا سانحہ ہو گیا۔ بہر حال کیا کیا جائے سوائے دکھی ہونے کے...... اللہ جانے والوں کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ دوشیزہ پابندی سے مل رہا ہے تمہاری محنت نظر آتی ہے۔ میں نے ایک افسانہ بند دروازے بھیجا ہے دیکھ لینا۔ اپنا بہت خیال رکھو اللہ حافظ۔''

☜: بہت ہی عزیز غزالہ! اچھا لگا آپ کو محفل میں پا کر آتی رہا کریں۔ مینا کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا اپنے انتقال سے کچھ دن پہلے بھی ہم دونوں نے ساتھ لنچ کیا تھا وہ بولتی رہی اور میں سنتی رہی مگر جب میں نے اس کو خاموش لیٹے دیکھا تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے ابھی اٹھ کر بیٹھ جائے گی اور کہے گی میں تو مذاق

سانحۂ ارتحال

ایڈیٹر سچی کہانیاں کاشی چوہان کے پھوپا طالب حسین اور خالو خورشید احمد گزشتہ ماہ وفات پا گئے۔ قارئین سے مرحومین کے ایصال ثواب کے لیے دعا کی درخواست ہے۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور اہل خانہ کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

کر رہی تھی۔ یقیناً اس کے بیٹے، اس کے والدین کے لیے یہ نا قابل تلافی دکھ اور نقصان ہے۔ امجد صابری صاحب بھی چل دیے یہ دکھ بھی بہت بڑا ہے۔ اللہ سب جانے والوں کے درجات بلند فرمائے۔

✉ : لندن سے تشریف لائی ہیں سعدیہ میٹھی صاحبہ، لکھتی ہیں۔ سوئٹ منزہ! پرچے پابندی سے ملتے ہیں شکریہ مینا تاج کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ دوشیزہ پورا پڑھ لیا ہے سبھی افسانے اچھے تھے مگر مجھے سکینہ فرخ کا محبت گمان سے حقیقت بہت اچھا لگا۔ بنتِ حوا کا اختتام بہت اچھا ہوا۔ چٹپٹی خبریں، نئے لہجے نئی آوازیں بھی زبردست تھے۔ منزہ جی آپ بھی چیک کیجیے گا الماس روحی صاحبہ کا 'قدریں' اپریل **2013**ء 'دیا جلائے رکھنا' کے نام سے چھپ چکا ہے اور اُن کا ایک خط ایک کہانی بھی میں پہلے پڑھ چکی ہوں بس آپ کے علم میں لا رہی تھی۔ میں نے اہتمام رمضان کے نام سے افسانہ ارسال کیا ہے جانتی ہوں پرچہ تو عید کے بعد آئے گا مگر پلیز چھاپ دیجیے گا اپنا بہت خیال رکھیں جلد ملاقات ہوگی۔

ﷺ : ڈیئر سعدیہ! دوشیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ اور سکینہ فرخ تک آپ کی پسندیدگی ضرور پہنچ جائے گی۔ افسانہ بہت اچھا تھا اس لیے جولائی کے شمارے میں موجود ہے الماس روحی کے افسانے کی نشاندہی کا شکریہ میں آئندہ بھی امید کروں گی کہ آپ اسی توجہ اور محبت سے دوشیزہ کا مطالعہ کریں گی۔

✉ : کراچی سے ہی تشریف لائی ہیں فرح اسلم قریشی، لکھتی ہیں۔ زندگی جس تیزی سے گزر رہی ہے اُس کی رفتار دیکھ کر تو اب ڈر ہی لگنے لگا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات تھی جب چودہ سال پہلے ڈرتے ڈرتے میں نے دوشیزہ کی محفل میں قدم رکھا تھا۔ مگر آپ کے مان، محبت اور خلوص نے وہ اعتماد دیا کہ اب بنا کسی خوف کے جب جی چاہے محفل میں آ دھمکتے ہیں۔ رمضان اپنی بابرکت مصروفیات کے ساتھ رواں دواں ہے۔ تمام اہلِ دوشیزہ کو رمضان بلکہ عید کی ڈھیروں مبارکباد۔ وعدے کے مطابق تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں۔ محفل میں پہلا خط عقیلہ حق کا تھا۔ جن کا پیار بھرا شکوہ پڑھ کر لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مگر میں عقیلہ کو بتانا چاہتی ہوں کہ محفل میں نہ ہونے کے باوجود میں خطوط پڑھتے ہوئے عقیلہ حق کا خط ضرور ڈھونڈتی تھی اور یقیناً دوسرے ساتھی بھی یہی کرتے ہوں گے کہ اب تو تمہارے خطوط مرزا غالب کے خطوط سا مزہ دینے لگے ہیں۔ لگتا ہے آج کل حسِ ظرافت عروج پر ہے۔ پیاری سنبل اور صبیحہ شاہ کو ایوارڈ مبارک ہو شگفتہ شفیق کیسی ہیں؟ آپ جانتی ہیں کہ دوشیزہ کی محفل آپ کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ دعاؤں میں رہنے کے لیے بیمار ہونا ضروری ہے کیا؟ مجھے آپ ہنستی کھلکھلاتی اچھی لگتی ہیں اور دل سے بے ساختہ دعا نکلتی ہے کہ ہمیشہ ایسی شگفتہ و شاداب رہیں (آمین) اب بات ہو جائے اس ماہ کے رسالے کی۔ مکمل ناول چونکہ مکمل نہیں تھا اس لیے اُس پر تبصرہ قبل از وقت ہوگا تاہم شمیمہ معین کا اندازِ تحریر متاثر کن ہے۔ صدف آصف کا طواف آرزو ایک کریہہ انسانی فطرت کی بہترین عکاسی تھا۔ ثنا کا انجام بھی حسبِ توقع تھا۔ ویلڈن صدف......فوزیہ احسان کا دھوپ

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

جون 2016 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

محبت گمان سے حقیقت — سکینہ فرخ

آپ کی نظر میں اس ماہ "دوشیزہ" کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ — جولائی 2016

عنوان: ____________

قلم کار: ____________

نام: ____________

پتا: ____________

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

سانحۂ ارتحال

ہمارے ساتھی، سرکولیشن منیجر محمد اقبال زمان کے بہنوئی محمد زمان گزشتہ ماہ طویل علالت کے بعد وفات پا گئے۔ قارئین سے مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے دعا کی درخواست ہے۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور صبر کی دعا کرتا ہے۔

چھاؤں اگر مکمل ناول کی طرز پر تحریر کیا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ کیونکہ موضوع اتنا زبردست تھا کہ اس پر مزید تفصیل سے لکھا جا سکتا تھا اور فوزیہ احسان تو اِس سے پہلے بھی کئی زبردست ناول تحریر کر چکی ہیں اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا۔ افسانوں میں سکینہ فرخ کا محبت گمان سے حقیقت ایک درمیانی درجے کی تحریر تھی۔ جس کے مرکزی خیال سے مجھے اختلاف ہے میمونہ صدف کا آبِ عائشہ ایک نازک سا خیال تھا۔ گو کہ یہ موضوع پہلے بھی کئی بار پڑھا جا چکا ہے مگر چونکہ حقیقت آج بھی جوں کی توں ہے کہ ماں کو اولاد کا نام رکھنے کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے اس لیے اچھا لگا نگہت غفار کا مجھے اپنی ذات کا...... بڑی پیاری تحریر تھی۔ اعتراض صرف ایک بات پر ہے کہ اشعر نے فوراً بھائی کا روپ کیسے دھار لیا۔ اگر کوئی واقعہ ڈال دیا جاتا تو اچھا تھا۔ ڈاکٹر الماس روحی کا افسانہ قدریں اچھا لگا۔ الفاظ کا چناؤ متاثر کن رہا۔ فروا کا اپنی اقدار کو بھول جانا دکھی کر گیا۔ سحرش فاطمہ نے احساس کے ذریعے مردوں کو احساس دلانے کی کوشش کی کہ بیویوں کو بھی انسان سمجھنا چاہیے وہ مشین نہیں ہوتیں اور زیادہ اچھی بات یہ لگی کہ ایک مرد کی زبانی ہی مردوں کو آئینہ دکھایا گیا۔ فرزانہ نگہت کا روشن راستہ سوچ کے راستے روشن کر گیا۔ بہت خوب...... صرف ایک تحریر نہیں پڑھ پائی وہ ہے وہمی دل...... مگر وعدہ اگلے خط میں ثمینہ فیاض کو مایوس نہیں کروں گی۔ باقی تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح بہتری کی طرف گامزن، نئے لہجے نئی آوازیں میں خولہ عرفان کی نظم اچھی لگی۔ اور علی رضا کی پیامبر بھی ...... انشاء اللہ اگلے خط میں نئے تبصرے کے ساتھ پھر حاضری دوں گی۔ تب تک کے لیے اجازت۔

ھ: پیاری سی فرح آپ نے دوشیزہ کے لیے وقت نکالا بہت شکریہ مجھے یقین ہے کہ یہ وقت آئندہ بھی مجھے ملتا رہے گا آپ نے درست لکھا ہے وقت کی رفتار سے تو اب خوف سا محسوس ہونے لگا ہے میں تو اپنے آپ کو چودہ سال پرانی منزہ ہی سمجھتی ہوں مگر میرے اس خیال کی نفی روز میرے بیٹے کر دیتے ہیں بچے جوان ہو گئے اللہ سب کو اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ شگفتہ شفیق کو بلائی جلائی رہا کریں غائب ہو جاتی ہیں وہ......

✉: کراچی سے گلابی آنکھوں کے ساتھ آمد ہوئی ہے خولہ عرفان کی، لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! دعا ہے کہ خدا بزرگ و برتر رمضان کے مہینے کی فیوض و برکات سے تمام امت مسلمہ کو عموماً اور آپ کو خصوصاً نوازے آمین۔ اس دفعہ منزہ مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ آپ کو تبصرہ روانہ کر سکوں گی۔ کیونکہ **Eye Ball** دکھن کا شکار تھی اس کی وجہ مسلسل نو دن آغا خان بورڈ جا کے کمپیوٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میتھس کے پیپر کی چار گھنٹے بیٹھ کر چیکنگ کرنا ہے۔ یقین کریں آنے کے بعد بچیوں سے آئس کیوب نکلوا کر آنکھوں کی ٹکور کرتی تھی اور آبِ زم زم ڈالتی تھی تاکہ آنکھوں کو کمپیوٹر کا مقابلہ کرنے کے لیے دوبارہ تیار کر سکوں۔ اب آنکھیں کافی بہتر ہیں لیکن تیز روشنی سے درد ہونے لگتا ہے۔ بہرکیف جب دوشیزہ آ گیا تو آپ کے خوبصورت جواب نے مجبور کر دیا کہ مفصل تبصرہ تحریر کر دیا جائے۔ لہٰذا اب میں میتھس کے تپتے صحرا سے ادب کے نخلستان کی طرف

نکل آئی ہوں اور افسانوں، ناولوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر آپ کے لب ولہجہ کی شیرینی سے ذہن کو تراوہٹ پہنچاتے ہوئے تبصرہ کے لیے زمین ہموار کرلی ہے۔ آپ کی دعا کے آخر میں پورے جذب وخلوص کے ساتھ اپنی آمین شامل کردی ہے۔ محفل میں اپنے ساتھ دوست کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اللہ اس کے قلم کو سدا رواں رکھے آمین۔ سنبل کا خط پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ سنبل واقعی حق بجانب ہیں۔ میرے نزدیک تبصرہ مصنفین کا حق ہے اور اپنی قیمتی رائے سے مصنفین کو ضرور آگاہ کرنا چاہیے۔ سنبل اتنے تفصیلی جواب پر جزاک اللہ! خدا کرے زورِ بیاں آپ کا اور زیادہ آمین۔ اسماء اعوان کا لائف بوائے یقین محبت جگائے، اچھی کہانی تھی۔ یہ شک کا ناگ بھی گھر کے گھر نگل جاتا ہے۔ اللہ ہم سب کو محفوظ رکھے۔ رفعت سراج کا ناول کیا کہوں ان کی تحریر ہمیں بولنے اور قلم کو لکھنے کے قابل نہیں چھوڑتیں کردار کے اندر جا کر لکھتی ہیں اور کیا خوب لکھتی ہیں۔ برجستہ جملے اور جذبات نگاری ختم ہے۔ محبت گماں سے حقیقت سکینہ فرخ کا اچھا افسانہ تھا۔ اس مشینی دور میں جبکہ انسان نے اپنے جذبات واحساسات کو وقت کے ہاتھوں رہن رکھ دیا ہے۔ تو ایسی صورت حال کا پیش آنا لازمی ہے۔ کہانی کا انتخاب اور اندازِ تحریر دونوں جاندار تھے۔ ثمینہ فیاض کا وہمی دل بھی اچھی تحریر تھی۔ نفیسہ سعید کے ناولٹ بنتِ حوا کا انجام بہت اچھا ہوا۔ مطلبی اور خودغرض لوگوں کو ان کے کیے کی سزا بھلے دیر سے ملے لیکن ملتی ضرور ہے۔ زرافشاں فرحین نے کانچ کی گڑیا میں کانچ جیسے جذبات رکھنے والی لڑکی کے جذبات کی اچھی عکاسی کی ہے۔ یہ حقیقت ہے بحیثیت عورت ہر ایک اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہا ہوتا ہے۔ اگر اس کا ساتھ دینے والا قوی نہ ہو تو ام مریم کا رحمٰن رحیم سدا سائیں کی طوالت سے اب ہماری بھتیجی صاحبہ پریشان تھیں پرزور اصرار تھا کہ میں اس کی اختتامی تقریب رونما ہوجانے کے بارے میں لکھوں لیکن شکر محفل میں پڑھ کر مطمئن ہوگئیں۔ میمونہ صدف کا آبِ عائشہ، صدف آصف کا طوافِ آرزو بتکمیل خواہشات سے مربوط اچھے افسانے تھے۔ نگہت غفار کا مجھے اپنی ذات کا محور کردے ازدواجی زندگی سے متعلق ایک اچھا افسانہ تھا۔ فوزیہ احسان رانا کا دھوپ چھاؤں زندگی بھی گھریلو زندگی میں عورت کے کردار کی اہمیت کو اجاگر کرتا ناولٹ تھا۔ اندازِ تحریر اور کہانی دونوں کا انتخاب موزوں تھا اور جناب ڈاکٹر الماس روحی کا قدریں دل کے تار جھنجھوڑ گیا بہت اچھے، جب انسان اپنے نفس کے تابع ہوجاتا ہے تو اچھائی اور برائی کا فرق ختم ہونے لگتا ہے۔ بہت عمدہ تحریر تھی۔ سحرش فاطمہ کا احساس بھی حقوقِ نسواں کی ترجمانی کرتا اچھا افسانہ تھا۔ جس طرح مشرقی عورت شرم وحیا کا پیکر ہوتی ہے۔ اسی طرح لگتا ہے مشرقی مرد حوصلہ شکن رویے اور تنقید نگاری کا پیکر ہوتا ہے اور خصوصاً اپنے نصف بہتر کے عیوب کی تشہیر حق مردانگی سمجھتا ہے۔ کاش یہ نوے فیصد ہمارے ایشیائی مرد کا مزاج سدھر جائے آمین۔ فرزانہ نگہت کا روشن راستہ بہت پیاری تحریر تھی۔ وہ بہت عمدہ انداز سے کہانی اٹھاتی ہیں اور دلچسپ موڑ دے کر سبق آموز انجام دیتی ہیں۔ شمیمہ معین کا ناول ابھی زیر مطالعہ آنے سے رہ گیا ہے اس پر تبصرہ اگلے ماہ ہوجائے گا انشاء اللہ۔ اسماء اعوان ہمیشہ کی طرح دوشیزہ گلستان میں خوبصورت گلدستہ سجائے ملیں۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں نسیم سکینہ صدف کی شاعری بہت گہری اور روح میں اترتی لگی اپنی شاعری کے علاوہ ہاہاہا...... اپنے منہ میاں مٹھو بننا اچھا نہیں لگتا۔ کچن کارنر کی ریسپیز روزے میں مزید امتحان لیتی لگیں۔ لیکن ماحصل یہ ہے منزہ کہ یہ دوشیزہ ہماری زندگی سے اپنا حصہ نکال ہی لیتا ہے۔ نہ

ہوئے ابامرحوم ورنہ رمضان کے مہینے میں دوشیزہ پڑھتے دیکھ لیتے تو ایسا روح فرسا مذہبی لیکچر دیتے کہ آئندہ نسل تک شرمندہ پیدا ہوتی۔ لیکن والد بزرگوار اور اپنے رب سے معافی کے ساتھ اختتامی کلمات کہہ دیتی ہوں۔ بہت خوبصورت افسانوں سے مزین دوشیزہ کی ادارت پر منزہ جی کو بہت بہت مبارک مزید یہ کہ جب اگلا شمارہ عید کی سوغات کی صورت ہمارے ہاتھوں میں جلوہ گر ہوگا تو عید کی سویاں ہضم ہوچکی ہوں گی لیکن اس کی خوشیوں کے رنگ مہک رہے ہوں گے۔ امید ہے کہ دوشیزہ ان خوشیوں میں مزید چار چاند لگا دے گا آمین۔ بہت ساری دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ دوشیزہ منزہ، کاشی، مصنفین دوشیزہ، مبصرین دوشیزہ اور اراکین دوشیزہ کو خولہ عرفان کی طرف سے پیشگی 'عید مبارک'

ھ: سوئٹ خولہ! اللہ آپ کو نظر بد سے محفوظ رکھے مگر یہ آنکھوں سے کس پر بجلیاں گرا دیں جو گلابی ڈورے دوڑ گئے اتنا مفصل تبصرہ اگر مجھے نہیں ملتا تو بہت دکھ ہوتا اپنا بہت خیال رکھیے گا مجھے اگلے ماہ بھی آپ کا انتظار رہے گا۔

✉: اور یہ ہیں شبانہ نسیم لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! میں آپ کی بہت مشکور ہوں کہ آپ نے اپنے ماہنامہ دوشیزہ میں میری تحریر کو جگہ دی اگر آپ اسی طرح میری حوصلہ افزائی کرتے رہے تو انشاء اللہ تعالیٰ میں آپ کو افسانے بھی لکھ بھیجوں گی۔

ھ: اچھی سی شبانہ! میری تو کوشش ہوتی ہے کہ کسی کی بھی حوصلہ شکنی نہ ہو دوشیزہ کے مزاج کے مطابق لکھتی رہو میں کیوں نہیں چھاپوں گی۔

✉: کراچی سے پہلی بار تشریف لائی ہیں حنا احمد لکھتی ہیں۔ دوشیزہ ادارے کے لیے پہلی بار رقمطراز ہوں کچھ مسائل کی بنا پر اتنی لیٹ لیٹر آپ تک پوسٹ کررہی ہوں معلوم نہیں اب شائع بھی ہوگا یا نہیں۔ پلیز اگر ہوسکے تو اس خط کو ضرور شائع کردیجیے گا مہربانی ہوگی۔ کیونکہ خود اکیلی جا کر اتنی زیادہ دور مشقت اٹھا کر پوسٹ کرنے جاتی ہوں خیر...... میں دوشیزہ ادارے (پیارے پیارے) کے لیے اپنی چھوٹی سی تحریر (تربیتِ انداز) بھیج رہی ہوں آپ نو آموز لکھاریوں کو آگے بڑھنے میں مدد دے رہے ہیں سو اس لیے یقین کریں مجھے معلوم ہے کہ میں ایک بہت اچھی مصنفہ بنوں گی۔ پلیز، پلیز، پلیز اس ماہ تو ممکن نہیں لیکن رمضان مبارک جون میں پڑھ رہے ہیں۔ پلیز دوشیزہ کے اتنے صفحات میں اس کو بھی جگہ دے دیں میں نے ایک ناولٹ بھی قلمبند کیا ہوا ہے وہ بھی آپ کو دینے کا ارادہ ہے۔ کیا آپ مجھے ایک موقع فراہم کریں گے؟ دیکھیں یہ افسانہ تین مرتبہ لکھا ہے (یعنی دو مرتبہ رف اور تیسری بار پرفیکٹ) اس قدر لگن اور محنت سے لکھی تحریر کو کہیں ردی میں نہ ڈال دیجیے گا۔ پلیز اسے ضرور جگہ دیں تو مہربانی ہوگی۔ اگر تھوڑی بہت نوک پلک سنوارنی پڑے تو شروع سے انسان بالکل پرفیکٹ نہیں لکھتا کوئی بھی ادارہ ہمیشہ تھوڑی بہت غلطیاں نظر انداز کرتا ہے۔ دیکھیں میرا بہت دل دکھے گا اگر تحریر ضائع ہوگئی تو میرے ساتھ یوں نہ کیجیے گا اور اگر اس ماہ لیٹر شائع نہیں کرسکتے تو پھر نیکسٹ منتھ میں، نہ جانے کتنی لیٹ یہ آپ تک پہنچے گی میرے پاس وقت بھی نہیں ہے۔ سوچا تھا جون میں پوسٹ کردوں گی مگر رمضان کے سبب پیدل اتنا سفر نہیں کرسکوں گی گھر سے نکلنا غیر ممکن ہوگا۔ دیکھیں اگر انسان ٹیلنٹ رکھتا ہے تو اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے پلیز ضرور ضرور ضرور میری چھوٹی سی تحریر کو جگہ دے دیں میں سمجھوں گی دوشیزہ ادارے نے مجھے جگہ دے دی۔ پہلی بار خط کے لیے اور تحریر کے لیے آپ سے گزارش

ایک تھی مینا

لفظ ہی لفظ ہیں بکھرے مرے چاروں جانب
"کھٹیا، شمع کب تک جلی، میٹھا پانی
چائے کا ایک کپ، کباڑی کی جورو"
اَن گنت لکھ کے فسانے چھوڑے
لفظ اُگتے ہیں، بڑے ہوتے، مرجھاتے ہیں
پر جو آواز تری ہے وہ کہاں کھوتی ہے
درد آنکھوں میں چھپا کر تُو بہت ہنستی تھی
لفظ بیمار تھے، تجھ سے وہ ادا ہونہ سکے
تُو نے جانے کی بھی اک طرح پلاننگ کی تھی
سب سے مل جاؤں گی، اک یاد بھی دے جاؤں گی
مجھ کو بڑھاپے سے ڈر لگتا ہے اماں میری
میں تجھے چھوڑ، جوانی میں چلی جاؤں گی
ہر طرف تیری ہی آوازیں ہیں گھر میں تیرے
پیڑ جو تُو نے لگائے تھے ہیں چپ چاپ کھڑے
پھول کھلتے ہیں مگر آنکھ میں پانی لے کر
ہاں تیرا پھول "علی" اب بھی ہے سہما سہما
تُو نے آنے کا کہا تھا کہ آؤں گی بیٹا
بس تُو چپ ہی رہی اور دور، بہت دور گئی
ہائے مینا تیرے اماں باوا......
ہائے مینا تیرے رشتے سارے......
ہائے مینا بھلا ایسے بھی کوئی کرتا ہے
لفظ ہی لفظ بکھیرے اور پرواز بھری

انا للہ وانا الیہ راجعون

(مینا تاج اب ہم میں نہیں)

کر رہی ہوں یہ نہ ہو کہ پہلی بار مایوسی ہو۔

ھ: حنا! تمہارا خط تو مل گیا مگر افسانہ کہاں ہے؟...... مجھے ارسال کرو میں تمہیں پڑھ کر بتاؤں گی۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی بھی لکھاری کو مایوس نہ کروں جہاں اصلاح کی گنجائش ہوتی ہے وہاں ضرور رہنمائی کرتی ہوں۔ تم دوشیزہ سے محبت کرتی ہو تو مجھے بھی بہت عزیز ہو آئندہ محفل میں شرکت کرو تو تبصرے کے ساتھ آنا اچھے لگے گا۔

✉: کراچی سے آمد ہے مومنہ بتول کی، لکھتی ہیں۔ بہت اچھی منزہ، احوال میں آپ کا جواب ملا۔ دل کو تسلی ہوئی کئی افسانے جو مجھے بھی یاد نہیں رہے کہ کاپی نہیں رکھتی مگر آپ کے پاس یقیناً محفوظ ہوں گے اور اپنی جگہ بنالیں گے مگر اتنا عرصہ انتظار اب تو میرا حق بنتا ہے کہ دوشیزہ کے صفحات پر اپنا نام اور افسانہ دیکھوں۔ کیا خیال ہے؟ اب دوشیزہ ایوارڈ کے بارے میں پڑھا بس یہ پوچھتی ہوں کہ آپ صرف پرانے لکھنے والوں کو مدعو کرتے ہیں یا نئے کو بھی موقع دیتے ہیں۔ منزہ صاحبہ اپنا یہ چھوٹا سا افسانہ بعنوان 'حسرت ناتمام' بھجوا رہی ہوں وعدہ دیں قریبی اشاعت میں شامل کریں۔

ھ: اچھی مومنہ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ دعوت نامہ صرف پرانے لکھاریوں کو دیا جاتا ہے ایسا بالکل نہیں ہے میں اپنے تمام لکھاریوں کو یکساں عزیز رکھتی ہوں اب کا تبصرہ حذف کر دیا کیونکہ وہ پرانہ تھا گڈ بائے میری بیٹی اس شمارے میں موجود ہے افسانہ پڑھ کر آپ کو ضرور بتاؤں گی۔ رابطہ میں رہا کریں۔ اور خط ہر ماہ کی **20** تاریخ تک لازمی ارسال کر دیا کریں۔

✉: راولپنڈی سے تشریف لائی ہیں فرزانہ نگہت صاحبہ، لکھتی ہیں۔ امید ہے بفضل اللہ تعالیٰ بخیریت ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بے پناہ رحمتوں اور برکتوں کا نزول فرمائے آمین۔ اس ماہ کی سچی کہانیاں میں اپنی تحریر کی اشاعت پر دلی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ خواہش تھی یہ دامن دوشیزہ میں جھلملا جائے۔ مگر آپ کی مرضی...... بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے پسند کیا۔ امید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔ اور یہ طویل کہانی دلنشین بہت عرصہ پہلے لکھنی شروع کی تھی۔ سال گزرتے رہے یہ چیونٹی کی رفتار سے آگے سرکتی رہی۔ اب مکمل ہوئی ہے تو آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔ خواہش شروع ہی سے آپ کو بھیجنے کی تھی۔ دامن دوشیزہ میں جگہ پا جائے تو زہے عزوشرف...... امید بلکہ یقین واثق ہے کہ ضرور بضرور پسند آئے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وتندرستی عروج و ترقی کی بے پناہ نعمتوں سے نوازتا رہے۔ اس کی بے پناہ نوازشات آپ پر سایہ فگن ہیں۔ رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں آمین۔ باقی امید ہے سب خیریت ہوگی۔ دیگر اراکین ادارہ واہل خانہ کی خدمت میں سلام و آداب کہہ دیجیے والسلام۔

ھ: ڈیئر فرزانہ! آپ کی آمد کا شکریہ دیکھیے جولائی کے شمارے میں آپ کی روشن راستے بھی موجود ہیں اسی طرح چراغ چلائے رکھیے گا۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں روحیلہ خان، لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ آپی سدا خوش رہیں۔ اپریل کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو حیرت ہوئی لیکن جب کھول کر پڑھا تو خوشی ہوئی کہ میرا افسانہ 'قربانی اور خون' چھپا ہوا تھا اُسے تحریر کیے کافی وقت گزر چکا ہے پر اسے چھپنے کی باری اب آئی تھی میں خود بھی بھول چکی تھی ویسے یہ یاد دلانے کا بہت پیارا نسخہ ہے۔ بہت اچھا لگا۔ حقیقت یہ ہی ہے کہ آپ جیسے پیارے لوگ ہی ہمیں یاد رکھتے

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ
وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔
وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا
کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو
ہوتا ہے۔
قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ
سی کوشش۔
بہت جلد.....
اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب
اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔
”بس تھوڑا سا انتظار......“

نیا ناول

پیارے قارئین! ہماری بہت عزیز لکھاری اُم مریم کا ناول ''رحمٰن، رحیم، سدا سائیں'' اس ماہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ اگلے ماہ سے دوشیزہ کی ہردلعزیز لکھاری زمرنعیم جنہیں ناول لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ ایک بار پھر اپنے قلم سے دوشیزہ قارئین کے لیے ناول کی صورت میں ایک سوغات لیے حاضر ہوں گی۔ امید ہے زمرنعیم کا یہ ناول بھی یقیناً بہنوں سے پذیرائی کی سند حاصل کرنے میں کامیاب رہے گا۔

ہیں۔ جب سے اخبار کے لیے کام شروع کیا ہے مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ اس دوران ٹی وی کے لیے بھی کام کیا لیکن محسوس یہ کیا کہ وہاں معاوضے زیادہ ہوتے ہیں لیکن اس کے دوسرے اثرات بھی ہوتے ہیں جن سے ذہن اُلجھتا ہے بہرحال اس کھینچا تانی کی دنیا کے اِدھر ایک بہت خوبصورت پُرسکون دنیا بھی ہے جہاں خلوص محبت اور سچائی معنی رکھتی ہے۔ اُس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مجھے کسی سے گلہ ہے۔ بس خط لکھنے کی عادت کم ہے اس لیے آپ کی محفل میں شامل نہیں ہوتی لیکن تمام لکھاریوں کے لیے بہت دعائیں اور بہت پیار اور آپ کے لیے بھی کیونکہ اس بزم کو سجانے کے لیے آپ اور آپ کی پوری ٹیم بہت محنت سے کام کرتی ہے ویسے ردی بھی کھنگال کر دیکھیے شاید کچھ اور بھی باقی ہے زنبیل میں......اور ہاں 'سنہری بٹوہ' اس کے رنگ کہیں انتظار میں پھیکے نہ پڑ جائیں۔ رمضان کی مبارکباد قبول ہو۔

ﮪ: پیاری سی روحیلہ! تمہارا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی محفل میں آتی رہا کرو چار سو رنگ بکھر جاتے ہیں اور بے فکر رہو میں رنگ پھیکے نہیں پڑنے دوں گی یہ خوش رہو۔

✉: لاہور کی کڑی راحت وفا راجپوت لکھتی ہیں۔ محترم منزہ سہام آداب عرض! جون کا دوشیزہ میرے سامنے ہے۔ ہر طرح سے مکمل رسالہ جس میں ہر چیز موجود ہے۔ سب سے پہلے 'دوشیزہ کی محفل' میں بہنوں کے خوبصورت خطوط مزیدار تبصرے اور آپ کے دلفریب جواب پڑھے مزا آ گیا۔ آپ بہت محبت سے سب کے خطوط کا جواب دیتی ہیں۔ آج کل میں فارغ ہوں اسکول میں چھٹیاں ہیں۔ بہت سکون ہے مونی خان نے عشنا شاہ کے بارے میں معلومات دیں۔ عدیل حسین سے ملاقات بہت پسند آئی عدیل حسین واقعی بہت اچھے اداکار ہیں۔ 'ایک شام دوستی کے نام' میں عقیلہ حق نے ہمیں اس شام میں اپنے ساتھ ساتھ رکھا۔ اتنی خوبصورتی سے شام کا احوال لکھا کہ میں خود کو بھی وہاں محسوس کرنے لگی تھی۔ عقیلہ حق آپ نے جو ویٹر والی یاد شیئر کی ہے بالکل ایسا ہی ہوتا ہے یہ بڑے بڑے ہوٹلز کے ویٹر تو مجھے روبوٹ لگتے ہیں۔ ایک ویسے پر لاہور کے بڑے ہوٹل میں جانا ہوا تو لڑکی کے تایا کا تو میٹر گھوم گیا۔ وہ اپنے پوتے کو پکڑنے ذرا اِدھر اُدھر رخ کرتے ویٹر پلیٹ اٹھا کر لے جاتا۔ تین بار تو انہوں نے برداشت کیا۔ پھر اپنی پگڑی اتاری (گاؤں سے آئے تھے) اور جو جو صلواتیں سنائی پنجابی میں......سن کر بس کو مزا آ گیا۔ آخر منیجر صاحب آئے اور انہیں الگ کھانا دیا۔ بعد میں کوئی ویٹران کے قریب نہیں پھٹکا۔ عقیلہ آپ نے سب کے بارے میں بہت خوبصورت انداز میں

تعارف کرایا۔ باتیں سیٹر کیں اچھا لگا۔ بیوٹی گائیڈ ہمیشہ کی طرح زبردست رہا۔ لائف بوائے کی کہانی اچھی لگی۔ کیا میں لائف بوائے سے جڑی کوئی کہانی لکھوں۔ رفعت سراج ایک شاندار نام اور اُن کی ہر تحریر شاندار ہوتی ہے۔ دام دل بہت اچھا جا رہا ہے سکینہ فرخ کا افسانہ بہت اچھا لگا۔ واقعی محبت کے پورے کو اظہار اور الفاظ کے پانی کی بہت ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ مرجھا جاتا ہے۔ اُم مریم کا ایمان افروز ناول دل میں اللہ اور حضرت محمدؐ کی محبت کو اور بڑھا گیا۔ میمونہ صدف نے ایک عام سے موضوع پر افسانہ لکھا اور بہت خاص الفاظ میں بہت سی عورتوں کے دل کی بات کہہ دی۔ چھوٹی سی بات ہے کہ ماں کو اپنے بچے کا نام رکھنے کا حق ضرور ملنا چاہیے۔ اگر سسرال والے اس بات کو بڑا نہ بنائیں۔ طواف آرزو صدف آصف کا ناولٹ پڑھ کر مزا آیا۔ چاند کے پار مکمل پڑھ کر تبصرہ لکھوں گی۔ اسماء اعوان نے دوشیزہ کا گلستان بہت خوبصورتی سے سجایا۔ نئے لہجے نئی آوازیں اچھا لگا۔ آپ کا بہت شکریہ میری تحریروں کو رسالے میں جگہ دینے کے لیے میری ایک یا دو کہانیاں آپ کے پاس موجود ہیں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

ھ: راحت آپ کا نام تو بار بار لینے کو چاہتا ہے بہت سکون ملتا ہے آپ تو ٹھہریں اپنے گھر کی راحت اللہ ہمارے وطن میں بسنے والے ہر انسان کی زندگی کو راحتوں سے بھر دے۔ بہت اچھا تبصرہ بھیجا ہے یقیناً تمام لکھاریوں کو بھی اچھا لگے گا اتنی محنت سے افسانے اور ناولٹ لکھے ہیں پذیرائی تو بنتی ہے آپ کے افسانے مل گئے ہیں جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی اور ہاں ضرور لائف بوائے سے جڑی کہانی لکھیے۔

✉: لاہور سے تشریف لائی ہیں فریدہ فری صاحبہ، لکھتی ہیں۔ پندرہ تاریخ کو دوشیزہ کا دیدار ہوا کیونکہ یہ ہمارا فیورٹ میگزین ہے پچھلے ماہ بیماری کی وجہ سے تبصرہ نہ لکھ سکی اس مرتبہ بھی سب نے افسانے اور ناول بہت ہی بہترین لکھے۔ مکمل ناول چاند کے پار شمیمہ معین بہت ہی اچھا لگا۔ ناولٹ بنتِ حوا نفیسہ سعید واہ جی کیا خوب لکھا۔ طواف آرزو صدف آصف تو لکھتی ہی اتنا اچھا ہیں کہ پڑھ کر مزا آجاتا ہے۔ پیاری فوزیہ احسان رانا دھوپ چھاؤں کمال کر دیا۔ کانچ کی گڑیا اور نگہت غفار کی تحریریں تو میں شوق سے پڑھتی ہوں مجھے اپنی ذات کا بہترین تحریر تھی۔ افسانے سب کے سب بے حد پسند آئے لاہور میں تو بہت سخت گرمی پڑ رہی ہے اور گرمی میں تو ہم نیم پاگل سے ہو جاتے ہیں۔ عقیلہ حق جی ہر ماہ حاضری دیا کریں ہمیں آپ کے خطوط اور افسانے بے حد پسند ہیں۔ ایک شام دوستی کے نام واہ وہ بھی عقیلہ حق سے پڑھ کر بے حد اچھا لگا۔ عقیلہ جی آپ کو بے حد سلام اور دعا...... منزہ جی ہمیں چوتھا ایوارڈ اسلام آباد سے بشریٰ مسرور صاحبہ سے ملا ویسے میرے 9 ایوارڈ ہو چکے ہیں کراچی آنے کا بے حد من کرتا ہے مگر ہم آ نہیں سکتے۔ چلو تصویروں اور دوشیزہ پڑھ کر ملاقات ہو جاتی ہے۔ شگفتہ جی مجھے آپ کی شاعری بے حد پسند ہے کبھی فون پر بات ہی نہیں ہو سکی ہو سکے تو کال کیجیے گا کنزل کو بے حد پیار منزہ جی ہم آپ کو یہ کہہ سکتے ہیں قبول کیجیے۔

ھ: فریدہ جی! آپ کی محبتوں کا بہت شکریہ مگر اپنے آپ کو گرمی سے بچا کر رکھیں یہ نیم پاگل پن نیم حکیم خطرہ جان کی مانند ہے شمارے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

لیجیے اس آخری خط کے ساتھ محفل اپنے اختتام کو پہنچی آج 28 جون تک آنے والے تمام خطوط شامل محفل ہیں۔ اپنی قیمتی آراء سے نوازتے رہیے گا۔ اجازت دیجیے اگلے ماہ تک......

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

مایا علی

شوخ و چنچل اداکارہ

مونی خان

مایا علی پاکستانی اداکارہ، ماڈل اور VJ، بطور VJ سماٹی وی، وقت اور دنیاٹی وی پر کام کیا۔ پیدائش 27 جولائی 1989ء ہے اور لاہور، کوئین میری کالج سے گریجویشن کیا۔ 2012ء میں در شہوار سے کیرئیر کی ابتدا کی۔ پھر اک نئی سنڈریلا، عون اور زارا، شناخت، دیارِ دل، میرا نام یوسف ہے اور من مائل جیسے ڈرامے کیئے۔ اشتہارات بھی کیئے جن میں کوک، پیپسی اور داؤد گروپ سر فہرست ہیں۔

ڈرامہ کھویا کھویا چاند کو بہت پذیرائی ملی۔ مایا کو حمزہ علی عباسی کے ساتھ کام کرنا بہت مشکل لگتا ہے وہ بہت نروس محسوس کرتی ہیں۔ مایا کو پنجابی، اردو اور انگریزی زبانوں پر عبور ہے۔ آج کل کراچی میں رہ رہی ہیں۔ کالج کے زمانے میں باسکٹ بال ٹیم کی کپتان رہی ہیں۔ مایا نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کیا ہے۔ ماہا کی ہائٹ 5.7 ہے۔ اسٹار Leo ہے۔ ہماری یہ کیوٹ سی اداکارہ بہت اچھی اداکاری کرتی

ہے اور اب تک جتنے بھی

ڈراموں میں کام کیا ہے لوگ انہیں بھول نہیں سکیں ہیں۔ اصل نام مریم تنویر علی ہے۔ مایا کی ایک بہن اور ایک بھائی ہیں۔ مایا اپنی فیملی میں واحد انسان ہے جس نے شوبزنس انڈسٹری کو جوائن کیا والد کاروباری آدمی ہیں۔ مایا کی اداکار عثمان خالد بٹ سے بہت اچھی دوستی ہے اور ان کی اسکرین پر بھی بہت کیمسٹری ملتی ہے مایا کھانے کے معاملے میں بہت محتاط ہیں اور صرف اپنی پسند کا کھانا کھاتی ہیں۔

☆☆☆

زاہد احمد

خوبرو اور ذہین اداکار

ذیشان فراز

ہم: زاہد یہ بتایئے شوبزنس میں کیسے آنا ہوا؟
زاہد: میں نے شروعات تو ریڈیو سے کی تھی پھر تھیٹر بھی کیا۔ پی ٹی اسلام آباد میں جاب کے دوران میری ملاقات انور مقصود صاحب سے ہوئی اور انہوں نے مجھے اپنے اسٹیج پلے سوا 14 اگست کے لیے منتخب کیا اس پلے میں، میں نے محمد علی جناح کا کردار نبھایا تھا۔
ہم: اچھا تو آپ پی ٹی وی پر جاب کرتے ہیں؟
زاہد: کرتا تھا حالانکہ میری والدہ بہت ناراض ہوئی تھیں کہ میں نے جاب چھوڑ کر شوبزنس جوائن کرلیا۔
ہم: آپ کا پہلا ڈرامہ کون سا تھا؟
زاہد: میرا پہلا ڈرامہ ہم ٹی وی سے ٹیلی کاسٹ ہوا تھا 'محرم' مگر پہچان اور شہرت مجھے الوداع سے ملی۔
ہم: تو آپ کو شہرت ڈراموں سے ملی؟
زاہد: اصل میں تو اسٹیج پلے میں جناح کے کردار نے مجھے شہرت دی اُس کے بعد ہی مجھے ڈرامے ملنے شروع ہوئے۔
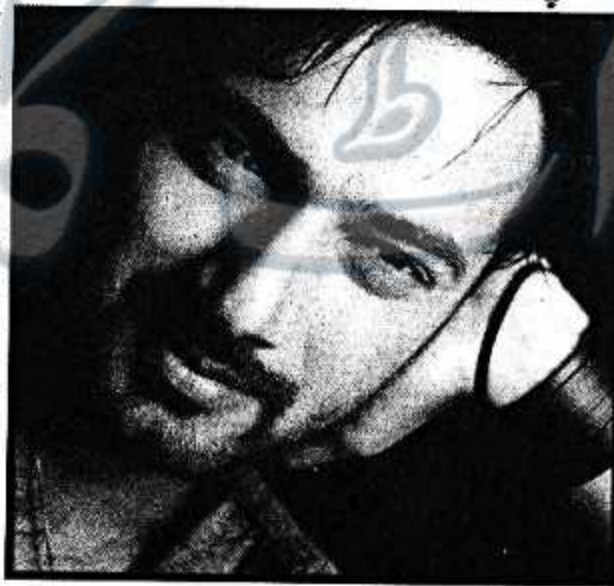
ہم: آپ کے ڈرامے ''تم میرے پاس رہو'' اور ''ذرا یاد کر'' کو بہت پذیرائی ملی کیسا لگتا ہے؟
زاہد: بہت اچھا لگتا ہے جگنو، سنگت، مورمحل میں بھی میرے کردار بہت اچھے تھے مگر مجھے خود ان دونوں ڈراموں میں کام کر کے بہت مزہ آیا۔
ہم: آج کل 'بے شرم' کو بھی بہت پسند کیا جا رہا ہے آپ اپنے رول سے مطمئن ہیں۔
زاہد: جی مطمئن ہوں تبھی کام کر رہا ہوں اب

میرے کام سے دیکھنے والے مطمئن ہوتے ہیں یا نہیں یہ اہم ہے۔

ہم: زاہد آپ کی آواز اور آپ کی شخصیت بہت زبردست ہیں فینز تو بہت ہوں گے؟

زاہد: ہنستے ہوئے، بس اللہ کا کرم ہے میری کامیابی کو مجھ سے زیادہ میری بیگم انجوائے کرتی ہیں۔

ہم: اوہ آپ کی شادی ہوگئی؟

زاہد: بالکل بلکہ میں تو 2015ء میں ڈیڈ بھی بن گیا۔ میری بیگم آمنہ بہت سمجھدار ہیں اور الحمدللہ میں بہت مکمل زندگی گزار رہا ہوں۔

ہم: آپ کا اسٹار کیا ہے؟

زاہد: میری ڈیٹ آف برتھ 20 Sep،ء1984 ہے اس حساب سے میں Virgo ہوں۔

ہم: کچھ اپنے بارے میں بتائیں ہمارے پڑھنے والے جاننا چاہتے ہیں۔

زاہد: ابھی ایسا کچھ خاص تو نہیں کیا کہ کچھ بتا سکوں ہاں میں نے پرسٹن یونیورسٹی سے مارکیٹنگ میں ڈگری کی۔ پی ٹی وی جوائن کیا بطور Creative Manager۔

ہم: آپ نے شروعات ٹی وی سے تو نہیں کی؟

زاہد: ٹی وی تو میں نے 2006ء میں کیا ابتدا تو ریڈیو سے کی اور جب میں آسٹریلیا میں تھا تب بریک فاسٹ شو اور رش آر کے نام سے شو کرتا تھا۔ کال سینٹر میں بھی جاب کی۔

ہم: آپ کو آپ کے ڈرامے الوداع پر ہم ایوارڈ بھی ملا کیسا محسوس کرتے ہیں؟

زاہد: جی مجھے بہترین معاون اداکار کا ایوارڈ ملا حالانکہ میرا کردار ایک ذہنی مریض شخص کا تھا مگر پھر بھی لوگوں نے پسند کیا۔ مجھے بہت خوشی ہے اس بات کی۔

ہم:

آپ کتنے بہن بھائی ہیں اور کیا وہ بھی شوبزنس سے تعلق رکھتے ہیں؟
زاہد: ہم تین بھائی ہیں اور صرف میں اداکاری کے شعبے سے وابستہ ہوں۔ مجھے بھی اس طرف لانے کا سہرا انور صاحب کے سر ہے۔
ہم: آپ نے جناح کا رول ادا کرنے کے لیے کتنی محنت کی کیونکہ یہ بہت اہم کردار ہے اور غلطی کی گنجائش بھی نہیں؟
زاہد: آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ میں نے 48 پاؤنڈ وزن کم کیا تھا بہت باریکی سے ان کے لب و لہجے اور چال کو مانیٹر کیا سچ پوچھیں تو وہ کردار میری زندگی کا مشکل ترین کردار تھا۔
ہم: آپ نے کامیڈی کی طرف دھیان کیوں نہیں دیا؟
زاہد: میں نے انور صاحب کا بس ایک پلے ہاف پلیٹ میں کامیڈی کردار نبھایا تھا لیکن بس وہ ابھی تک ایک ہی پلے ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں سیریس ایکٹنگ زیادہ بہتر کرتا ہوں۔
ہم: ٹی وی اور اسٹیج ایکٹنگ میں کتنا فرق ہے؟
زاہد: بہت فرق ہے ٹی وی بہت مشکل میڈیم ہے یہاں آپ کو بیسٹ دینا ہوتا ہے اسٹیج پر آپ اکیلے نہیں ہوتے ہیں۔ سپورٹ ملتی ہے دوسرے آرٹسٹوں سے۔
ہم: اچھا یہ بتائیں کہ ڈرامہ Choose کرتے وقت کس بات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں؟
زاہد: میں اسکرپٹ ضرور پڑھتا ہوں اور اسی کی بنیاد پر حامی بھرتا ہوں۔ پھر اپنے کردار پر مکمل ریسرچ کرنے کے بعد Act کرتا ہوں۔
ہم: اچھا یہ بتائیں آپ کے فینز میں لڑکیاں زیادہ ہیں یا لڑکے؟
زاہد: قہقہہ لگا کر (یار آپ بڑے تیز ہو) فینز میں دونوں ہی ہیں اور مجھے اپنے فینز بہت پسند ہیں خاص طور سے جب وہ سیلفی کے لیے کہتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے ویسے میں پبلک پلیس پر بہت کم جاتا ہوں۔
ہم: آپ کا نک نیم کیا ہے؟
زاہد: مجھے Zee کہہ کر گھر والے اور دوست پکارتے ہیں۔
ہم: آپ کا قد ماشاء اللہ بہت اچھا ہے کیا ہے؟
زاہد: پورے چھ فٹ۔
ہم: آپ شروع سے کراچی میں ہی رہائش پذیر ہیں؟
زاہد: جی نہیں! 2014ء میں، میں اسلام آباد سے کراچی شفٹ ہوا ویسے میری پیدائش آسٹریلیا کی ہے۔
ہم: یعنی آپ پاکستانی نیشنل نہیں ہیں؟
زاہد: میں آسٹریلین نیشنلٹی رکھتا ہوں مگر دل سے پکا پاکستانی ہوں۔
ہم: پسندیدہ اداکار کون ہے؟
زاہد: مجھے Johany Depp بہت پسند ہیں۔
ہم: اچھا کو اسٹار کس کو سمجھتے ہیں؟
زاہد: اللہ کا شکر ہے مجھے سب لوگ اچھے ہی ملے کیونکہ مجھے پروفیشنل لوگ پسند ہیں۔
ہم: آپ اپنے پڑھنے والوں کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟
زاہد: میں صرف ایک بات کہوں گا کہ خوش رہیں اور زندگی کو بہت سیریسلی مت لیں۔

☆☆......☆☆

آنگن میں بارات

مومینہ بتول

ایک خوبصورت دن کی ابتداء جس کا روشن سورج حکم ربانی سے مجھے روایتی تخلیقِ آدم کی حسین ترمسند پر بٹھا گیا تھا۔ نہایت کروفر کے ساتھ...... ایک حسین رشتہ ایک عظیم درجہ ایک...... احترام بخشا گیا۔ وہ رتبہ جو 'شاہوں کو زیر' کر کے صنفِ نازک کو عطا گیا تھا۔ وہ فخر...... وہ مان...... وہ محبت بھرا دل گداز...... احساس...... مجھے سولہ جنوری کو دیا گیا۔ رب عظیم کی عظیم تر عطا رحمت کے تب سے پکاری جانے والی بنتِ حوا میرے پہلو میں آبسی ہے حوروں کا سا معصوم حسن حلاوت بھرا دل گداز وجود لیے میری پہلی تخلیق...... جس نے مجھے لفظ ''ممتا'' سے روشناس کرایا۔ میری نازوں پالی 'زرینہ' جسے میں نے دنیا میں خوبصورت نام کا تحفہ دیا پہلا تحفہ...... وقت بنا آہٹ کے گزرتا رہا اور وہ ننھا وجود میرے دل میری آنکھوں میں ایسا سمایا کہ ہر رنگ مامتا کے رنگ سے شروع ہو کر ممتا پر ختم ہوتا رہا۔ رشتہ تو 'ماں بیٹی' کا ہی رہا مگر...... پہلے وہ دل بہلاتی گڑیا کہلاتی پھر گھر کو اور ہمیں سنبھالنے والی ناصح بنکر خود میرے کاندھے سے آ لگی۔ اک دوست...... اک ہمدرد...... اک ناصح...... اک بیٹی، اک بہن، رشتے بڑھتے گئے قربت وسیع ہوتی گئی وقت کی دھوپ چھاؤں...... میں ...... احساس ہی نہ ہوا کہ...... وہ وقت آ گیا ہے جب بیٹی کا فرض 'ادا' کرنا فرض اولین بن جاتا ہے۔ وقت کی ڈور بھلا کب ہاتھ آئی ہے جدائی کا دھیما
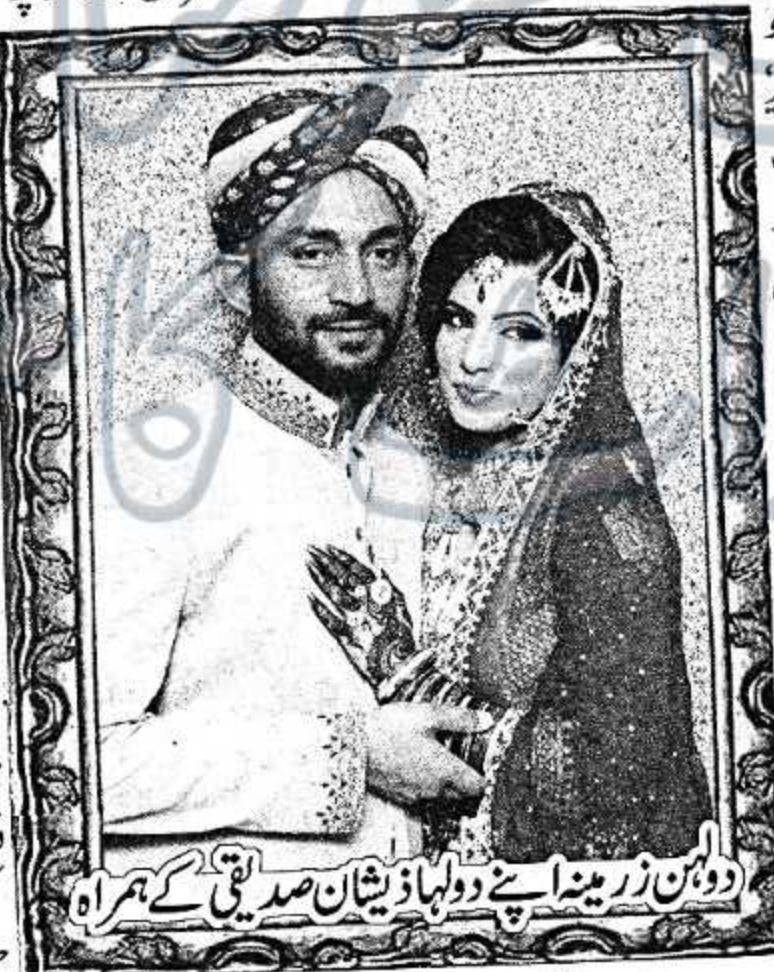
دولہن زرینہ اپنے دولہا ذیشان صدیقی کے ہمراہ

دھیما احساس میری ذات کے گرد تانے بانے بُننے لگا تھا۔

صحیح وقت پر ایک پڑھے لکھے روشن خاندان کا اچھا رشتہ میسر آجانے پر...... ہمیں بھی دیگر ماں باپ کی طرح ہاں کہہ کر سر جھکا کر...... خدا کے حضور شکرانے کے نفل پڑھے۔

لڑکے والوں کی خواہش پر پہلے نکاح کی رسم ادا کی گئی۔ اچھا رشتہ عطیہ خداوندی جو ٹھہرا۔ 9 نومبر کو آنے والا رشتہ محض ایک ہفتے بعد یعنی 15 نومبر کو...... دو خاندانوں کو محبت الفت کی اک نئی ڈوری میں پرو گیا۔ اور مجھے کہنا پڑا کہ ''جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں'' ہم انسان تو محض کٹھ پتلی کی طرح ڈوریاں ہلاتے ہیں۔

نکاح کے دوسرے دن کی رات ہی داماد محترم 'یو کے' فلائی کر گئے پھر تو جیسے وقت نے پیر میں بھنور باندھ لیے۔ داماد محترم نے جہیز لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ پھر بھی تیاریوں میں سات ماہ لگ گئے۔ اور وہ دن قریب آ گئے۔ جب بقول شاعر 'دلہن بنتیں ہیں نصیبوں والیاں'۔

20 اگست کو پہلے سرور کونین کی بزم میلاد سجائی گئی۔ پھر 21 اگست کو رسم مایوں کی تقریب منعقد کی گئی۔ زرمین کے والد محترم نے خود اپنی لاڈلی اکلوتی بیٹی کا کمرہ پیلے پھولوں سے سجایا۔ میری سگھڑ بیٹی نے اپنی مایوں کی رسم کی اک اک چیز خود اپنے ہاتھوں سے تیار کی تھی۔ پیلے پردے، پیلے غالیچے' کاؤچ پر ڈالنے والی پیلی چادر جس پر گوٹے کا روشن بنایا تھا اپنے بچپن کے ٹیڈی بیئر کا پیلے کلر کا ڈریس بھی خود بنایا تھا۔ پاندان کا غلاف، گاؤ تکیے گدیاں، سب پر یلو کلر کے غلاف چڑھائے تھے اپنی مرحومہ دادی کے جہیز کی '60' سالہ پرانی پلیٹ کو پھولوں سے سجا کر مہندی ابٹن رکھا گیا تھا دادی کے ہی جیولری بکس کو سجا کر مہندی ابٹن کلاوے رکھے گئے تھے۔ کمرہ جدید اور مغلیہ انداز میں ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔

سنو بہت خوبصورت لگ رہا تھا سب ہی خوش تھے ننھیال ددھیال دوست احباب محلے دار...... رشتے دار، مگر میری بیٹی پر اک سوگ کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ اور میں اُس کی وجہ بھی جانتی تھی۔ اُسے اپنے بھائی عابد کی کمی بے حد محسوس ہو رہی تھی جو ایجوکیشن کے سلسلے میں محض ایک سال پہلے ہی آسٹریلیا گیا تھا۔ اور جس نے معذرت کی تھی بہن سے کہ ''پوری کوشش کے باوجود وہ زرمین'' کی شادی اٹینڈ نہیں کرسکتا تھا۔'' سو میری لاڈو...... اُداس اُداس تھی۔ نہا دھو کر مایوں کا سوٹ پہن کر وہ اپنے رب کے آگے سربسجود نماز عصر ادا کر رہی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُسے دل میں چھپا لوں کہ پلکوں پر بٹھا لوں۔ وہ لمحہ، وہ سوگوار حسن...... مایوں کے زرد لباس میں اور سوگوار لگ رہا تھا۔ میں چاہنے کے باوجود بھی اُس کے قریب نہ گئی تھی۔

اُس کی دوستوں اور کزنز نے رو پہلے ہالہ میں لے کر کمرے کی جانب لے جانے کا ابھی قصد ہی کیا تھا کہ اچانک......

''السلام علیکم!'' کی پُر جوش آواز سے میرے بڑے بیٹے نے سرپرائز انٹری دی تھی۔ تقریب میں موجود ہر شخص پہلے استعجاب سے گنگ رہ گیا تھا۔ پھر خوشی سے چاروں سمت سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔

''بیٹا عابد...... بھائی...... بھیا...... واؤ...... سرپرائز...... وعلیکم...... تو مایوں...... سب نے خوشی میں ایک بولنا شروع کر دیا اور زرمینہ وہ تو بوکھلا گئی تھی۔

''عابد تم...... بھائی تم...... بس عابد...... کی

گردان کرتی بھائی کی پھیلی بانہوں میں سما گئی تھی۔
میرے دل سے "تشکر اللہ تیرا شکر" کے الفاظ نکل رہے تھے۔ میرے معبود نے مجھ گنہگار پر اتنا کرم کیا تھا۔ میں تو اس قابل نہ تھی۔ محفل کو چار چاند لگ گئے تھے۔

وہ شام...... شام مایوں سے نوچندی رات میں تبدیل ہوگئی تھی۔

22 اگست کو میری گڑیا کی رسم حنا تھی۔ اس محفل میں بھی میری لاڈلی نے اپنے ذہنی اختراع کو عملی

اپنا حق ادا کیا۔ دولہا والے بری بھی ساتھ لائے تھے۔ رسم سے فراغت کے دونوں طرف سے ڈانڈیاں کھیلیں گئیں میرے پانچوں بیٹوں نے تمام بھانجوں بھتیجوں نے وہ بھنگڑا ڈالا کہ الحفظ والامان...... سب سے زیادہ جوشیلا ہلہ گلہ کرنے والے سعادت اور عابد...... رضا عبدالغنی اور شعیب بھی اپنی شرمیلی فطرت کے باوجود اپنی اکلوتی بہن کی رسم حنا میں شامل رہے۔ میں اور اُن والد...... اک طرف کھڑے آنسوؤں کی زبانی رب عظیم کا شکرادا کرتے

زرمینہ اپنے بھائیوں عبدالعابد حقانی' شعیب حقانی' سعادت حقانی اور عبدالغنی حقانی کے ساتھ

جامہ پہنا کر انوکھے رنگ اختیار کیے تھے۔ نانی کے ہاتھوں کا تیار کردہ کاٹن کا گھیر دار غرارہ...... بلوچھتری جسے گوٹا کناری سے سجایا گیا تھا اپنی سائیڈ فرینڈ 'زیبا' جس نے اسی کی طرح سبز اور پیلا کاٹن کا غرارہ زیب تن کیا ہوا تھا کے ساتھ ایک ہاتھ میں چھتری تھامے نہایت نپے تلے قدموں سے انٹریس سے اسٹیج کی طرف آئی۔

بہت جداگانہ انداز...... بہت ٹھہراؤ رکھ رکھاؤ کے ساتھ پنڈال میں حیرت مسرت آفریں کی کیفیت طاری ہوگی تقریباً ہر مہمانی نے تعریف کر کے

رہے۔

24 اگست کی صبح نوشہ میاں یوکے سے کراچی پہنچے اور شام کو سلام کرنے حاضر ہوئے۔ باادب باملاحظہ روبرو...... اپنی ہمشیرہ عظمیٰ کے ساتھ لیے سلام محبت کو قبول پذیرائی کی سند مل گئی۔

اس موقع پر زرمینہ نے اپنے ہاتھوں بنائی گئی۔ دولہن کی ڈولی' بطور تحفہ پیش کی جس میں بانیت ارادہ عمرہ احرام کا مکمل سیٹ موجود تھا۔

"لبیک اللھما لبیک" خدا ہر مسلمان کو اپنے گھر کی جلد زیارت کرائے آمین...... ثم آمین۔

لڑکے والوں کی مہندی ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھی۔ زرمینہ کی بھی رسم حنا دولہا میاں کی غیر موجودگی میں انجام پائی تھی سو اچانک بالکل اچانک 25 اگست کو اچانک دولہا والوں کی ایمرجنسی کال بلترتیب مہندی کی آ گئی انہیں جلدی میں بھی گھانچی راپچی ہال میسر آ گیا تھا اب کیا کہیے بھاگم بھاگ تیاریاں کی گئیں۔

ہنگامی بنیادوں پر دعوت دی گئی کنونس کا انتظام کیا گیا۔ ارجنٹ مہندی کے لوازمات خریدے گئے خود پانچوں بھائیوں نے 2 گھنٹے پہلے جاکر مہندی کے ڈریس خریدے اور بہت ارجنٹ ہی سہی مگر اک یادگار تقریب اٹینڈ کی گئی۔ ہال کے گیٹ پر پُرجوش انداز میں وعلیکم کیا گیا۔ پہلے موصوف ذیشان صدیقی کی رسم حنا ادا کی گئی پھر ساس کے اصرار پر دلہن صاحبہ کی سسرالیوں کی رسم ادا کی۔

دلہن کو خصوصی طور پر ساتھ بلوایا گیا تھا۔ غرض اک اک گھڑی سے خوشیوں بھری خوشی وصول کی گئی۔ پُرتکلف کھانے کے بعد پھر دونوں طرف کے جوشیلے لڑکے لڑکیوں نے لڈی ڈالی بھنگڑا کھلا زرمینہ کی کزن کرن، انعم، منیزہ، تسنیم، حفظہ، سمیعہ، پھوپی زاد انعم، مصباح، فریحہ، ارم، عزرم اور کرن لڑکوں نے خوب رنگ جمایا۔ سعادت عابد' اورنگزیب' شعیب' عبدالغنی' فراز' اظہر' رضا دانش' سمیع، سنی کون تھا جو پیچھے تھا سب نے ہی محفل کو چار چاند لگا دیے میں والدہ محترم کے ساتھ کھڑی اپنے چھوٹے بھائی خالد کے کاندھے سے لگی۔ خوشیوں کو نظر نہ لگ جانے کی دعا کر رہی تھی۔

ایک دن بعد یعنی 27 اگست میرے بیٹے سعادت کی سالگرہ اور میری رانی کی بارات کا دن آ پہنچا تھا موتی محل کے پہلو میں العقبیٰ بنکوئٹ خوبصورت سجایا گیا ہال......

بہترین انتظام...... بارات آ پہنچی تھی پٹاخوں کی گونج شادیانوں کے ساتھ مہکتے گجروں اور خوشنما پھولوں کے ہار پہنا کر ہم نے بارات کا خیر مقدم کیا۔ نکاح ہو جانے کی وجہ سے دولہا صاحب اپنی دولہن کا ہاتھ تھام کر اسٹیج تک پہنچے۔ پھر قاری صاحب نے تلاوت کی دعا فرمائی مبارک سلامت کا شور...... چاروں طرف تھا۔ اس موقع پر بھی میری ڈرامائی تخلیقی ذہن رکھنے والی بیٹی نے اپنی پیدائش سے لے کر جوانی تک کی تصویروں کی سی ڈی بنوائی تھی اور اب وہ فلم ہال میں اسکرین پر چل رہی تھی لوگ حسرت سے ماضی حال مستقبل کو دیکھ رہے تھے ایک انوکھا آئیڈیا...... انوکھا جداگانہ انداز...... بچپن کی تمام تر تصویریں پلے ہو رہی تھیں بیک گراؤنڈ میں یہ گانا چل رہا تھا۔ رشک، حسرت، یقین یکجا ہو رہا تھا۔

''پاپا میں چھوٹی سی بڑی ہوگئی کیوں''

ایک خوبصورت انداز ایک دل پذیر لوک...... کتنی ماؤں نے پھولی پھولی فراک میں ملبوس معصوم ڈرتی بھاگتی تتلیوں کو اپنے سینے میں بھر لیا تھا۔ شاید انہیں بھی لگا تھا کہ کچھ وقت جاتا ہے پھر یہ اٹھلاتی بل کھاتی تتلیاں بھی اڑان بھرنے کو تیار ہوں گی۔ فوٹو سیشن ہوتے رہے پھر یکدم تمام ہال کی لائٹس بند کر دی گئیں اور ہال میں تیز میوزک پر ہیپی برتھ ڈے گایا گیا۔ جس کا ارینج چاروں بھائیوں نے اپنے بھائی سعادت کے لیے کیا تھا۔ دولہا دلہن اور سعادت نے کیک کاٹا۔

قدرت کا ایک اور احسانِ عظیم...... ہم گنہگار والدین پر...... !صد شکر رب العالمین......!

عشائیے کے بعد دمِ رخصت آ پہنچا۔ وہ جاں

گسل لمحہ جب ہمارے دل کی دھڑکن ٹھہرنے لگی تھی۔ میری گلاب بنی بیٹی کو تازہ گلابوں سے سحرا پہنا کر ڈھک دیا گیا۔ جدائی کا سنگین احساس دبے قدموں دل تک آ پہنچا۔ سب سے مل کر پانچوں بھائیوں، باپ...... تایا چچا اور دونوں ماموں اور ارشاد انکل خالو کی سنگت میں وہ خدا حافظ کہہ رہی تھی اپنے داماد ذیشان صدیقی کے ہاتھ میں زرمینہ کا ہاتھ دے کر میں بس یہی کہہ سکی تھی خدا حافظ میری بیٹی...... میری زندگی......

مومینہ بتول اپنے شوہر عبدالکریم حقانی، چاروں بیٹوں اور دولہا دلہن کے ہمراہ

29 اگست کی شب...... شب ماہ تاب جیسی تابناکی لیے...... خوشگوار خوبصورت حسین آتشبازی کے ہالے میں زرمینہ اور ذیشان نے بنکوئٹ کا دروازہ کھول کر انٹری دی۔ مہمانوں نے ویلکم کیا۔
پھولوں کی مصنوعی بارش، ملگجا اندھیرا جس میں آف وائٹ پربل فکر کے امتزاج سے بنی مکمل اسٹون سے تیار میکسی...... اور سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس داماد جی...... ہاتھ میں ہاتھ لیے...... گل و گلزار بو کے لیے نہایت پُروقار انداز میں چلتے وہ دونوں...... اسٹیج کی طرف بڑھے۔

مووی فوٹو سیشن منہ دکھائی جیسی رسمیں ہوتیں رہیں پھر انواع و اقسام کے کھانے، کیک، آئس کریم فش فرائی غرض ہر ڈش لذیذ مہمانوں نے رغبت سے انصاف کیا...... کھانوں کے ساتھ۔
نشاط آمیز...... شادماں فرحان لمحے...... گزرتی رات کا حصہ بننے لگے ہیں ہم دولہا والوں سے رخصت طلب کررہے ہیں۔
پانچوں بھائی اپنی آپی اور اُن کے شریک سفر کو احاطے میں لیے...... سرگوشیوں میں رخصت طلب کررہے ہیں۔
مہمان کافی رخصت ہو چکے ہیں۔ اپنی عزیز از جاں والدہ محترم کے ساتھ کھڑی میں محبت میں ڈوبی...... خوشبو میں بسی بیٹی کو الوداع کہتی ہوں۔
"گڈ بائے مائی لائف۔" میرا دل سرگوشی کرتا ہے
"ویلکم ٹو مائی لائف......" شریک سفر کی آنکھوں سے چھلکتا...... خاموش جواب موصول ہو رہا ہے۔
زندگی کا دوسرا رخ شروع ہو رہا ہے۔

☆☆......☆☆

لائف بوائے.... کچھ نیا کر دکھائیے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

اُس وقت میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میرے شوہر شاہنواز ڈاکٹر تھے اور آسٹریلیا میں سیٹل تھے۔ جانے کے بعد میں نے برسوں پلٹ کر میکے کی خبر بھی نہ لی لیکن بڑی اڈے اور بی جان کی یاد ایک میٹھی کسک بن کر میرے دل میں ضرور اٹھتی تھی۔ ان کا خلوص، ان کی محبت ایسی تو نہ تھی کہ جس کو اتنی آسانی سے بھلا دیا جاتا۔

اماں ابا کے اچانک گزر جانے کے بعد بڑی اڈے ہی تھیں جو مجھے ماں کی طرح پیار کرتی تھیں۔ میں سب سے چھوٹی ہونے کے ناتے گو کہ سب ہی لاڈلی تھی۔ مگر بڑی اڈے کی محبت نے اماں کی محبت کو جیسے اپنی آغوش میں بھر لیا تھا۔

آسٹریلیا میں ہونے کے باوجود اپنے وطن سے محبت بھلا کہاں دل سے نکل سکتی ہے اور یہ جو رشتے ہوتے ہیں نا۔ یہ اپنی جڑیں اتنی گہری رکھتے ہیں کہ ان سے فرار ممکن نہیں۔ جب ہم آسٹریلیا گئے تو سیٹلائٹ پر صرف پاکستانی ایک دو چینل ہوا کرتے تھے مگر اب تو ڈیڑھ سو دو سو چینل ہمارے اپنے ہیں۔ میں نیوز چینل انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ لائف بوائے، اسٹرانگ اینڈ تھک شیمپو کے اشتہار جس میں ماڈل بتا رہی تھی کہ لائف بوائے شیمپو کے استعمال سے بال دکھیں۔ 30 فیصد تک زیادہ گھنے...... نے مجھے واپس اپنے پاکستان اپنوں کے درمیان لا کھڑا کیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ اسکول جانے سے قبل ہمیشہ ہی بڑی اڈے مجھے لائف بوائے شیمپو سے سر دھونے کی تاکید کرتی تھیں۔ مجھے بھی لائف بوائے شیمپو سے ایک محبت تھی جو اب تک قائم ہے۔ بس اس اشتہار میں ماں بیٹی کے رشتے نے مجھے بڑی اڈے کے پاس لا کھڑا کیا تھا۔ مجھے دیکھ دیکھ میری سہیلیاں بھی لائف بوائے شیمپو ہی استعمال کرتی تھیں۔ لائف بوائے شیمپو کی ہمیشہ سے یہ خوبی رہی ہے کہ اس کے باقاعدہ استعمال سے بال مضبوط، گھنے اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔ بالوں کے دو موہے پن سے بھی نجات ملتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ہمیشہ لائف بوائے شیمپو کے حق میں ہی رہے ہیں۔ ان کے اندازے کے مطابق آسٹریلیا میں بھی بیسٹ سیلنگ شیمپو یہی لائف بوائے شیمپو ہی ہے۔ خیر اپنے بابل کے گھر کی یاد مجھے لائف بوائے شیمپو نے ہی دلائی تھی۔ میں فوراً بڑی اڈے سے ملنے کو بے چین ہو گئی تھی۔

مجھے خوب خوب یاد تھا جن دنوں میری شادی ہوئی تھی، اس زمانے میں ہمارے گاؤں میں ٹیلی فون کی سہولت بھی نہیں تھی کہ میں ان سے رابطہ کرتی۔ شاہنواز کی تو ساری فیملی ہی باہر تھی اس لیے ان کا پاکستان آنا جانا ہی نہ تھا۔ ان کی اکلوتی چھوٹی بہن سبرینہ کے شوہر انعام شاہ

دبئی میں مقیم تھے اور ان کے بڑے بھائی شاہد لالہ بھی ڈاکٹر تھے جو کئی برسوں سے سعودی عرب میں تھے اور والدین انہی کے ساتھ رہتے تھے۔ ہم دو دفعہ سعودی عرب ان کو ملنے گئے۔ عمرے کی سعادت بھی حاصل کی۔ سبرینہ کو ملنے دبئی بھی گئے لیکن اپنا وطن میرے لیے ایک بھولی بسری یاد بن کر رہ گیا تھا۔ کچھ یہاں آ کر زندگی ہی اتنی مصروف ہوگئی تھی کہ کچھ سوچنے کے لیے وقت بھی کم ہی ملتا تھا پھر بچوں کی پیدائش کے بعد تو روٹین اتنی ٹف ہوگئی تھی، کام، کام اور کام۔ یوں اپنوں سے بچھڑے پندرہ برس گزر گئے۔

☆......☆

ایک دن اچانک شاہنواز نے بتایا کہ پاکستان میں ڈاکٹروں کی کوئی کانفرنس ہو رہی ہے جس میں وہ بھی انوائیٹڈ ہیں، اس کانفرنس میں شرکت کے لیے وہ دو ہفتے کے لیے پاکستان جا رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی میرے دل میں لائف بوائے شیمپو نے جو امنگ جگائی تھی۔ وطن جانے کی ہوک پھر سے اٹھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ بچوں کی چھٹیاں نہیں تھیں۔ میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد اپنی ہمسائی اور بہت اچھی دوست فریدہ کو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے تیار کر لیا اور اپنی تیاری بھی شروع کر دی۔

میں بہت برسوں تک سب کو بھولی رہی تھی لیکن اب اچانک میرے دل میں بڑی اڈے بی جان کے ساتھ زرینہ آپا، رخشی آپا، محمود لالہ اور بابر لالہ کی محبت بھی جوش مارنے لگی۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ یہ سب لوگ مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے کیونکہ اپنے بہن بھائیوں میں، میں سب سے چھوٹی تھی۔ اماں بابا کی لاڈلی تو میں تھی ہی لیکن بڑے بہن بھائیوں کے لیے تو گویا میں ایک کھلونا تھی۔ سارا دن مجھے اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے۔ بڑی اڈے اور بی جان تو بھی کے لیے سراپا محبت تھیں، وہ ہم سب پر ہی جان چھڑکتی تھیں۔

زرینہ آپا اور رخشی آپا نے قرآن پاک کے علاوہ گاؤں کے اکلوتے اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا اور ان کی شادیاں ہوگئیں جبکہ میں چونکہ بابا کی بہت لاڈلی تھی اس لیے ضد کر کے گریجویشن کر لیا۔ میری خاطر بابا نے اپنی پرانی روایات کو توڑتے ہوئے مجھے بورڈنگ بھیج دیا تھا لیکن ساتھ ہی بڑی اڈے، اماں اور بی جان نے ڈھیر ساری نصیحتوں کی گٹھڑی باندھ کر ہمراہ کر دی تھی جس کی وجہ سے وہ سارا وقت میں نے بڑے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے گزارا تھا لیکن اسکول اور کالج کی ایک بات مشترک تھی۔ بڑی اڈے کا پیار اور میری لائف بوائے شیمپو سے ازلی محبت، میں بورڈنگ میں بھی لائف بوائے شیمپو کی ایمبیسیڈر ہی گردانی جاتی تھی۔ اور پھر میں تعلیم مکمل کر کے آئی تو چھ ماہ کے اندر اندر میری شادی ہوگئی۔

شاہنواز سے میرا رشتہ پہلے سے ہی طے تھا۔ ان کے والد بابا کے پرانے دوست تھے۔ میری شادی کے کچھ عرصے بعد اماں اور بابا، کاکا جی صاحب کے مزار پر سلام کرنے سوات گئے تھے۔ اماں نے کوئی منت مان رکھی تھی۔ واپس آتے ہوئے ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا۔ وہ دونوں موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے۔ ابھی ہم بمشکل اس صدمے سے نکلے ہی تھے کہ جائیداد کی تقسیم کا مرحلہ درپیش ہوا۔ اماں کی ساری جیولری دونوں بھابیوں نے قبضے میں کر لی تھی۔ بابا کا سارا بینک بیلنس پتا نہیں کس طریقے سے بھائیوں نے اپنے نام منتقل کروا لیا۔ باغات اور شہری جائیداد میں سے بھی بہنوں کو بے دخل کر کے زرعی اراضی میں سے حصہ دے دیا اور وہ بھی بنجر اراضی کا، ان تمام ناانصافیوں کے باوجود بڑی اڈے اور بی جان نے حق کا ساتھ دینے کی بجائے مجھے چپ رہنے کو کہا تو میں ان سے بھی خفا ہوگئی اور اتنے سالوں تک پلٹ کر ان کی خیریت بھی معلوم نہ کی لیکن اب نجانے کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ اڑ کر ان سب سے جا ملوں۔

چند دنوں میں ہی ہماری تیاری ہوگئی۔ بس بڑی اڈے کے لیے میں کچھ گفٹ لینے سپر مارکیٹ خاموشی سے نکل گئی۔ اور پھر میری بھی تیاری مکمل ہوگئی۔

☆......☆......☆

اسلام آباد ایئر پورٹ پر اترتے ہی میرا دل اپنے گاؤں جانے کے لیے ہمکنے لگا لیکن شاہنواز نے کانفرنس اٹینڈ کرنی تھی۔ میری بے قراری دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ کل تم ہوٹل سے کار لے کر گاؤں چلی جاؤ، میں کانفرنس ختم ہوتے ہی وہاں پہنچ جاؤں گا اور پھر اکٹھے واپس آئیں گے۔

اگلے ہی دن شاہنواز نے ہوٹل سے کار ہائیر کر کے

مجھے پشاور روانہ کر دیا۔ میں جلدی نکلنا چاہتی تھی تا کہ دن کی روشنی میں گاؤں پہنچ جاؤں لیکن تیاری کرتے کرتے تھوڑی دیر ہوگئی اور میں لنچ کے بعد ہی وہاں سے نکل سکی۔ گاڑی شہر کے ہنگاموں اور رش سے نکل کر مین پشاور روڈ پہ چڑھی تو میں نے ریلیکس ہو کر اپنا سر سیٹ سے لگالیا اور گاڑی سے باہر بھاگتے ہوئے درخت اور عمارتیں دیکھنے لگی۔ ان سالوں میں کتنا کچھ بدل گیا اور تو اور سڑک کے کنارے لگے ہوئے نیون سائن ہی کتنے نامانوس سے نظر آ رہے تھے۔ میں چپ چاپ اپنے بچپن کے محبت بھرے خوب صورت دنوں کو یاد کر رہی تھی جب اماں اور بابا کے محبت بھرے سائے میں ہم سب خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ بڑی اڈے نے سارے گھرانے کو مالا کی طرح ایک دھاگے میں پرو رکھا تھا۔ سب اکٹھے مل کر رہتے تھے۔

وہ بچپن کے دن پھر سے مجھے اماں اور بڑی ادے کی گود میں لے گئے۔ اور میں پھر سے یادوں کی وادیوں کی سیر کو نکل گئی۔ بڑی ادے مجھے لائف بوائے شیمپو دیتے ہوئے جلدی سے نہانے کا کہتے ہوئے میرا لنچ بنانے چلی گئیں۔

میں لائف بوائے شیمپو کی بوتل ہاتھ میں پکڑ کر اکثر خود کو بھی بوتل پر بنی بال لہراتی لڑکی ہی تصور کرتی تھی۔ نہا کر آئی تو اماں نے تولیے سے بال خشک کیے اور اپنے سامنے بٹھا کر دو چوٹیاں گوندھ دیں۔

اماں اتنی مضبوطی سے چوٹی کستی تھیں کہ میرا سر دکھ جاتا تھا۔

''اماں آپ ہمیشہ مضبوط چوٹی کیوں گوندھتی ہیں۔'' میرے سوال پر اماں مسکرا کر رہ جاتیں۔

''یہ بالوں کے لیے اچھا ہوتا ہے تمہارے بالوں کی حفاظت کے لیے لائف بوائے شیمپو ہے اور تمہارے بالوں کی بقایا دیکھ بھال کے لیے میرا پیار......'' اماں مسکرا کر کہتی کتنی پیاری لگا کرتی تھیں۔

''یعنی میری دو مائیں ہوئیں۔ ایک آپ اور ایک لائف بوائے شیمپو۔'' میں اٹھلا کر کہتی دونوں چوٹیاں گھمانے لگتی۔

''بالکل! میری بچی!'' بڑی ادے دور سے یہ نظارہ دیکھ کر محظوظ ہوتی رہتیں۔

بی جان کا چھوٹا سا بنگلہ اگرچہ حویلی کے دوسرے سرے پر تھا لیکن بی جان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ بھی اپنے گھر کا کام نمٹا کر ادھر ہی آ جایا کرتی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی محبتیں ہم سب پر ہی لٹائی تھیں اور میں تو ان کی چہیتی تھی۔ میرے کتنے ناز اٹھایا کرتی تھیں وہ۔ ان کی یاد آتے ہی ایک نرم سی مسکراہٹ خود بخود میرے لبوں پر پھیل گئی۔

ہم پشاور کے مضافات میں پہنچے تو دن بھر کا تھکا ہارا سورج اپنا سفر مکمل کر کے غروب ہونے کو تھا۔ ایک بڑا سا اورنج تھال تھا جو دھیرے دھیرے دھرتی کے سینے میں اتر رہا تھا۔ میں پوری طرح الرٹ ہو کر بیٹھی تھی تا کہ ڈرائیور کو راستہ بتا سکوں۔ ہمارے گاؤں کو جانے والی سڑک یہیں سے سیدھے ہاتھ کو جاتی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو بتایا تو اس نے گاڑی کو اس سڑک پر ڈال دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ سڑک اب پکی ہوگئی تھی۔ دونوں کناروں پر یوکلپٹس کے درخت بھی لگے تھے۔ اگر موڑ پر گاؤں کا نام نہ لکھا ہوتا تو شاید میں پہچان بھی نہ سکتی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ ایک اداس اور سوگواری شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ بہت ساری تبدیلیوں کے باوجود کچھ جانی پہچانی نشانیاں ابھی باقی تھیں جو بتا رہی تھیں کہ میں صحیح راستے پر جا رہی ہوں۔ میں ڈرائیور کو گائیڈ کرتی جا رہی تھی۔ جب گاڑی ہمارے گاؤں کی مانوس گلیوں میں داخل ہوئی تو اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا لیکن میری یادداشتوں میں تمام راستے' گلیاں اور موڑ اسی طرح تر و تازہ تھے۔ جب گاڑی ہماری قدیم حویلی کے بڑے سے آہنی گیٹ کے سامنے جا کر رکی تو دستک سے قبل ہی کرمو کاکا نے گیٹ کھول دیا۔ ڈیوڑھی میں زرد سا بلب روشن تھا۔ میں اپنی گرم شال کو اپنے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر گاڑی سے اتری تو اتنی مدت کے بعد بھی کرمو کاکا نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کی بوڑھی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں جنہیں بار بار وہ اپنے کمبل سے رگڑ کر صاف کر رہے تھے۔ اتنی دیر میں ڈرائیور نے میرا سامان نکال کر باہر رکھ دیا۔ طے شدہ رقم اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ

رخصت ہوگیا۔ کرمو کاکا میرا سامان اٹھا کر بڑی حویلی کی طرف چل پڑے۔ میرے قدم بے ساختہ بی جان کے چھوٹے سے بنگلے کی طرف اٹھ گئے جو حویلی کے دوسری جانب آخری کنارے پر بنا تھا۔

شاہ بلوط کے اونچے درختوں کی اوٹ میں بنا یہ چھوٹا سا گھروندہ مجھے ہمیشہ بی جان کی طرح ہی لگتا تھا جیسے سفید ململ کا دوپٹہ لپیٹے جاء نماز پر بیٹھی تسبیح رول رہی ہوں۔ مجھے ان کی طرح ان کے اس چھوٹے سے گھروندے سے بھی بہت پیار تھا جس میں ہمارے بچپن کے بہت خوشگوار دن بیتے تھے۔ سردیوں میں بی جان آتش دان کے گرد صندلی لگاتی تھیں جس میں اُن سمیت ہم سب گھس جایا کرتے۔ درمیان میں چھوٹی ٹیبل پر ڈرائی فروٹ کی ڈش پڑی ہوتی۔ چلغوزے، بادام، پستے وغیرہ جو آغا جی کابل سے لایا کرتے تھے، کوئلوں پر قہوے کی تام چینی کی کیتلی سے بھاپ اٹھ رہی ہوتی، ٹیبل پر قہوے کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں کے ساتھ قندانی میں مصری کی ڈلیاں اور ایک پیالے میں رنگ برنگے ریپروں میں لپٹی ٹافیاں پڑی ہوتیں جن کو مونہہ میں رکھ کر ہم قہوہ پیا کرتے۔ آغا جی موج میں ہوتے تو ہمیں کہانی سنایا کرتے جو اتنی لمبی ہوتی کہ رات ختم ہوجائے، یہ کہانی ختم نہیں ہوتی تھی یا پھر وہ ہمیں جنگ عظیم کے قصے سنایا کرتے تھے۔ کیا خوب دن ہوا کرتے تھے وہ بھی!

میں اپنی سوچوں میں گم ان کے بنگلے کے گیٹ تک جا پہنچی۔ میں نے ہلکا سا ہاتھ لگایا تو گیٹ کھلتا ہی چلا گیا۔ برآمدے میں زرد رنگ کا بلب جل رہا تھا جس کی دھندلی سی روشنی آنگن تک آرہی تھی۔ میں نے جلدی سے آنگن پار کیا تو سردی کی ایک لہر میرے پورے وجود کو کپکپا گئی۔ مرکزی دروازہ کھلا تھا، سامنے آتش دان میں موٹی موٹی لکڑیاں جل رہی تھیں۔ بی جان اپنی مخصوص ساگوان کی آرام کرسی پر گرے رنگ کی شال اوڑھے بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھیں، کوئلوں پر قہوے کی بھاپ اڑاتی کیتلی پڑی تھی۔ اخروٹ کی لکڑی کی چھوٹی تپائی پر دو پیالیاں اور مصری والی قندانی بھی پڑی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ ذرا حیران نہیں ہوئیں، نہ ہی چونکیں، مجھے یوں لگا جیسے میرے آنے کی اطلاع انہیں پہلے ہی مل چکی ہو۔ کوئی شکوہ شکایت کیے بغیر وہ بڑے خلوص سے مجھے ملیں اور پیالی میں قہوہ ڈال کر مجھے دیا۔ میں نے مصری کی ایک ڈلی اٹھا کر منہ میں رکھی اور گرم گرم قہوے کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگی۔ میں خاموشی سے بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی اور اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اِن گزرے سالوں نے ان پر کیا اثرات ڈالے تھے؟ وہ مسکرا کر بولیں۔ ”کیا تم ابھی تک ناراض ہو؟“

”نہیں بی جان، اگر ناراض ہوتی تو کیا خود چل کر آپ کے پاس آتی؟“

”بیٹا! شاید ہم ہی غلط ہوں مگر ہماری تربیت ہی کچھ اس انداز سے ہوئی تھی کہ مادی اشیاء کو رشتوں پر فوقیت نہ دی جائے کیونکہ رشتے بہرحال زیادہ اہم ہوتے ہیں۔“

”لیکن یہ سوچ دونوں طرف ہونی چاہیے نا، قربانیاں صرف عورتوں کو ہی کیوں دینا پڑتی ہیں؟“

”اس لیے کہ ہمارا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے، ہم عورتوں کو ہمیشہ مرد کے سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ باپ، بھائی یا شوہر ہی عورت کا محافظ ہوتا ہے۔ بازو ٹوٹیں تو گلے کو آتے ہیں۔ اب زیتون کو دیکھو نا، جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی۔ انہیں اور ان کی یتیم بچیوں کو کس نے سہارا دیا تھا؟ بھائیوں نے ورنہ رواج کے مطابق انہیں اپنے آوارہ مزاج دیور سے شادی کرنا پڑتی جس کی پہلے ہی دو بیویاں اور کئی بچے تھے۔ اگر بھائی اس کے ساتھ کھڑے نہ ہوتے تو وہ زبردستی کر کے اس کی زندگی جہنم بنا دیتے اور پھر تمہیں یاد ہوگا، تمہارے بابا میرے ساتھ کتنی محبت کرتے تھے، ان محبتوں کو قائم رکھنے کے لیے مادی اشیاء کے علاوہ بھی بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے جو ہمیں سکھایا گیا تھا اور جس کو ہم ٹھیک سمجھتے تھے، وہی نصیحت ہم اپنے بچوں کو کر سکتے تھے نا؟ کیا تم جانتی ہو کہ ان محبتوں کو قائم رکھنے کے لیے مجھے کیا کچھ قربان کرنا پڑا تھا؟“

میں حیرت سے بی جان کو دیکھ رہی تھی۔ آج مجھے وہ ہمیشہ سے بہت مختلف نظر آرہی تھیں۔

”تمہیں پتا ہے نا، تمہارے داجی اور بڑی اَدے شادی کے کئی سال بعد تک اولاد کی نعمت سے محروم رہے تب مجبوری کے تحت انہیں چھوٹی اَدے سے شادی کرنا پڑی لیکن بڑی اَدے کے عزت و احترام میں کوئی فرق نہ

آیا۔ انہوں نے بھی چھوٹی اڈے کو چھوٹی بہن کا درجہ دے دیا۔ ہم نے ان دونوں کو بھی روایتی سوکنوں کی طرح لڑتے جھگڑتے یا ایک دوسرے کی جڑیں کاٹتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ چھوٹی اڈے پر اللہ کی مہربانی ہوئی اور ایک سال کے اندر ہی تمہارے داجی کو اپنی جائیداد کا وارث مل گیا۔ ان کی اس خوشی میں بڑی اڈے نے ان سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تمہارے بابا کو جنم تو چھوٹی اڈے نے دیا تھا لیکن ان کو پالا پوسا بڑی اڈے نے ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تمہارے بابا اپنی ماں سے بڑھ کر بڑی اڈے کو چاہتے تھے پھر شاید اللہ تعالیٰ کو بڑی اڈے کی محرومی پر رحم آ گیا۔ تمہارے بابا کے تین سال بعد اللہ نے میری شکل میں ان کو بیٹی سے نواز دیا لیکن تمہارے بابا کی محبت میں کمی نہیں آئی۔ وہ ہمیشہ ان کو مجھ سے زیادہ چاہا کرتی تھیں اور تمہیں یاد ہے نا کہ جب اسکول جانے سے پہلے ایک دن تمہارا لائف بوائے شیمپو ختم ہو گیا تھا۔ تم نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا تو بڑی ادے نے مسکراتے ہوئے اپنے صندوق سے تمہیں لائف بوائے شیمپو کی نئی بوتل نکال کر دی تھی اور کہا تھا یہ شیمپو میں نے صرف اس لیے سنبھال کر رکھا تھا کہ میری گڑیا کو ایمرجنسی میں بھی ایسی صورت حال پیش آ جائے تو وہ پریشان نہ ہو۔''

میری آنکھوں میں بڑی ادے کی محبت یاد کر کے آنسو آ گئے۔

☆☆......☆☆

شام کو پورے گھر میں رونق سی لگ گئی تھی۔ آج لگ رہا تھا کہ حویلی پھر وہی رونقیں لے کر ماضی کا حصہ بن گئی ہے۔ لیکن ماضی تو ماضی ہوتا ہے۔ آج سب خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہے تھے۔ میری نظریں بڑی ادے کو ڈھونڈ رہی تھیں اور پھر کرموکا نے بڑی ادے کے آنے کی اطلاع دی۔ سب خاموش ہو گئے۔ بڑی ادے کچھ دیر بعد ہم سب کے درمیان تھیں۔ بڑی ادے مجھے دیکھ کر بے اختیار رو رہی تھیں۔

''میری گڑیا! تم نے تو ہمیں اپنے ہجر میں ختم ہی کر دیا تھا۔ میں ہر نماز میں تم سے ملنے کی دعائیں کرتی تھی اور دیکھو اِس رمضان کس بابرکت مہینے میں میری دعائیں قبول ہوئی ہیں۔''

میری آنکھوں میں بھی جیسے ساون ٹھہر گیا تھا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں خود سے بڑی ادے کو جدا کر دوں اور پھر جب مردوں نے تراویح پڑھنے کے لیے اٹھنا چاہا تو میں یکدم بول پڑی۔

''آج چونکہ میرا بچپن پھر سے ایک بار میرے سامنے آ گیا ہے۔ اِس لیے میں بڑی ادے کو وہ چیز پیش کروں گی جو مجھے آپ سب کے درمیان واپس آنے پر مجبور کر گئی تھی۔''

سب میری طرف متوجہ تھے۔ میں اُٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور بیگ سے بڑی ادے کے لیے لایا ہوا گفٹ لے آئی۔

''بڑی ادے یہ آپ کے لیے ہے۔''

''ارے اس میں کیا لے آئیں میری گڑیا! بھلا اِس عمر میں میں تم سے تحفے لیتی اچھی لگوں گی۔''

''بڑی ادے یہ تحفہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ خاص چیز ہے جس نے مجھے آسٹریلیا سے آپ کی حویلی میں آنے پر مجبور کر دیا۔ پلیز اِسے کھول کر دیکھیے۔''

بڑی ادے نے گفٹ پیپر ہٹایا تو اُس میں سے لیپ ٹاپ نکلا۔

''یہ کیا ہے گڑیا؟ میں اس کا کیا کروں گی؟''

''بڑی ادے میں نے کہا نا کہ میں آپ کو وہ چیز دکھا رہی ہوں جس نے مجھے آپ کے پاس آنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد میں نے اُسے آن کیا اور سرچ کر کے کچھ دیر بعد اُس میں لائف بوائے شیمپو کا اشتہار آنے لگا۔

''بڑی ادے یہ لیجیے۔'' میں نے لائف بوائے شیمپو کی بوتل بڑی ادے کو تھمائی۔

''بڑی ادے لائف بوائے شیمپو میرا بچپن اور آپ کی یاد بن کر ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ اور یہ اشتہار میرے پاکستان آنے کی وجہ بنا۔''

وہاں پر موجود سب اس محبت پر جھوم اٹھے تھے اور سب نے ایک واشگاف نعرہ بلند کیا۔

''لائف بوائے شیمپو تم واقعی باکمال ہو۔ لائف بوائے شیمپو ہمیشہ کچھ نیا کر دکھائے۔''

☆☆......☆☆

قسط 18

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کردیں گی، رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

بچیاں تو بچیاں ہی تھیں مگر چمن کو تو فوراً خود پر قابو پانے کا مظاہرہ کرنا لازم آتا تھا۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھی اور بہت پُرجوش انداز میں ٹینا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"How Are You Teena" ۔ وہ اب بالکل نارمل انداز میں ٹینا کی خیریت پوچھ رہی تھی۔

"So Fine...... آپی...... یہ آپ کی Daughters ہیں؟" ٹینا بڑی معصومانہ مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

"Oh Yes۔ آپ کے ساتھ فرینڈ شپ کرنے آئی ہیں۔" چمن نے مہ وش و مہ پارہ کو مزید قریب کرتے ہوئے بہت مہربان لہجے میں جواب دیا۔

"یہ میرے ساتھ کھیلیں گی ناں؟" ٹینا پُرشوق نظروں سے دونوں بچیوں کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہم نہیں کھیلیں گے خالہ...... یہ تو بہت بڑی ہیں۔" مہ پارہ چھوٹی ہونے کے ناطے زیادہ دیر چپ نہ رہ سکی۔ اس عمر کے بچے اپنے جذبات پوشیدہ رکھ ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ بچے غیر سیاسی ہوتے ہیں۔

چمن نے قدرے شرمندگی کے ساتھ ڈاکٹر علی عثمان کی طرف دیکھا تھا۔ ٹینا مہ پارہ کی بات سن کر رو پڑی تھی۔

"میرے ساتھ کوئی بھی نہیں کھیلتا......" ٹینا کا رونا چمن کے لیے مزید شرمندگی کا باعث تھا۔ یوں...... گویا اس ساری بحرانی صورت حال کی ذمہ دار وہ خود ہو۔ اس نے آگے بڑھ کر ٹینا کو گلے سے لگا لیا۔

"پلیز...... اچھے بچے بالکل نہیں روتے...... Actually...... انہوں نے آپ کو فرسٹ ٹائم دیکھا ہے تو اتنی Formal ہو رہی ہیں۔

روز آپ کے پاس آئیں گی تو خود بخود فرینڈ شپ ہو جائے گی پھر میں آپ کو ان کے ساتھ پارک بھی لے جاؤں گی۔

کبھی کبھی آئس کریم پارلر بھی جائیں گے۔ کبھی 3D مووی دیکھنے بھی جایا کریں گے۔

بس فرینڈ شپ پکی ہو جائے بہت Busy ہو جائیں گے ہم لوگ وہ ٹینا کو بہلانے میں یوں سرتاپا غرق ہوئی کہ نہ یہ احساس ہوا کہ ڈاکٹر علی کی نگاہ میں کتنی بے ساختگی اور سپاس گزاری ہے۔ نہ ہی بچیوں کے چہروں پر نظر ڈالنے کی مہلت ملی جو خالہ کے انتہائی خوبصورت دامن قیامت تک رسائی رکھنے والے طولانی پروگرام دم بخود سن رہی تھیں۔

یعنی اگر ٹینا ساتھ ساتھ ہو تو زندگی کی اتنی حسین مصروفیات ہوں گی یہ تو بہت کمال ہے۔

مگر ٹینا کے ساتھ ان کو کھیلنا پڑے گا...... پُر لطف زندگی کی یہ بہت بھاری شرط لگ رہی تھی۔

"بھائی جان...... یہ والی آپی تو بہت مزے کی ہیں۔ She Is Wonderfull۔" ٹینا نے زبردست تالیاں بجائیں۔

"ایکسکیوزمی...... یہ آپی نہیں ہیں خالہ ہیں۔" ماہ پارہ کو قدرتی طور پر ٹینا سے حسد محسوس ہو رہا تھا۔ اتنے سارے اکٹھے پروگرام خالہ نے ان کے ساتھ تو شیئر نہیں کیے تھے۔

"خالہ کیا ہوتی ہے بھائی جان......؟" ٹینا نے معصومیت سے سوال کیا۔

"خالہ کوہِ قاف کی سب سے خوبصورت پری ہوتی ہے۔ اس کے آس پاس فلاورز کا سرکل ہوتا ہے۔ اتنے سارے فلاورز ہوتے ہیں کہ کوئی بھی اس کے قریب نہیں جا سکتا۔ کیونکہ فلاورز کی باؤنڈری لائن کراس نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر علی عثمان...... بہت سلاست سے بولتے ہوئے چمن کے پہلو میں آ کھڑے ہوئے۔

چمن اب شرمندہ ہی ہو کر رہ گئی۔ انداز ایسا ہی تھا گویا ڈاکٹر علی نے سچ مچ اُس کی حقیقت آشکار کر دی ہو۔ وہ

واقعی کوہِ قاف کی انتہائی مصروفیات سے بمشکل وقت نکال کران کے گھر آئی ہو۔

''Oh Yes......کوہِ قاف میں Fairies اور ایک پرنس ہوتا ہے۔ آپ کا پرنس کہاں ہے آپی؟'' ٹینا بہت بھولپن سے پوچھ رہی تھی۔

سورج نے غضبناک ہوکر دبیز بادلوں پر آتشیں نگاہ دوڑائی۔

ساون کے بادل خزاں کے بادلوں کی طرح بھاپ بن کراڑ گئے۔

''مہ وش...... آیئے آپ کو ٹینا کے Lovely Pets دکھاتے ہیں۔'' ڈاکٹر علی عثمان بچوں کے معالج تھے۔ گویا ''شاہی طبقہ'' سنبھالنے کی مہارت رکھتے تھے۔ ایسی نازک صورت حال کو سنبھالنا تو کوئی کام ہی نہ تھا۔

بڑے آرام سے مہ پارہ کا ہاتھ تھام کرایک طرف ہولیے۔

چمن کو اپنے اعصاب نارمل کرنے کا کھلا میدان میسر آیا۔ اس نے بے اختیار اور فطری انداز میں ٹینا کو گلے لگالیا۔

''Teena... Do You Like Telling Story''۔

''I Love It...''۔ ٹینا نے اظہارِ پسندیدگی کی شدت ظاہر کرنے کے لیے۔ دونوں ہاتھ سختی سے ایک دوسرے میں پیوست کیے آنکھیں بھی بند کرلیں۔ اور اس غیر امکانی وقفے میں چمن نے ایک بار پھر ٹینا کے سراپے پر نگاہ کی۔

ایسا سانچے میں ڈھلا متناسب قدوقامت...... جس پر جو پوشاک سجائی جائے۔ اس کی قیمت گراں ہوجائے۔ جو رنگ پہنے تخلیق کا مقصد مکمل کرے۔

مگر نگاہ ایک بچے کی نگاہ، سیاست ومنافقت کی کثافتوں سے پاک دل کا آئینہ......

مسکراہٹ بے ساختہ وبھرپور

جو جبر سے مسکرانے والوں کو دعوت دیتی ہے کہ آؤ میں بتاتی ہوں کیسے مسکراتے ہیں...... مسکراہٹ ہوتی کیا ہے؟''

یہ کس راز کا استعارہ ہے......

یہ خالق کی الوہیت کا اشارہ ہے کہ میں نے یہ کائنات محبتوں اور مسکراہٹوں کے لیے تخلیق کی ہے۔

خالق اول وحقیقی کا سو فیصد ذاتی منصوبہ، جس میں اس کے ساتھ کسی اور وجود کا تعاون یا مشورہ شامل وشریک نہیں۔ جس کو فطری نظارے میسر نہ آئیں وہ بچوں کے ساتھ وقت گزارے اس لیے کہ بچے کی نگاہ میں فطرت اپنا ہونا ظاہر کرتی ہے اپنی موجودگی کا یقین دلاتی ہے۔

اسی لیے دیکھا گیا ہے...... بچوں سے پیار کرنے والے، بچوں کو اہمیت دینے والے لوگ بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔

چہرے کے نقش ونگار، رنگت، بالوں کا رنگ خواہ کیسا ہو۔ اپنی مادی ساخت میں، مشرق، مغرب، مشرق بعید، لاطینی، شمالی، جنوبی امریکہ، افریقہ، کسی جگہ کا باشندہ ہو۔

فطرت سے دوستی، بچوں پر ٹوٹ کر آنے والا بے ساختہ پیار ادب، مؤدب، محبت انسان کو بے پناہ حسین و پُرکشش بنادیتا ہے ایسا حسن وجمال جو وقت کی قید سے ماورا ہوتا ہے۔ ایسی توانائی جو مرقد میں ساتھ اترتی ہے۔

اسی لیے ڈاکٹر علی دنیا جہاں کے بچوں پر شفیق و مہربان ہے کہ وہ اس ناقابل بیان آزمائش سے گزر رہا ہے۔

اسی لیے اتنا پر کشش ہے کہ رش کی جگہ پر بھی سب سے ممتاز و نمایاں ہوتا ہے۔

چہرہ بھی مسکراتا ہے۔ آنکھیں بھی مسکراتی ہیں۔ جب نگاہ پڑتی ہے۔ مسکراہٹ سے دل شاد ہوتا ہے۔

اس لیے کہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت، سیاست، منافقت کے بجائے فطرت کے ساتھ گزارتا ہے۔

ٹینا چمن کے گلے سے ابھی تک یوں لگی ہوئی تھی گویا اس کا وجدان محبت کا ذوق و شعور بیدار کر رہا ہو۔ کہہ رہا ہو کہ کچھ خاص ہے۔ معمول سے کچھ ہٹ کر ہے۔

اسی لمحے ٹینا کی انڈونیشین میڈ سوزی اندر داخل ہوئی۔ صورتِ حال دیکھ کر قدرے حیران سی ہوئی۔ کہ چمن کو پہلی بار دیکھ رہی تھی مگر ٹینا یوں چمن کے گلے سے چپکی ہوئی تھی جیسے مدت سے انتظار کر رہی تھی۔

اس نے چمن کو بہت مودبانہ انداز میں وش کیا پھر ٹینا کا ہاتھ تھام کر گویا ہوئی۔

''بے بی...... آپ آرام سے بیٹھو......'' پھر چمن کی طرف متوجہ ہوئی۔

''Have A Seat Maam''۔

''تھینکس......'' چمن نے بہت آرام سے ٹینا کے ہاتھوں کو آزاد کیا۔ گویا ریشم پھسل رہا ہو اور اس کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔ سوزی کو دوستانہ مسکراہٹ سے فیضیاب کر کے اس طرف دیکھنے لگی جس طرف ڈاکٹر علی بچیوں کو لے کر گئے تھے۔

''سوزی آپ کو پتہ ہے یہ آپی ہیں...... اور ان کی بہت بہت Cute سی Daughters ہیں۔''

''Oh, But Where Are They'' سوزی نے حیران ہو کر نظریں دوڑائیں۔

''آتی ہیں...... ڈاکٹر صاحب کے ساتھ شاید لان میں ہیں۔ چمن نے سوزی کی حیرت تمام کی۔

''Oh Good'' سوزی نے اپنے گیلے گھنگھریالے بالوں پر بڑی ادا سے انگلیاں چلائیں۔

ڈیری میں کام کرنے والی بیوہ ماں کی اس محنتی بیٹی کو پاکستان میں بڑا رحمتوں بھرا گھر مل گیا تھا۔ وہ جونیئر کیمبرج پڑھی ہوئی بڑی سلیقہ مند اور مہذب لڑکی تھی۔

دو تین سست الوجود آیاؤں کو بھگتنے کے بعد ڈاکٹر علی عثمان کو یہ ایماندار، محنتی اور ضرورت مند بلکہ انتہائی ضرورت مند میڈ مل گئی تھی۔ مہنگی تو تھی مگر زندگی میں سکون آ گیا تھا۔

ماں، باپ، بہن، بھائی، دوست سب کی کمی کو پورا تو نہیں کر سکتی تھی مگر کوشش کرتی تھی کہ ٹینا ہر وقت خوشگوار موڈ میں رہے۔

اسی وقت مہ وش، ومہ پارہ آرام سے آہستہ آہستہ چلتی اندر آئی تھیں۔ اب بھی ٹینا کی طرف بہت محتاط انداز میں دیکھ رہی تھیں مگر اس بار نگاہ میں خوف و گھبراہٹ کا تاثر نہیں تھا۔

''ہائے Babies......'' سوزی بچیوں کو وش کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پانچ چھ بچے شور مچاتے اندر داخل ہوئے۔

''ٹینا ہم آ گئے...... ایک گول مول سرخ و سفید بچہ اپنے وزن سے عاجز پھولی پھولی سانسوں کے درمیان بولتا ہوا ٹینا کی طرف بڑھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بمشکل نو دس سال کا دکھائی پڑتا تھا۔ تین بچیاں جو مہ پارہ کی عمر کی تھیں ایک البتہ ٹین ایج لڑکی تھی جو بہت مہذب اور رکھ رکھاؤ والی نظر آ رہی تھی۔ چاروں بچے اسی کے

ساتھ تھے۔ اسی نے چار گفٹ پیکس اٹھائے ہوئے تھے۔ آنے والے بچوں نے ٹینا کے ساتھ جس گرم جوشی و پیار کا مظاہرہ کیا اس سے مہ وش و مہ پارہ کا رہا سہا تکلف بھی جاتا رہا۔ بچوں کو دوستی کرنے میں اتنا ہی ٹائم لگتا ہے جتنا پرندے کو اڑان کے لیے پَر تولنے میں لگتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بچے آپس میں اس طرح گھل مل گئے جیسے ایک اسکول ایک کلاس میں پڑھتے ہوں۔ ایک ہی گاڑی میں اسکول آتے جاتے ہوں۔ ایک ہی سوئمنگ پول کے واش رومز میں شاور لینے کے لیے روزانہ Que بناتے ہوں۔ اور غلطی سے ایک دوسرے کا جوتا پہن کر کبھی کبھی گھر بھی چلے جاتے ہوں۔

چمن ان کو مگن دیکھ کر ڈاکٹر کی تلاش میں لان کی طرف چلی آئی کیونکہ جب سے وہ مہ وش و مہ پارہ کو Pets دکھانے لان کی طرف گئے تھے۔ اس نے دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔ ذہن ٹینا کی طرف سے ہٹا تو فوراً ہی ڈاکٹر علی کی غیر موجودگی محسوس ہونے لگی تھی۔ مگر ڈاکٹر علی لان میں بھی نہیں تھے۔

لان میں بہت خوبصورت لان Chairs کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ اندر سے بچوں کے بے پناہ شور شرابے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

چھوٹا سا نفاست سے سنوارا ہوا موسم کے پھول پھلواری سے مہکتا لان اسے گوشۂ عافیت محسوس ہو رہا تھا۔

وہ ایک Chair پر بیٹھ کر نیلگوں آسمان کی وسعت میں کھوگئی۔

نیلا آسمان...... ایک استعارہ ہے۔

زنجیروں کے بندھن سے نجات کا احساس......

یہ خاکی پنجرہ...... یہاں پڑا...... کہ وہاں پڑا......

روح جب اڑان بھر کر وسعتوں میں سیر کناں ہوتی ہے۔ تو بات کی تہہ تک اُترنے کا ہنر ہاتھ لگتا ہے۔

ادھوری محبتیں......

ادھوری باتیں......

ادھوری خواہشیں......

جب کھل کر جینے کے لیے الفاظ ایجاد و تخلیق ہو سکتے ہیں تو سوچ کی انتہا آگاہ کرتی ہے کہ...... کھل کر جیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کی...... قیود و شرائط ہیں۔

زندگی میں کبھی کچھ راہِ اختصار یا ''Short Cut'' سے حاصل نہیں ہوتا ہر شے فطری مراحل سے گزاری جاتی ہے۔

تب ہی بات کی تہہ میں اترا جا سکتا ہے۔

ادھوری آگہی ادھورے خواب بنتی ہے۔

اسے اچانک...... ایک دم سے، ایک پل میں سمجھ آ گیا تھا۔

عورت کتنی بے وقوفیاں کرتی ہے۔

کبھی محبت کی بھیک پر خوش نظر آتی ہے۔ کبھی روٹی کی ضمانت پر پھولی نہیں سماتی۔

بھلائی اور خیر کا کام روزانہ کی بنیاد پر انجام دے کر۔ کھوکھلی خوشیوں کے مہاجن سے اپنی روح کو آزاد کیوں نہیں کراتی؟ ''الوہی، دائمی، روحانی مسرتیں...... یہ اپنے وجود میں ہوتی ہیں......

یہ تو جنم دینے والی ماں بھی مٹی میں نہیں گوندھ سکتی۔ ہر روح بقدر ظرف و حوصلہ ان مسرتوں کا ذائقہ چکھ سکتی ہے۔ ہر وقت ''ندیدے'' ''نیتوں'' کی طرح اپنے ہی جیسے انسانوں کو آس بھری نظروں سے دیکھتے رہنا۔

''یہ..... شاید خوشی کی ضمانت دے گا'' وہ شاید نانِ جویں کی فکروں سے آزاد کر دے گا۔

تم تو مجھے دکھ دے ہی نہیں سکتے..... آپ تو شکل ہی سے اتنے معقول لگتے ہیں کہ زندگی کے سارے دلدر سمیٹتے دکھائی دے رہے ہیں۔

تم، آپ، وہ، یہ، ہم.....''

''میں بھی تو ہوں..... ''میں'' میں بھی تو کسی کا ''تم'' یا ''وہ'' ہوں.....

ہر وقت سکون و راحت کی تلاش میں بھک منگوں کی طرح اپنے ہی جیسے انسانوں کی شکلیں تکتے رہنا..... کوئی عقل کی بات ہے؟''

''میں'' جب کسی کا ''تم'' بن جاتی ہوں۔

تو کیا اس کے خوابوں کی تعبیر کی ضمانت دیتی ہوں..... جب خود یہ بار نہیں اٹھاتی تو اپنا بوجھ دوسروں پر لادنے کے منصوبے کیوں سوچتی ہوں.....؟

وہ..... روشن ضمیری کی کرنوں سے منور ہو کر بے رحم سچائیوں سے ہاتھ بڑھا بڑھا کر دوستی کر رہی تھی۔

جن سے اکثر انسان کنی کترا کر گزر جایا کرتے ہیں۔

اپنے دھیان میں بیٹھی..... شام کی سرمگیں روشنی میں خلوص و سچائی کے ملکوتی رنگ میں رنگی ہوئی وہ کتنی یکتا و مرتب و منظم نظر آئی تھی۔

دھیان، پل صراط کی بال سے باریک تار پر محوِ سفر تھا۔

ڈاکٹر علی عثمان عقبی زینے سے واپس لان میں آئے تو لگا وہ کوئی طاقتور خیال ہے۔

آہٹ سے تحلیل ہو جائے گا۔

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن..... کی صورت حال درپیش تھی۔ لیکن مشکل آسان ہوئی۔

مہ پارہ خالہ کی کمی کو محسوس کر کے قدرے گھبرائی ہوئی لان میں آئی تھی اور خالہ کو بیٹھا دیکھ کر گویا جان میں جان آ گئی تھی۔

آپ سب بچوں نے مل کر خالہ کو اتنا تنگ کیا کہ بے چاری یہاں آ کر بیٹھ گئیں..... ڈاکٹر علی نے یوں کہا گویا وہ بھی مہ پارہ کے ساتھ ہی منظر پر طلوع ہوئے ہوں اور کہہ رہے ہوں میں نے کچھ نہیں دیکھا۔

قسم کھانے کی عادت نہیں ہے..... واقعی میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ چمن کا دل دھک سے رہ گیا۔

وہ غیر ضروری محتاط محسوس ہو رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

تدفین کا عمل مکمل ہوتے ہی ثمر تو سر پر پاؤں رکھ کر ہوٹل کی طرف بھاگا۔ آخر رات کا جاگا ہوا تھا۔ عیش و نشاط کے تمام اصول و قوانین پر عمل درآمد کرنے کے بعد آخری شق یعنی میٹھی نیند سونے ہی جا رہا تھا کہ شبیر حسین کی ابدی نیند نے جگا کر بٹھا دیا۔

اسے اندازہ تھا کہ شبیر حسین کی تعزیت کا سلسلہ ابھی ایک دو دن تو لازمی چلے گا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

وہ لوگ بھی جو زندہ وجود کو لفٹ نہیں کراتے۔ "میت" میں ضرور آجاتے ہیں۔ میت میں نہ آسکیں تو تعزیت ضرور کرنے آتے ہیں۔

اس نے ندا کو سائیڈ میں بلاکر اپنے ہوٹل جانے کی بابت بتایا کہ اب اس کی حالت غیر ہورہی ہے۔ آرام کی سخت ضرورت ہے۔

ندا جو اُداسی کی تصویر بنی ہوئی تھی جواب میں کچھ نہ بولی اور سیل فون لاکر ثمر کو تھما دیا۔ ثمر نے خدا حافظ کہہ کر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

محبوبہ، معشوقہ بھی ہوتی تو جذبے توانا ہوتے......

جنگ میں دشمن کا چھوڑا ہوا ایک ہتھیار ہاتھ لگ گیا تھا۔ اَنا کی جنگ میں کام آرہا تھا۔

سب سے زیادہ Stress اَنا دیتی ہے۔

سب سے زیادہ اعصابی نظام کا ستیاناس اَنا کے ہاتھوں ہوتا ہے ضدی اور اَنا پرست لوگ جلدی تھک جاتے ہیں۔ مخلص اور بے لوث لوگ انتھک ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ جذبوں سے بھرپور ہوتے ہیں۔ جذبے کی قوت ان کو تھکنے گرنے سے بچاتی ہے۔

☆......☆......☆

کیک کٹنے کے بعد سوزی ملازمہ کے ساتھ مل کر بچوں کو ریفریشمنٹ شیئر کررہی تھی۔

چمن ڈاکٹر علی عثمان کی اسٹڈی دیکھنے ان کے ساتھ اسٹڈی میں چلی آئی تھی۔

صاف ستھری، تین طرف شیشے کی الماریاں جو بہت مرتب اور لائبریری کے اصول کے مطابق رکھی گئی تھیں۔

بڑے سے اٹالین دریچے کے ساتھ رائٹنگ ٹیبل، سلم لائن ٹیبل لیمپ چھوٹے چھوٹے سرخ گملوں میں سائے کے پودے، جن کی چمکدار ہریالی ماحول کو عجیب سی تازگی دے رہی تھی۔

چمن نے ایک چھوٹی سی صاف ستھری منظم لائبریری پہلی بار دیکھی تھی وہ یہ نفاست و ذوق دیکھ کر مبہوت سی نظر آرہی تھی۔

آپ کی اتنی مصروف زندگی ہے۔ آپ کو مطالعے کا ٹائم مل جاتا ہے؟ وہ ایک ریک کے قریب جاکر پلٹ کر پوچھنے لگی۔

جب زندگی اپنے کئی روپ میں خود کو ظاہر کرتی ہے تو وقت کی تقسیم بھی سکھا دیتی ہے۔ بڑا مرتب واضح جواب ملا تھا۔

چمن کے دیکھنے کے انداز میں بڑی بے ساختگی تھی۔ وہ اپنی اس بے ساختہ ادا پر خود ہی محجوب سی ہوگئی۔

آپ کی فیملی میں آپ اور ٹینا کے علاوہ کون کون ہے۔ معاً چمن کو دھیان آیا کہ وہ اتنی دیر سے آئی بیٹھی ہے۔ سوزی اور ایک ملازمہ کے علاوہ کوئی نیا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔

سوال سن کر ڈاکٹر علی کے چہرے پر یکدم گہری سنجیدگی چھا گئی۔ میرے پیرنٹس حیات نہیں ہیں۔

جب میری عمر صرف پندرہ سال تھی اور ٹینا دو سال کی تھی تو میری Mother کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔

Father کی ڈیتھ ایک سال پہلے ہوئی ہے۔ ہم صرف دو بہن بھائی ہیں...... ڈاکٹر علی عثمان نے بڑا مفصل جواب دیا۔

"آپ نے شادی نہیں کی......؟" چمن نے اب قدرے ہچکچاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کی تھی......"

اب ایک ارتعاش سا پاؤں تلے ہوا تھا...... لگا...... زمین ہلی...... "کی تھی" کے دو الفاظ میں ایک ضخیم کتاب کا مواد تھا۔

"بہت تھوڑے سے دن رہی...... صرف تین مہینے...... وہ ٹینا کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ میرا ٹینا کو وقت دینا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ ٹینا اسپیشل ہے وہ تو Time And Space سے آزاد ہے۔ اسے تو جس وقت بھائی یاد آئے گا۔ بلائے گی۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر علی عثمان نے گہری سانس لی اور مسکرا کر چمن کی طرف دیکھا۔

"آپ کی شادی کو غالباً زیادہ وقت نہیں ہوا...... ابھی اپنا بچہ نہیں ہے تو اس وجہ سے بھانجیوں کو بہت اچھی طرح سنبھال رہی ہیں۔ اللہ اس اسپرٹ کو قائم رکھے۔

"بائی داوے آپ کے ہزبینڈ کیا کرتے ہیں؟ میرا مطلب ہے آپ سے محبت کرنے کے علاوہ......" ڈاکٹر علی عثمان کے انداز میں شائستگی بھی تھی اور شگفتگی بھی۔

چمن کو اپنے احساسات چھپانا مشکل ہوگیا۔ جلدی سے ٹیبل پر رکھا ڈیکوریشن پیس جو ایک کلرفل شیشے کی چھوٹی سی چڑیا تھی۔ اٹھا کر دیکھنے لگی۔

ملٹی نیشنل کمپنی میں M.D کی پوسٹ پر کام کرتے ہیں۔ MBA.CA اور پتہ نہیں کیا کچھ پڑھ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔

چمن نے بھی اپنے انداز کو شگفتہ بنانے کے لیے پورا زور لگایا تھا۔

"Good...... یعنی ہائی فائی کوالیفائیڈ بندہ ہے۔ میرا اندازہ ہے لوگ آپ کو آئیڈیل Couple سمجھتے ہوں گے۔ Obviously جب آپ جیسی لائف پارٹنر ان کو مل گئی ہیں تو پھر زندگی میں کسی شے کی کمی محسوس نہیں ہوسکتی۔ میرے دل میں آپ کی بہت زیادہ Respect ہے آپ کو بہن کے ساتھ پھر بچی کے ساتھ اور اب ان دونوں بچیوں کے ساتھ دیکھ رہا ہوں...... بہت Blessed ہیں آپ......"

"تھینک یو......" چمن نے تھینک یو کہہ کے فل اسٹاپ لگایا تھا۔ اسے اندیشہ لاحق ہوا کہیں وہ رو نہ پڑے۔ ڈاکٹر علی کی ستائش زخموں کے ٹانکے اُدھیڑ رہی تھی۔

چلیں اب آپ بھی ریفریشمنٹ انجوائے کریں۔ اور دعا کریں ٹینا اور مہ وش کی پکی دوستی ہو جائے۔

"اوہ...... شیور...... یہ دعا تو میں ضرور کروں گی۔ اس لیے کہ ان بچیوں کی کوئی ایسی دوست نہیں جس کے پاس یہ کچھ دیر کھیل کود کر Re Charged ہو جائیں۔"

چمن ڈاکٹر علی کے ہمقدم چلتے ہوئے مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر علی چمن کو لے کر دوبارہ بڑے سے لاؤنج میں چلے آئے۔ ون یونٹ طرز پر بنے ہوئے بنگلے کے گراؤنڈ فلور پر ڈرائنگ' ڈائننگ، لاؤنج اور کچن تھا۔ بیک سائیڈ پر اسٹڈی تھی۔ بیڈ روم فرسٹ فلور پر تھے ٹینا کے اوپر جانے کے لیے لاؤنج سے باہر ایک لفٹ تھی جو Wooden تھی۔ ایک چوڑے سے تختے کی شکل میں۔ چاروں طرف لوہے کی گرل تھی۔ ایک طرف سے گرل کھول کر ٹینا کی وہیل چیئر اس پر چڑھائی جاتی تھی۔

بچے کھانے پینے میں لگے ہوئے تھے۔ مہ وش و مہ پارہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ چمن کو دیکھ کر ایک سکھ کا

احساس مل رہا تھا۔

ڈاکٹر علی نے آگے بڑھ کر ایک خالی پلیٹ اٹھا کر چمن کو تھمائی اور لوازمات سے سجی ٹیبل کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ تھینک یو کہہ کر چمن اسنیکس پر نظر دوڑانے لگی۔

☆......☆......☆

P.C کے سویٹ میں داخل ہو کر وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح بیڈ پر اوندھ گیا تھا۔ ایک ہی زاویے سے دو گھنٹے تک پڑا سوتا رہا تو خود بخود نیند ٹوٹی۔

پہلے تو یہی سوچتا رہا کہ وہ کہاں ہے؟ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اس نے اندازے سے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ لیمپ کی ہلکی اور زرد روشنی چاروں اور پھیل گئی تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

چند لمحے سر جھٹک کر نیند کے غلبے سے نجات پانے کی کوشش کی پھر ذہن ندا کی طرف چلا گیا۔

سیل اس نے آف کر دیا تھا کہ لمبی اور گہری نیند کا پروگرام بنا کر بیڈ پر گرا تھا۔ مگر آنکھ خود بخود کھل گئی تھی۔

اس نے سیل آن کیا...... دو چار میسج الرٹ کی ٹون ماحول میں گونجی تھیں اس نے عجلت کے انداز میں میسج دیکھے...... سیلولر کمپنی کی طرف آنے والی کچھ پُرکشش آفرز تھیں۔

مس کال کوئی نہیں تھی۔ ڈائیلڈ کال کوئی نہیں تھی۔ البتہ ایک ریسیورڈ کال ضرور تھی۔ اشتیاق فطری تھا کہ کس نے کال کی تھی ریسیو تو یقیناً ندا نے ہی کی ہوگی...... بتانا بھول گئی ہوگی موقع ہی ایسا تھا مگر آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔

یہ نمبر وہ ندا کی وجہ سے خاص طور پر ڈیلیٹ کر چکا تھا۔ مگر اس کے ذہن سے کبھی ڈیلیٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ فون اور سم دونوں اسی نے لا کر دیے تھے۔ چمن کو سیل فون رکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا نہ اس نے غلطی سے فرمائش کی تھی مگر ثمر نے اپنی سہولت کے پیش نظر خود ہی گفٹ کے نام پر احسان کر دیا تھا۔

''0300-8222777 ...... ایک دفعہ میں آسانی سے یاد ہو جانے والا نمبر جو وہ بھول ہی نہیں سکتا تھا۔''
اس نے بے قراری سے کال آنے کا وقت دیکھا...... دورانیہ دیکھا۔ چند سیکنڈ کا دورانیہ ظاہر ہو رہا تھا۔ جس سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ بات نہایت مختصر ہوئی تھی۔ رات دو بج کر چالیس منٹ پر کال آئی تھی۔
اتنی رات کو کیوں فون کیا تھا اس نے...... کیا مصیبت آئی تھی جس غرور میں تھی اسی میں رہے...... کیوں مڑ مڑ کر دیکھتی ہے؟
پریشانی البتہ عود کر آئی...... ندا سے اس کی بات کیا ہوئی۔ کیا اس نے ندا کو بتایا ہو گا کہ وہ کون ہے...... اور اس نے بھی تو ندا سے پوچھا۔ ہو گا کہ وہ کون ہے؟ ثمر کہاں ہے؟''
کیا ندا کو فون کر کے پوچھوں......؟ وہ اُلجھنے لگا۔
نہیں اس طرح تو ندا چوکس ہو جائے گی۔ انتظار کرنا چاہیے کہ ندا خود اس سے پوچھے۔
اگر پوچھے گی تو وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ سمپل سادہ سی لڑکی...... زیادہ گہرائیوں میں نہیں جائے گی...... اس کو ہینڈل کرنا Issue نہیں اس نے اب اپنے آپ کو تسلی دی۔
تالاب میں پتھر گرا تھا...... دائرے تو بن رہے تھے۔

☆......☆......☆

''دیکھو...... اس دنیا میں کیا نہیں ہے دیکھنے کو...... کتنی بڑی ذمہ داری اللہ نے اس پر ڈالی ہے۔ عطیہ بیگم چمن سے آج کی تقریب کی روداد سن کر تعجب و تحیر کی کیفیت میں گویا ہوئی تھیں۔
''نانو...... ٹینا چھوٹی بچی نہیں ہیں...... وہ تو بڑی سی ہیں...... مہ پارہ عطیہ بیگم کی گود میں سر رکھے لیٹی بہت غور سے باتیں سن رہی تھی۔ ایک دم اُٹھ کر بڑے جوش و خروش سے گویا ہوئی۔ عطیہ بیگم نے جھک کر نواسی کا منہ چوم لیا۔
ڈاکٹر انکل بتا رہے تھے۔ ان کے برین کی گروتھ نہیں ہوئی اس لیے وہ خود کو چھوٹی بے بی سمجھتی ہیں۔
مہ وش نے بڑے سنجیدہ اور عالمانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔ چمن اس کی بات سن کر سمجھ گئی کہ ڈاکٹر علی عثمان نے بچیوں کی ٹھیک ٹھاک برین واشنگ کی تھی اس کے بعد ہی دونوں بچیاں ٹینا سے گھلی ملی تھیں۔
''ہاں بیٹا...... اللہ کی مرضی...... سب کو اللہ تعالیٰ ہی بناتے ہیں۔'' نانو میں نے ان کو آپی کہا ناں تو انہوں نے بہت مائنڈ کیا تھا۔ کہنے لگیں آپی تو بڑی لڑکی کو بولتے ہیں میں تو تمہاری فرینڈ ہوں۔ فرینڈ کو آپی تھوڑا ہی بولتے ہیں۔
مہ وش کو اچانک خاص بات یاد آئی تو وہ بھی فوراً گوش گزار کی۔
''ہاں ہاں بیٹا...... آپ انہیں ٹینا ہی بولو...... کیونکہ اب وہ آپ کی فرینڈ ہیں۔ عطیہ بیگم بھی بچیوں میں خوشگوار تبدیلی دیکھ کر بہت اچھا محسوس کر رہی تھیں۔ مہ وش کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تھا۔
ان کے بچے کتنے ہیں۔ شاید بہت چھوٹے ہوں گے۔ اتنی عمر بھی نہیں لگتی۔ عطیہ بیگم نے چشم تصور سے ڈاکٹر علی عثمان کا سراپا دیکھتے ہوئے ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔ اب لہجے میں ایک عقیدت سی جھلک رہی تھی۔ بچے نہیں ہیں امی۔ چمن نے اب ذرا احتیاط اور سنجیدہ انداز میں جواب دیا۔
''شادی نہیں کی ابھی تک...... ظاہر ہے ذمہ داریوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔'' عطیہ بیگم نے سوال بھی کیا اور

انداز جواب بھی خود ہی دے دیا۔

''شادی ہوئی تھی۔'' چمن نے دونوں بچیوں کی طرف دیکھتے ہوئے نپے تلے انداز میں جواب دینے کی کوشش کی۔

عطیہ بیگم نے چونک کر چمن کی طرف دیکھا۔ چمن نے نظروں ہی نظروں میں اشارے سے کہہ دیا کہ بچیوں کے سامنے یہ بات نہ کریں۔'' عطیہ بیگم نے ایک گہری سانس لی۔

اشارے بعض اوقات الفاظ سے زیادہ فصیح و بلیغ ہوتے ہیں۔

''چلو بیٹا...... جلدی سے Change کر کے بس اب سونے کی تیاری کرو۔

(Early To Bed Early To Rise Healthy Wealthy And Wise)

ہری اپ...... شاباش...... چمن نے جلدی سے عجیب طرح کا شور ڈال دیا تاکہ بچیاں زیادہ چوں و چرا نہ کر سکیں۔

مشکور احمد عشاء کی نماز پڑھ کر ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ عطیہ بیگم ان کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

چمن دونوں بچیوں کو دائیں بائیں پکڑے بیڈروم کی طرف جا رہی تھی۔ کافی دنوں بعد آج چمن بات بات پر سوچتی محسوس نہیں ہوئی۔ ایک تبدیلی تھی جس کا ادراک عموماً ماں ہی کو ہو سکتا ہے۔

غمِ جاناں سے گزر کر غمِ دوراں کی شاہراہ تک پہنچتے پہنچتے عمر صدیوں کا سفر طے کر لیتی ہے۔ اور یہ سفر دل کو کائنات کی وسعتوں تک اڑان کی رسائی دیتا ہے۔

غمِ جاناں بوجھ ہے...... غمِ دوراں اس بوجھ سے نجات کی راہ......

☆......☆......☆

ندا کے تو فرشتوں کو بھی یاد نہیں رہا ہوگا کہ ثمر کے سیل پر کوئی کال آئی تھی۔ مگر ثمر کے دل کا چور اسے اُلجھاتے ہوئے تھا۔ جاگنے کے باوجود اس نے سیل فون پھر آف کر دیا تھا۔ اور خود ڈنر کے لیے نیچے چلا آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا ندا فون بھی کرے تو سیل آف پا کر یہی سمجھے کہ وہ سو رہا ہے۔ اس خیال سے ہی وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

بہترین ڈنر کرنے کے بعد وہ مووی دیکھنے نکل گیا۔ آج تو اسے یوں لگ رہا تھا کہ مدتوں بعد پاؤں بیڑیوں سے آزاد ہوئے ہیں اور وہ چلنے کے بجائے اُڑ رہا ہے۔

نئی شادی ڈور سے اَنا کی پتنگ باندھ کر بسیط فضاؤں میں اڑا رہا تھا۔ نفس و روح کی تسکین ہوتے ہی ذہن بہت پُرسکون ہو گیا تھا۔

اس مستی میں یہ بھی دھیان نہ ہوا کہ ماں اس کو گھر میں دیکھنے کے لیے پل پل گن رہی ہے۔

ایک خواہش ہمک ہمک کر دل بہلا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا ٹھیک نو ماہ بعد وہ ایک بچے کا باپ بھی بن جائے گا۔

اور پھر اس کے بعد شکست خوردہ لوگوں کو سوچ سوچ کر بہت ہنسے گا۔

☆......☆......☆

افشاں ایک گھنٹے کے لیے آ گئی تھی۔ اسے معلوم تھا ماں کا خراب موڈ سنبھالنے میں بہت وقت لگ جاتا ہے۔ اسے اندیشہ ہوا کہ اس کا کام فضول میں بڑھ جائے گا۔ اس لیے کئی بُرے گھنٹوں سے بچنے کے لیے ایک

گھٹنے کی قربانی دانش مندی ہے۔

یوں بھی چمن کے جانے کے بعد اسے ماں کے گھر میں بیٹھ کر بہت بوریت ہی ہوتی تھی۔

جان جلانے والے فقرے، طنز، لفظوں کی آتش بازی، جس سے کلیجے میں عجیب سی ٹھنڈک پڑتی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ بھائی وجیہہ کے نام پر ٹکتا ہی نہیں تھا۔

شدید ترین خواہش جب ناکامی کا منہ دیکھتی ہے تو حواسوں پر برف سی گر جاتی ہے۔

جانے والوں پر تبصرے کرنے میں مزہ نہیں تھا۔ سخت بوریت سے گزر کر وہ کھانا کھائے بغیر ہی چلی گئی تھی۔ بچوں کا بہانہ کر کے کہ بھوکے ہوں گے انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔

اس بات پر تو کوئی ماں، کسی ماں کو روک ہی نہیں سکتی۔

افشاں کے جانے کے بعد انہوں نے ثمر کو فون ملایا تاکہ پتہ چلے وہ کب تک واپس آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مگر سیل پاورڈ آف ہونے کی ریکارڈنگ سن کر طبیعت اور زیادہ بوجھل ہو گئی۔

عشاء کی نماز اپنے کمرے ہی میں پڑھی۔ پھر اپنا دواؤں کا ڈبہ لے کر بیٹھ گئیں۔

یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ ناک پر نظر کی عینک ٹکا کر اپنی رات کی دوا نکالتی تھیں۔ ساری گولیاں ایک ہاتھ میں جمع کر لیتیں۔ پھر ڈبہ بند کر کے ایک ایک گولی پانی سے نگلتیں۔

ذہن بہت اُلجھا ہوا تھا۔ غیر حاضر دماغی کی وجہ سے نیند کی دو گولیاں کھا کر بیٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد یوں محسوس ہوا دل کسی اتھاہ میں اُتر رہا ہے۔ بڑی نئی اور عجیب سی کیفیت تھی۔ دماغ سنسانے لگا۔ بمشکل گلاس میں پانی انڈیل کر پیا۔ آنکھوں کے سامنے دُھند بڑھنے لگی تو گھبراہٹ نے حالت مزید غیر کر دی۔ سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ افشاں کو مطلع کر دیں کہ ان کی طبیعت بگڑ رہی ہے اور گھر میں کوئی نہیں ہے۔ جز وقتی ملازمہ رات کو کچن صاف کر کے چلی جاتی تھی۔ اس سے پہلے چمن سب کچھ سنبھال ہی رہی تھی۔

افشاں بچوں کو سلانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ کمرے سے سیل کی رنگ سنائی دی تو بیٹے سے فون منگا لیا کہ اتنی رات کو کس کو اس کا خیال آیا ہے۔

بانو آپا نے بمشکل صرف ایک جملہ کہا تھا۔

''افشاں...... میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔ لگتا ہے وقت آ گیا ہے۔'' اس کے ساتھ سیل ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا تھا۔ افشاں نے گھبرا کر کوئی دس مرتبہ ہیلو ہیلو کہا۔ کیونکہ رابطہ بحال تھا مگر بانو آپا کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔

افشاں آخر بیٹی تھی قدرتی طور پر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ساری مصروفیات معمولات چولہے میں جھونک کر اپنے بیڈ روم کی طرف بھاگی تاکہ اپنے شوہر کو ایمرجنسی سچویشن بتا کر، اس کے ساتھ ماں کے گھر کی طرف دوڑ لگائے۔

شوہر نامدار بھی خواب گاہ میں مدھم روشنیوں سے ماحول رومانوی سا بنائے بیوی کی آہٹوں کے منتظر تھے۔ آہٹوں کے بجائے قدموں کی دھپ دھپ سے ماحول جاگ اٹھا۔

'' جلدی کریں...... امی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ ثمر بھائی بھی اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ وہ بالکل اکیلی ہیں۔'' افشاں نے بدحواسی کے عالم میں کہا اور وارڈ روب سے اپنا ہینڈ بیگ نکالنے لگی۔

''امی کا فون آیا ہے؟'' اس کے شوہر عمران نے قدرے فکر مند ہو کر پوچھا تھا۔ ساتھ ہی بیڈ سے اُتر گئے۔
''اوہ فوہ...... جلدی کریں...... سارے سوال گاڑی میں کر لیجیے گا۔ آپ ریڈی ہوں میں اماں کو بتا کر آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ عجلت میں نکل کر چلی گئی۔

☆......☆......☆

رات جشنِ نجات منا کر خوب لمبی تان کر سویا۔ صبح نو بجے آنکھ کھلی تو آف وہائٹ پردوں کی چمک سے دن چڑھنے کا اندازہ ہوا۔
چند لمحات تو نیند کا غلبہ مٹانے میں گزر گئے۔ پھر پُر سکون انداز میں خوب دل لگا کر دو تین انگڑائیاں لیں۔ بیڈ سے اتر کر تھوڑی سی ورزش کی۔ تاکہ خود کو بالکل چاق و چوبند محسوس کرے۔
پھر کھڑکی سے پردے ہٹا کر باہر کا نظارہ کیا۔ دوطرفہ شاہراہ پر ٹریفک چیونٹیوں کی طرح رینگ رہا تھا۔ جس سے اندازہ ہوا کہ خلقِ خدا اللہ کا فضل تلاش کرنے نکل کھڑی ہوئی ہے۔ اب اسے اپنے سیل کا خیال ہوا۔
''اُف...... بہت دیر سویا...... ندا نے ضرور ٹرائی کیا ہوگا۔''
''تھینک یو نانا جان...... اللہ تعالیٰ آپ کو جنت میں حکیموں کی کمپنی سے بچائے۔ آپ کی وجہ سے بہت دنوں بعد اچھی سی نیند ہوئی ہے۔'' اس کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ کھیلنے لگی۔
ماحول میں سیل فون آن ہونے کی مخصوص رنگ ٹون گونج رہی تھی۔ اس کے فوراً بعد دھڑا دھڑ لفافے گرنا شروع ہو گئے۔ عادتاً ایک نظر اس نے In Box چیک کیا۔ ندا کے ایک میسج کے بعد افشاں کے لگاتار پانچ میسج تھے۔ ثمر کا ماتھا ٹھنکا۔
اول تو افشاں اسے کبھی میسج کرتی ہی نہیں تھی۔ ہمیشہ کال کرتی تھی کیونکہ ایسی ضرورت ہی پڑتی تھی کہ وہ اسے جلدی جلدی کالز کرے نوے فیصد معاملات تو بانو آپا کے توسط سے ہی طے پا جاتے تھے۔ تین میسج 'پلیز کال' کے تھے۔ چوتھے اور پانچویں میسج میں بانو آپا کے ہاسپٹل ایڈمٹ ہونے کی اطلاع تھی۔ ثمر کی تو ساری ترنگ پھر سے اُڑ گئی۔
''مائی گاڈ...... امی جان رات سے ایڈمٹ ہیں......'' ایک احساسِ جرم روح میں پھڑ پھڑایا۔
''یہ کیا ہو گیا یار...... یعنی کہ حد ہو گئی۔'' وہ مارے فکرمندی کے خود کو کوسنے لگا۔ کم از کم اسے رات کو ایک کال تو کر لینا چاہیے تھی۔ شدید احساسِ ندامت میں بڑی قوت تھی۔ اب وہ سب ضروری کام منٹوں میں کر جانے پر تل گیا تھا۔ عجیب پکڑ دھکڑ سی ہو رہی تھی۔ دل قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ فوراً افشاں کو ڈائل کیا تھا۔
افشاں نے کال ریسیو کرنے میں ذرا دیر نہیں لگائی گویا کہ وہ سیل ہاتھ میں پکڑے ثمر کی کال ہی کا انتظار کر رہی تھی۔
اس نے بڑی روح فرسا خبر سنائی کہ بانو آپا رات سے کئی مرتبہ بے ہوش ہو چکی ہیں۔
''میں بس تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں۔'' اس نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا تھا۔
''اسلام آباد سے تھوڑی دیر بعد میں کیسے پہنچ سکتے ہیں بھائی جان؟'' افشاں کی آواز میں استعجاب تھا۔
''واپس آ گیا ہوں راستے میں ہوں۔ اسے بروقت جواب سوجھ گیا۔
''اوہ...... اللہ کا شکر ہے کہ آپ واپس آ گئے۔'' افشاں نے شکرانہ کہہ کر ہاسپٹل روم نمبر وغیرہ بتانا شروع

کردیا۔

''ٹھیک ہے پہنچتا ہوں تم پریشان مت ہونا۔'' اس نے افشاں کو تسلی دی اور فوراً رابطہ منقطع کردیا۔

اب اسے ندا کو فون کرکے یہ نئی خبر سنانا تھی۔ تاکہ وہ بار بار اسے فون نہ کرے۔ اس بات سے تو بے فکری تھی کہ اس کا ٹھکانہ کیا ہے۔ اس کا اپنا گھر موجود تھا۔ مرحوم شبیر حسین تو سکندر کی طرح خالی ہاتھ ہی گئے تھے۔ پانچ سو گز زمین کا ٹکڑا جس کے تین طرف لان اور عقب میں دو سرونٹ کوارٹر تھے جو زمانوں سے جن بھوتوں کی قیام گاہیں دکھائی پڑے تھے۔

شبیر حسین کو حکیم صاحب بتاتے رہتے تھے کہ پراپرٹی کے کیا دام چل رہے۔ چند ماہ پہلے بتایا تھا بنگلہ پرانا ہے۔ مگر اب بھی آپ کو اس کے چالیس پچاس لاکھ مل جائیں گے۔ حالانکہ اس وقت بھی اس کی قیمت چار کروڑ سے زیادہ تھی وہ بھی پلاٹ کی قیمت، جو بھی لیتا پہلے اسے پلاٹ کرتا پھر تعمیر نو۔

حکیم صاحب کا خیال تھا شاید شبیر حسین اتنے بڑے گھر سے بیزار ہوں۔ چالیس پچاس لاکھ میں انہیں ہی مرحمت فرمادیں اور شبیر حسین مرحوم چالیس پچاس لاکھ سن کر یوں مطمئن ہوگئے گویا بستر پر نہ لیٹے ہوں۔ چالیس پچاس لاکھ بچھا کر لیٹے ہوں۔

ثمر کو اس جگہ کی Valuc کا بالکل ٹھیک اندازہ تھا۔ شبیر حسین مرحوم کے ہوتے تو اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا۔

مگر اب جبکہ صورتِ حال بڑی تیزی سے تبدیل ہورہی تھی اور اسے ندا کا کوئی مستقل بندوبست کرنا تھا تو یہی خیال آیا کہ اسی بنگلے پر تھوڑا خرچہ کردیا جائے۔ ندا کو Comfertable فیل ہوگا کہ اسی جگہ ہے جہاں ہوش سنبھالا..... آس پاس سب جانے پہچانے لوگ..... خاص طور پر ''نرگس آنٹی''۔

ندا بھی تھک کر سیل آف کرکے سو رہی تھی۔ اس نے جلدی سے ایک شارٹ میسج ٹائپ کیا اور ہوٹل چھوڑنے کی تیاری کرنے لگا۔

مختصر سا ہنی مون..... مئی جون ہوگیا..... وہ بھی 'طویل لوڈشیڈنگ' کی خبروں کے ساتھ.....!

☆.....☆.....☆

''ہیلو..... ہیلو..... ہیلو.....'' کل سارا دن مصروف گزرا۔ یہ آواز وہ حافظے سے جھٹکنے کی کوشش کرتی رہی۔ معمول کے کام، برتھ ڈے..... سب کچھ نمٹا دیا۔ مگر یہ آواز اس کے تعاقب میں دوڑ رہی تھی۔

بہت سارے جملے مرتب کیے۔ عموماً جو خود کو دھوکہ دینے کے لیے ترتیب دیے جاتے ہیں۔

شاید ثمر نے اپنا سیل نمبر ہی چینج کرلیا ہے۔ بانو آپا نے ہزار کہا کہ وہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی ایک ہفتے کے اندر اندر کرکے دکھا سکتی ہیں۔ ان کے شادی شدہ بیٹے کو لڑکیوں کی کمی نہیں۔

مگر حقیقت میں دوسری شادی اتنی سرعت سے ہونے کا یقین کرنا بھی کچھ آسان نہ تھا۔

اور پھر..... لینڈ لائن نمبر بھی بانو آپا نے ریسیو کیا جبکہ ثمر کو ریسور اٹھانے کے لیے اٹھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ صرف ہاتھ بڑھانا تھا۔

رات ڈھائی بجے ثمر کا فون ایک لڑکی کس سچوئیشن میں اٹینڈ کرسکتی ہے وہ تجزیہ کرنے لگی۔

سابقہ رفاقتیں، روایتوں کی طرح قطرہ خون میں جذب ہوتی ہیں سب سے زیادہ خود فریبی کے مرحلے اسی طرح کے صورتِ حال میں طے کیے جاتے ہیں۔

سب سے زیادہ لذتیں، شدتیں زخم زخم شناسائیوں میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔
پھر ایک خیال جو ہر شک وشبے کے سامنے مزاحمت کر رہا تھا کہ ثمر نے ابھی تک اسے طلاق کے پیپر نہیں بھجوائے تھے۔ دوسری شادی کرنے کے لیے اس طریقہ کار سے گزرنا ازبس ضروری تھا۔
پھر...... پھر یہی بات سمجھ آتی تھی کہ ثمر اپنا نمبر چینج کر چکا ہے۔ گھوم پھر کر اسی نکتے پر ذہن آ کر ٹھہر گیا تھا۔
ایک سوچ پر رک کر بھی جانے کیوں ایک عجیب سی بے کلی اپنی جگہ باقی تھی جس کی وجہ سمجھ نہیں آتی تھی۔

☆......☆......☆

افشاں اسے کاریڈور ہی میں مل گئی تھی۔ بہت پریشان اور حواس باختہ نظر آ رہی تھی۔ ثمر پر نظر پڑتے ہی اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔
پتہ نہیں ایک دم سے کیا ہو گیا امی جان کو...... ایک گھنٹہ ان سے باتیں کر کے گئی تھی بالکل ٹھیک ٹھاک باتیں کر رہی تھیں۔
''اچھا اچھا...... گھبرانے کی ضرورت نہیں تمہیں پتہ ہے Dibetic پیشنٹ کے ساتھ کبھی کبھی اس طرح کی سچویشن Create ہو جاتی ہے۔'' ثمر نے افشاں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی۔
''لیکن وہ ہوش میں آنے کے بعد پھر بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ ایسا کیا ہو گیا'' افشاں نے آنسو پونچھتے ہوئے پھر اسی طرح پریشانی کی کیفیت میں کہا تھا۔ بھائی کو دیکھ کر اب قدرے طبیعت میں ٹھہراؤ سا تھا۔
''بلڈ ٹیسٹ وغیرہ تو ہو گیا ہوگا؟ رپورٹس دیکھیں تم نے؟ ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟''
''مجھے کچھ نہیں پتہ...... ڈاکٹر تو تسلی ہی دیتے ہیں۔'' افشاں نے اسی طرح نڈھال اور جذباتی انداز میں جواب دیا۔
''میں دیکھتا ہوں...... تم گھر جا کر ریسٹ کرنا چاہو تو چلی جاؤ۔ میں اِدھر ہی ہوں۔'' ثمر نے یہ سوچ کر کہ پتہ نہیں وہ کب سے اسی طرح پریشان پھر رہی ہے۔ بے آرام ہے۔ اپنی طرف سے سہولت دینے کی کوشش کی دل تو یہاں پڑا ہے۔ گھر جا کر کون سا نیند آ جائے گی۔
''ٹھیک ہے...... میں ڈاکٹر سے بات کر کے آتا ہوں۔ تم آرام سے بیٹھو...... پانی وانی پیو...... دعا کرو...... انشاء اللہ امی جان ٹھیک ہو جائیں گی۔''
ثمر اس وقت سب کچھ بھلا کر صرف پریشان و فکر مند تھا۔ تسلی دے کر ڈاکٹرز کے رومز کی طرف بڑھ گیا تھا۔ افشاں ویٹنگ لاؤنج کی طرف چل پڑی۔

☆......☆......☆

ندا نے آنکھ کھلتے ہی اپنا سیل فون چیک کیا تھا کہ پہلا خیال ہی ثمر کی طرف گیا تھا۔ سیل آن ہوا تو میسج الرٹ کی ٹون ماحول میں گونجی۔
ندا نے میسج کھولا پہلا میسج ہی ثمر کا تھا۔ اس نے فورِ شوق میں پوری آنکھیں کھول کر میسج پڑھنا شروع کیا۔
''I Am Going To Hospital,My Mother Is Hospitalised' میسج پڑھتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔
ثمر کے تصور کے ساتھ P.C کا بہشت آفرین سویٹ دھیان میں آیا تھا۔ یعنہ کہ ابھی اسے یہیں رُکنا ہے؟

اللہ رحم کرے...... کیا ہو گیا ان کی امی جان کو......
وہ بیڈ سے اترتے ہوئے خاصی متفکر نظر آ رہی تھی۔
بڑا سا خالی ڈھنڈار گھر...... دو کمروں میں بچھی ہوئی دریاں اور سفید چاندنیاں، جو بری طرح پاؤں تلے روندی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ بکھرے ہوئے بریانی کے چاول......
ہم بتائیں بعد مرنے کے کیا ہوگا؟
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا
اس شعر کی بالکل تصویر کشی ہو رہی تھی۔
اتنا پھیلا بکھرا بے ترتیب گھر، مکھیاں، جھوٹی پلیٹیں، ڈشیں، چمچے، گلاس، اسٹیل کے دس بارہ جگ، جانے کیا کیا......
یہ اتنا سب کب ہوا، کیسے ہوا اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ سب کچھ محلے والوں نے خود ہی کر لیا تھا۔
ایک بڑی سی دیگ مین گیٹ کے پاس لڑھک رہی تھی۔ ندا کے دماغ میں تو گویا مکڑی کے جالے چپک گئے۔
یوں لگا جیسے چند لمحوں کے لیے کوئی بہت حسین سپنا دیکھا تھا اور پھر آنکھ کھل گئی۔
ابھی وہ منتشر ذہن کے ساتھ ساری صورتِ حال پر غور کر رہی تھی کہ اس کے سیل پر رنگ ہونے لگی۔
''اللہ رحم کرے......'' اس کا دھیان فوراً ثمر اور اُس کی ماں کی طرف ہی گیا لیکن سیل اٹھایا تو پتہ چلا نرگس آنٹی کی کال آ رہی ہے۔
''السلام علیکم آنٹی......'' اس نے فوراً کال ریسیو کی۔
''وعلیکم السلام ندا...... اُٹھ گئی ہو ناں؟ ناشتہ بھجواؤں...... تمہارا میاں گھر پر ہے؟'' نرگس بڑی عجلت کے انداز میں بات کر رہی تھیں۔
''رہنے دیں آنٹی...... جو کچھ گھر میں ہے وہی کھا لوں گی۔''
''یہ'' بھی نہیں ہیں۔ اس لیے کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ تھینک یو ویری مچ۔ سناٹے اور اجاڑ پن سے نڈھال ندا نے بڑے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا تھا۔
''ہیں...... تمہارا میاں کہاں ہے۔ اسے تو اس وقت تمہارے پاس ہونا چاہیے تھا۔ میت کے گھر میں بہت کام ہوتے ہیں۔ نرگس کی ٹون ہی بدل گئی۔ ثمر پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نازک صورتِ حال میں وہ ندا کو کیسے اکیلی چھوڑ کر چلا گیا۔
''آنٹی...... وہ ہاسپٹل میں ہیں۔ ان کی امی جان ایڈمٹ ہو گئی ہیں کنڈیشن تو مجھے پتہ نہیں ابھی سیل آن کیا ہے۔ فون کر کے پتہ کرتی ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کو خود ہی کونٹیکٹ کروں گی۔'' ندا نے اسی طرح تھکے ٹوٹے لہجے میں بات کی۔
''اوہ...... سوری...... اب مجھے گھر بیٹھے کیا پتہ کہ رات بھر میں کیا ہو گیا۔ ثمر سے بات ہو تو میری طرف سے بھی پوچھ لینا۔ میں دعا کروں گی۔'' نرگس کا انداز فوراً تبدیل ہو گیا تھا۔
''جی آنٹی...... تھینک یو......'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ اپنی طرف سے منقطع کر دیا کہ ثمر سے بات کرنے کی جلدی تھی۔
ڈائل کرتے کرتے شبیر حسین مرحوم کے کمرے میں چلی آئی کمرے میں ان کے وجود کی خاص مہک پھیلی

ہوئی تھی۔

جیسے ذرا کی ذرا کسی کام سے باہر نکلے ہوں اور بس آنے ہی والے ہوں۔ ان کے سلیپر ایک دوسرے سے روٹھے نظر آئے۔ ندا کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

اس گھر میں یہ اس کا پہلا دن تھا جب آنکھ کھلتے ہی اس نے نانا جان کی آواز نہیں سنی تھی۔

''بیٹا...... سورج سوا نیزے پر آ گیا۔ کب تک پڑی سوتی رہو گی۔ ارے ہندو بھی سویرے اُٹھ کر لٹیا لے کر اشنان کو جاتا ہے ہم تو مسلمان ہیں۔ ہمارا اللہ تصور یا خیال نہیں 'حقیقت کبریٰ' ہے۔ اٹھو...... شکر و کرو اس کی نعمتوں کا......''

نانا جان کی آواز کہیں آس پاس ہی گونجنے لگی۔ ساتھ ہی ثمر کی دھیمی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''ہیلو ندا...... کیسی ہو......؟''

''آپ بتائیں امی جان کی طبیعت کیسی ہے؟ میرا تو دل چاہ رہا ہے اُڑ کر آپ کے پاس آ جاؤں۔'' اس نے بے تابی سے کہا۔

''Oh No...... ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ ابھی کسی کو کچھ نہیں پتہ۔ امی جان ہوش میں نہیں ہیں مگر میری چھوٹی بہن افشاں یہیں ہاسپٹل میں ہے۔''

''جب تک امی جان کی طبیعت نہیں سنبھلتی تمہیں ان سے ملوانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ثمر نے گھبرا کر بند باندھے۔

''تو کیا میں ایسے ہی رہوں گی۔'' ندا کے دل کو عجیب سا دکھ ہوا۔

''پلیز...... سچویشن تو سمجھو...... تم سے شادی کی ہے میں نے...... میرے دوست اس شادی کے گواہ ہیں۔ تھوڑا ٹائم تو لگے گا۔ مگر سب کچھ ایک دن کھولنا تو ہے۔'' ثمر اب اسے بچوں کی طرح بہلا رہا تھا۔

''اچھا چلیں ٹھیک ہے۔ آپ مجھے فون کر کے امی جان کی طبیعت کے بارے میں ضرور بتایئے گا۔'' ندا اب ہارے ہوئے انداز میں گویا ہوئی۔

''Oh Sure...... تمہیں نہیں بتاؤں گا تو اور کس کو بتاؤں گا۔''

''تم آرام سے ناشتہ واشتہ کرو۔ گھر دیکھو...... انشاء اللہ امی جان کے ٹھیک ہونے کے بعد اس گھر کا بھی کچھ کرتے ہیں۔ اس کو سیل آؤٹ کر کے کوئی چھوٹا بنگلہ دلوا دیتے ہیں۔ ثمر اب اسے بھرپور طریقے سے تسلی دے رہا تھا۔

''لیکن یہ گھر میرا تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو ماموں جان کا ہے۔ نانا جان کہتے تھے اس میں تمہاری ماں کا بھی حصہ ہے۔'' ندا بڑی سادگی سے بتا رہی تھی۔

''اوہ...... یہ کہانی ہے...... ٹھیک ہے۔ پھر اس کو چھوڑتے ہیں۔ تم نے اپنے ماموں جان کو Death کی اطلاع دی؟'' ثمر کی طرف سے بہت اہم سوال ہوا۔

''Oh My god......'' ندا نے اپنا سر ہی پیٹ لیا۔

''سوری مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔''

''فٹافٹ ان کو انفارم کرو...... یہ تو بہت ضروری ہے۔'' ثمر نے یوں کہا گویا اسے پہلے ہی پتہ تھا کہ اسے یاد ہی نہیں ہوگا۔

''اور......سنیں......'' ندا نے کچھ کہنے کے لیے میدان ہموار کرنے کی کوشش کی جیسے کوئی ایسی بات ہے جسے کرتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی ہو۔

''ہاں......سناؤ......'' ثمر جلدی میں تھا۔

''ماموں جان کو تو بتادوں ناں کہ میری شادی ہوگئی ہے؟'' ندا نے گویا اجازت مانگی تھی۔

''اوہ بھئی سب کو بتادو......سوائے میری امی جان کے......ٹھیک ہے بعد میں بات کرتا ہوں۔نرس بلا رہی ہے۔اللہ حافظ۔'' اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہوگیا۔ندا نے گہری سانس کھینچ کر از سرنو ماحول پر طائرانہ نظر دوڑائی۔جیسے سرا ڈھونڈ رہی ہو کہ کہاں سے شروع کرے۔

☆......☆......☆

بانو آپا کو ہوش آ گیا تھا۔مگر وہ بات کرنے میں بہت دشواری محسوس کر رہی تھیں۔آنکھ کھولتے ہی پہلے تو غور کرتی رہیں کہ وہ کہاں ہیں پھر خوشی کے آنسو پونچھتی افشاں اور مسکراتے ہوئے ثمر پر نظر پڑی تو حواس مکمل جاگ پڑے۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے میری امی جان کو ہوش آ گیا'' افشاں نے بے اختیار جھک کر بانو آپا کے گال چومے۔

''کیا ہوا ہے مجھے......یہاں کیوں لے کر آ گئے ہو......'' بانو آپا کی آواز بہت مشکل سے نکل رہی تھی۔

''آپ کی طبیعت خراب ہوگئی تھی امی جان......ہاسپٹل کیوں آتے ہیں؟'' افشاں کے لہجے میں چہک سی تھی۔ماں پر فدا ہوئی جاتی تھی۔پورے اٹھارہ گھنٹے بعد آپ ہوش میں آئی ہیں۔آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ثمر نے بھی ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک پیار بھرا بوسہ دیا۔

''اٹھارہ گھنٹے......؟'' بانو آپا تو سن کر دہل گئیں۔چند لمحے ثمر کی طرف دیکھتی رہیں۔دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''قبر کا منہ دیکھ آئی......پتہ بھی نہیں چلا......''

''توبہ توبہ امی جان......ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیں۔'' افشاں نے گھبرا کر ٹوکا۔

''یہ زندگی ہے......ہوش آ گیا......نہ آتا تو......'' وہ گم صم نظر آنے لگیں جیسے ذہن کہیں بہت دور پہنچا ہوا ہو۔

''اللہ نہ کرے......اب ایسی باتیں نہ کریں نہ سوچیں......میں تو ابھی شکرانے کے نفل پڑھوں گی۔افشاں نے اظہارِ محبت کی انتہا دکھائی بانو آپا......غائب دماغی کی کیفیت میں ثمر کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔وہ بھی بہت محبت سے انہی کو دیکھ رہا تھا۔

''کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔'' بانو آپا کے ہونٹ ہلے۔

''کیا محسوس ہو رہا ہے امی جان۔'' افشاں نے تڑپ کر ماں کا ہاتھ سینے سے لگالیا۔

''دماغ سن ہو رہا ہے۔میں اپنا ہاتھ بھی خود سے نہیں اٹھا پا رہی۔'' بانو آپا کی آواز بولتے بولتے معدوم ہونے لگی۔

''چمن کو تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس لے آؤ......شاید اُس کی بددعا لگی ہے مجھے یہ کہتے ہی وہ پھر بے ہوش ہو چکی تھیں۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفاکی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

ایک کپ چائے

"باجی آج تو 24 تاریخ ہے پہلی تاریخ میں تو ابھی سات دن باقی ہیں پھر یہ پھل مرغی۔" فرحانہ نے شاپر پکڑتے ہوئے کہا۔ "اے ہے آتے ہی بچی کے سر ہو گئی دیکھ نہیں رہی کتنی تھک گئی ہے۔ جا بیٹا جا، جا کر آرام کر۔" اماں نے کتنے آرام سے......

روشنیوں کے شہر کراچی کے گنجان علاقے میں واقع پرانی طرز پر بنی فلاحی ادارے کی عمارت کے نیم تاریک کمروں میں سانسوں کی چھوٹتی ڈوری کو تھامے عمر رسیدہ عورتیں سکونت پزیر تھیں۔

ایسے ہی ایک کمرے میں چند عمر رسیدہ عورتوں کے درمیان اپنی اکلوتی بھورے رنگ کی چادر کو اپنے گرد لپیٹے دمے کے مرض سے دوہری ہوتی بی بی کو یک ٹک دیکھتے ہوئے وہ اپنے پلنگ سے اتر کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور اپنا کمزور ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر سہلانے لگی۔

یہ بی بی گزشتہ ایک ہفتے قبل اس ادارے میں آئی تھی۔ اس کمرے میں موجود تمام عمر رسیدہ عورتوں سے الگ ہی نظر آتی تھی۔ بول چال سے لے کر صورت تک اس کے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق کی چغلی کھاتا تھا۔

"شکریہ بہن! اب ٹھیک ہوں۔" سانس بحال ہوتے ہی اس نے میرا ہاتھ الگ کیا۔

"شکریہ کی کیا بات ہم سب ہجولیاں ہیں۔ جیسے بچپن میں ہوتی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ بچپن کی ہجولیاں تو بچھڑ جاتی ہیں۔ الگ الگ آشیانے کی جانب۔"

"پر اسی عمر میں آشیانے چھوٹ جاتے ہیں۔ ان اداروں کو آباد کرنے کے لیے اور ہم مل جاتے ہیں ایک دوسرے سے نہ بچھڑنے کے لیے۔"

"صحیح کہا۔ اس عمر میں آشیانے چھوٹ جاتے ہیں۔" آنسوؤں کی جھڑی شروع ہوگئی۔

"رومت اپنے بارے میں بتاؤ تاکہ کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے۔"

"میرا تعلق بہت دولت مند گھرانے سے رہا ہے اونچے محل میں عمر گزری اور اونچے ہی طور طریقے سے اپنی اولاد کو پروان چڑھایا۔ بہت باعزت زندگی گزاری مگر گزرتے وقت نے میری حیثیت اسی ادارے تک محدود کر دی۔ ملکی حالات کے پیش نظر میرے دونوں بیٹوں نے اپنا بینک بیلنس دوسرے ملکوں میں شفٹ کر دیا اور مجھے اس

ادارے میں شفٹ کر دیا۔ کیونکہ ان کا پاکستان واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا کیونکہ میری عمر اور بیماری دونوں ان کے لیے پریشانی کا باعث تھی اور پریشانی اٹھانا کسی کو بھی پسند نہیں ہوتی۔''

اپنے پلنگ تک آتے آتے میں اپنے ضمیر سے کافی مطمئن ہو گئی جو کہ اب تک کچوکے لگاتا رہا تھا۔ کیا فرق تھا مجھ میں اور اس امیر عورت میں دونوں کا انجام تو بہرحال ایک سا تھا۔ بلکہ اس ادارے میں موجود عمر رسیدہ عورتوں کو دیکھ کر یہی سمجھ آیا کہ ایک خاص دور سے گزرنے کے بعد خواہ وہ اچھا ہو یا برا انجام سب کا ایک سا ہی ہوتا ہے۔''

''اماں جی...... چائے پی لو...... اتنے غور سے ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔''

''نشیب و فراز......!''

''ہیں وہ کیا ہوتے ہیں جی؟'' ادارے کی جوان ملازمہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

''کیا آج 24 اکتوبر ہے؟''

''ہاں اماں جی اور سات دنوں بعد ہماری تنخواہ ملے گی۔ پر تمہیں کیا؟ تم نے کون سی تنخواہ اٹھانی ہے؟ تمہیں تو بس سکون تے منجی وچ بیٹھنا
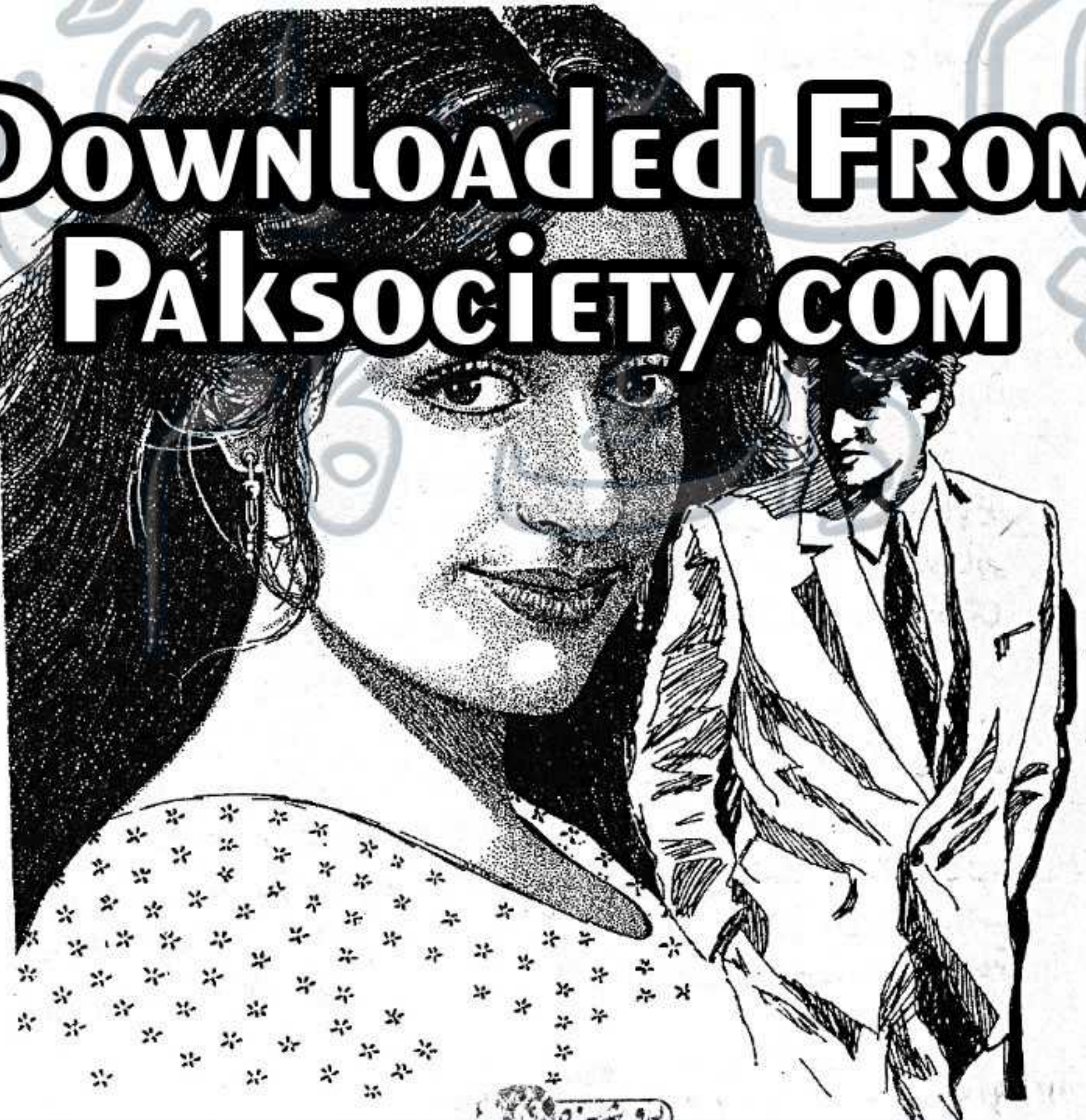
رہے دو وقت روٹی کھانا اور ایک پیالی چائے ہی تو پینا ہے۔''

''آج 24 اکتوبر ہے۔'' اس نے زیرِ لب دہرایا۔

''ہاں...... اماں جی کتنی باری بولوں۔ اے اماں کیا کوئی خاص ہے۔ تمہارے واسطے جو بار بار یاد کر رہی ہو۔ اچھا چلو اُٹھ کر باہر چلو۔ آج بڑی میڈم جی نے تمام لوگوں کو سیر کرانے کا بندوبست کیا ہے بڑے باغ تے۔''

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ آج میں تنہا رہنا چاہتی ہوں۔''

''سب لوگ جا رہے ہیں۔ چلی چلتی تو اچھا تھا۔ اکیلی پڑی کیا کرو گی۔ پر جیسی تمہاری مرجی، اچھا چائے تو پی لو۔ کب سے یونہی پڑی ہے۔ بڑی عجیب ہو اماں تم بھی...... 24 تاریخ کو یاد کر رہی ہو پر سامنے پڑی چائے یاد نہیں۔''

کمرے اور برآمدے سے آتی آوازوں کا شور یکلخت بند ہوگیا۔ پورے ماحول میں گہرے سناٹے کا راج تھا۔

ہونہہ کیسے بھول سکتی ہوں بیتے لمحوں کو، ماضی دانت نکوسے سارا منظر پیش کر رہا تھا۔ سب کچھ یاد ہے۔ 24 اکتوبر بھی اور چائے کی پیالی بھی، بس فرق اتنا پڑ گیا تھا۔ کئی برس پہلے 24 اکتوبر کی چائے کی پیالی کافی کڑک اور تیز دم تھی اور آج کی چائے باسی اور بے دم۔ چائے کا وجود اپنے اندر ایک ہسٹری رکھتا ہے اور مسٹری بھی...... خیر اس کا سفر جتنی بھی صدیاں طے کرتا آیا ہو اور کتنی صدیوں تک موجود اپنی افادیت اور اہمیت جتاتا رہے گا یہ صرف اوپر والا جانتا ہے۔ پر میرے یعنی رضیہ سلطانہ کا ایک کپ چائے کا سفر چودہ سالوں پر محیط ہے پھر ماضی کا در کھلتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

رضیہ سلطانہ بنت غفور احمد۔

- عمر: سولہ سال
- تعلیم: میٹرک، لیاقت آباد گورنمنٹ اسکول
- تجربہ: صفر
- ایڈریس: لیاقت آباد 10 نمبر بھورے خان کی گلی نمبر 2
- کڑک چائے

☆......☆......☆

رضیہ سلطانہ

- عمر: 40 سال
- تجربہ: زندگی کے نشیب و فراز
- ایڈریس: اپسرا اپارٹمنٹ فورتھ فلور، بہادر یار جنگ روڈ
- ٹھنڈی چائے

☆......☆......☆

رضیہ سلطانہ

- عمر: 40 سال
- تجربہ: دائمی خسارہ
- ایڈریس: فلاحی ادارہ
- باسی چائے

تو یہ ہے سلطانہ بی بی تمہاری زندگی کا بائیو ڈیٹا۔ زہر خندسی مسکراہٹ لیے بستر پر دراز اور اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے سوچوں کے بھنور میں گھر گئی۔

☆......☆......☆

اے ہے خیر سے رجو تو پاس ہوگئی ہے۔ اب کچھ تو اس گھر کے دلدر دور ہوں گے۔ اب دیکھ وہ زینت کی بیٹی میٹرک کرتے ہی نوکری پر لگی تھی۔ کیا حالات تھے۔ مریم کی نوکری سے پہلے، اب دیکھ کتنا اچھا کھاتے پہنتے ہیں۔ ورنہ پہلے تو پہننا تو

دور کھانا بھی دو وقت مشکل سے کھاتے تھے۔ بھئی سریا کاٹنے والے کی آمدنی بھی کیا ہوتی ہے۔ اسلم بیچارہ بھی کیا کر سکتا ہے۔ پر میرا دل کہتا ہے تو مریم سے زیادہ تنخواہ اٹھائے گی۔

اب تو یہ مت سوچنے بیٹھ جانا کہ مجھے تجھ سے محبت نہیں، اور نوکری کی بات کر رہی ہوں۔ اگر محبت نہ ہوتی تو تجھے میٹرک تک تعلیم دلواتی۔ چودہ سال کی عمر میں تجھے بیاہ کر اس گھر سے چلتا کر دیتی۔ بیٹے تو میرے چھوٹے ہیں۔ اگر تیری جگہ ساجد ہوتا تو وہ یہ ذمہ داری اٹھالیتا۔ پر ساجد ابھی صرف آٹھویں میں ہے اور ماجد ابھی چھوٹا ہے۔ گڑیا بھی چھوٹی ہے۔ پر میں ان ماؤں کی طرح نہیں جو بیٹا اور بیٹی میں فرق کریں میرے لیے تو میری بیٹی ہی بیٹا ہے۔ رضیہ سلطانہ......!‘‘

’’جی اماں...... میں سمجھتی ہوں۔ بس ایک کام کرو۔ ذرا پڑوس میں جو وکیل صاحب رہتے ہیں نا ان کے گھر اخبار روز آتا ہے۔ ان سے اخبار مانگ لاؤ۔ نوکری کا اشتہار لگا ہوتا ہے۔ وہ دیکھنا ہے۔ جب تک نوکری مل نہ جائے روز شام اخبار لے آیا کرو ان سے۔‘‘

’’ٹھیک ہے بیٹا، میں ابھی لائی۔‘‘

☆......☆......☆

ضرورت برائے ٹیلی فون آپریٹر، اسمارٹ اور پُرکشش تجربہ ضروری نہیں۔

’’اماں دعا کرنا یہ نوکری مجھے ہی ملے۔‘‘

’’انشاء اللہ ضرور ملے گی۔‘‘

اپنے اکلوتے کاٹن کے گلابی جوڑے پر کلف لگا کر استری کیا۔ اہتمام سے تیار ہو کر صدر کے علاقے میں واقع پرائیویٹ دفتر کی سیڑھیاں چڑھتے قدم لرز گئے۔ کچھ لڑکیاں پہلے سے موجود تھیں اور کچھ کی آمد بعد میں ہوئی۔ مگر شاید اماں کی دعائیں زوروں پر تھیں۔ تبھی جاب ملنے کا قرعہ میرے نام نکلا تھا۔

اگلے دو روز بعد جاب پر جوائنگ دینی تھی۔ پرائیویٹ کنسٹرکشن کمپنی کے آفس میں ریسپشنسٹ کم آپریٹر کی کرسی پر بیٹھتے ہی پہلا فون کمپنی کے منیجر کا موصول ہوا۔

’’مس رضیہ جاب کا پہلا دن مبارک ہو۔‘‘

’’تھینکس سر......‘‘

’’آپ بالکل نروس فیل نہ کریں۔ کوئی بھی پرابلم ہو آپ بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔‘‘

اِس فون کے بعد خود میں نئی توانائی محسوس ہوئی اور خود اعتمادی کے ساتھ باقی کالز اٹینڈ کرنے لگی۔

بیس دنوں میں آفس اسٹاف کے ناموں سے لے کر ان کی انکم تک کی معلومات ہو گئی تھی۔

’’مس رضیہ اگر آپ فری ہیں تو ایک کپ چائے پینا پسند کریں گی۔ میں کینٹین تک جا رہا ہوں۔‘‘

آفس اسٹاف میں سب سے کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والے اکاؤنٹنٹ محمد رئیس کے مخاطب کرنے اور آفر پر حیرانگی ہوئی۔ قبل اس کے جواب دے پاتی کہ انٹرکام بج اٹھا۔

’’یس سر......جی سر......اوکے سر......‘‘

’’آپ نے جواب نہیں دیا مس سلطانہ......‘‘

’’سوری مسٹر رئیس میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ مجھے ابھی کام ہے۔‘‘

’’کوئی بات نہیں مس!‘‘ کہتے ہوئے رئیس اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

اب اسے کیا بتاتی کہ تمہاری چائے کی پیالی منیجر صاحب کی چائے پر سبقت لے جا چکی ہے صرف پانچ منٹ کے وقفے سے۔

☆......☆......☆

"سر چائے پینے کے لیے اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہوٹل کے نیم تاریک ماحول کا جائزہ لیتے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ جہاں ہر ٹیبل کے ساتھ مختصر سی لکڑی کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ اور ہر جوڑا ایک دوسرے سے سرگوشیوں اور اٹھکھیلیوں میں مصروف تھا۔

"یہاں کی چائے بہت عمدہ ہوتی ہے آؤ۔"

اور جھجکتے ہوئے ایک مختصر سی دیوار والی ٹیبل کے آگے بڑھ گئی۔ جبکہ منیجر صاحب نے میرے پہلو والی جگہ سنبھال لی۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی اخلاقاً تعریف کرنا ضروری سمجھا۔

"واقعی سر بہت عمدہ چائے ہے۔"

"ہاں مجھے تیز دم کڑک چائے بہت پسند ہے۔ بھاپ اڑاتی دل و دماغ میں زندگی بھرتی۔ جانتی ہو رضیہ تم بھی اس چائے کی مانند ہو۔ تیز دم۔ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

پھر تھوڑی دیر میں ہوٹل میں موجود جوڑوں میں اور ہم میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔

☆......☆......☆

"باجی آج تو 24 تاریخ ہے پہلی تاریخ میں تو ابھی سات دن باقی ہیں پھر یہ پھل مرغی۔" فرحانہ نے شاپر پکڑتے ہوئے کہا۔

"اے ہے آتے ہی بچی کے سر ہوگئی دیکھ نہیں رہی کتنی تھک گئی ہے۔ جا بیٹا جا، جا کر آرام کر۔"

اماں نے کتنے آرام سے سوال جواب کے چکر سے بچا لیا۔ اور میں پورا راستہ یہ سوچتے ہلکان ہو رہی تھی کہ گھر پر جواب کیا دوں گی۔ چاہتی تو سات دن صبر کر لیتی اور تنخواہ کے ساتھ "انعام" کا نام لے لیتی۔

مگر ایک سال قبل عید کے موقع پر گھر میں پکی مرغی کا ذائقہ بھی گھر والے بھول گئے تھے۔ جبکہ یہ تک یاد نہیں رہا تھا کہ اس موسم میں کون سے پھل مارکیٹ میں آتے ہیں۔ بس یہی سوچ کر سات دن کے صبر کی نفی کر گئی۔

شام کو ابا کی آمد اور دستر خوان پر سجا مرغی کا سالن، اور فروٹ چاٹ کا تھال الجھن میں ڈال رہا تھا کہ ابا کی پھٹکار اور غصہ میری پہلی چائے کا کپ آخری کپ ثابت ہوگا۔

مگر دستر خوان پر سب خوش گپیوں میں مصروف مرغی کے سالن کے ذائقے اور پھلوں کی افادیت بیان کی جا رہی تھی جبکہ اس سے قبل ہمیشہ دستر خوان پر بیٹھتے ہی اماں بڑبڑاتی نظر آتی جبکہ ساجد، فرحانہ اور ماجد کے مسور کی دال دیکھ کر منہ بنانے پر یہ بڑبڑاہٹ اور بڑھ جاتی اور ابا ایک دھاڑ کے ساتھ جوابی حملہ کرتے اور سب خاموشی سے ایک دو نوالے زہر مار کر کے اٹھ جاتے۔

آج گھر کے خوش گوار ماحول کو دیکھ کر ایک کپ چائے کا ندامت بھرا احساس زائل ہوگیا۔ خود کو سچ مچ کی رضیہ سلطانہ سمجھ بیٹھی اور اپنے کنبے کی ہر ضروریات کو فتح کرنے کی لگن دل میں سمائی۔

☆......☆......☆

بڑی کنسٹریکشن کمپنی ہونے کی وجہ سے شہر کے بڑے بڑے سرمایہ دار اور اعلیٰ عہدے دار کا آفس میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ پھر کمپنی کے مالک کا حکومتی اثر و رسوخ بھی تھا۔ اسی وجہ سے چائے کی پیالی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ ساتھ ہی گھر کے حالات بہتر ہوتے گئے یہ الگ بات ہے کہ ایک کپ چائے کے لیے جگہیں بدلتی رہیں۔ کبھی ریسٹ ہاؤس کبھی ہوٹل تو کبھی خالی فلیٹ اور اس کے عوض ماجد، ساجد کی پڑھائی کے اخراجات اور

تعلیم مکمل کرنے کے بعد انکم ٹیکس اور فلائٹ اسٹورڈ جیسی نوکری فرحانہ کی شادی کا جہیز اور گھر کی آسودگی شامل تھی۔

فرحانہ کی شادی ہوتے ہی ساجد کی لیکچرار بیوی نے گھر میں قدم رکھا اور جلد ہی ماجد نے بھی ایک ماڈرن مالدار لڑکی کا شوہر بن کر اسی کے ساتھ گھر کو خیر باد کہہ دیا۔ سب اپنا اپنا آشیانہ بنا چکے تھے۔ رضیہ سلطانہ کے وجود سے بے خبر ہو کر۔

☆......☆......☆

الفاظ تھے کہ نشتر......

''تم سے کیسے شادی کر سکتا ہوں۔ سلطانہ ڈیئر میں تو پہلے سے ہی شادی شدہ بندہ ہوں۔''

''مگر عرفان شادی شدہ تو تم اس وقت بھی تھے جب ہم پہلی بار چائے پینے ریسٹ ہاؤس گئے تھے۔'' شکستہ لہجہ لیے یاد دلانے کی ناکام کوشش کی اور پھر وہ سب ہو۔'' جملہ نامکمل رہ گیا۔

''ہاں تو اس چائے کی ٹپ بھی ادا کر دی تھی۔ تمہارے بھائی کی انکم ٹیکس میں نوکری لگوا کر۔''

اب مزید کسی کے پاس جانا بے کار عمل تھا۔ کیونکہ سب ایک کپ چائے کی اپنی اپنی ٹپ اپنے اپنے وقت پر ادا کر چکے تھے۔ اوہ رضیہ بی بی تو آپ خالی ہاتھ لیے آج بھی وہیں کھڑی ہیں جہاں آج سے چودہ برس پہلے کھڑی تھیں۔ (دل نے سرگوشی کی)

☆......☆......☆

''رضیہ سلطانہ آپ؟ کیسی ہیں؟'' بندر روڈ پر واقع چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں چائے کا آرڈر دے کر اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے غیر مانوس آواز نے محویت کو توڑا۔ سامنے محمد رئیس پرانا کولیگ کھڑا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔ آفس چھوڑنے کے بعد نظر ہی نہیں آئے کبھی؟''

''رضیہ اگر برا نہ مانیں تو یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔''

''ہاں ضرور۔''

''شکریہ، پر چائے میری طرف سے ہوگی۔ آج آپ انکار نہیں کریں گی۔ کیونکہ قدرت نے یہ موقع فراہم کر دیا ہے۔ ورنہ تو تقریباً ہر روز ہی اسی ریسٹورنٹ میں آنا لگا رہتا ہے اور تقریباً رات کا کھانا بھی یہیں کھاتا ہوں۔ پر آپ کب سے اس چھوٹے موٹے ریسٹورنٹ......!''

''میں اپنی دوست سے ملنے آئی تھی یہاں۔ وہ گھر پر نہیں تھی۔ چائے کی طلب یہاں کھینچ لائی۔''

''پر آپ یہاں کھانا روزانہ میرا مطلب آپ کی وائف کیا گھر پر کھانا......!''

''میں نے شادی نہیں کی۔ ذمہ داریاں نبھاتے کب اپنا ہوش رہتا ہے۔ آپ سنائیں کیا کر رہی ہیں آج کل۔''

''میری کہانی بھی آپ سے مختلف نہیں ہے۔ اِدھر بھی حال کچھ ایسا ہی ہے۔ ذمہ داریاں نبھاتے اپنے لیے وقت ہی نہیں ملا۔''

''اب کیا ارادے ہیں آپ کے رضیہ؟''

''ارادے جب نیک ہوتے ہیں جب بندہ خود......'' رئیس نے جملہ مکمل نہ ہونے دیا۔

''ارادے تکمیل کے مراحل تب طے کرتے ہیں رضیہ جب بندہ خود چاہے۔''

''صرف خود کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا رئیس صاحب۔''

''ہاں سچ کہتی ہیں آپ برسوں پہلے میں نے چائے کی آفر کی تھی۔ اور اسی چائے کے ساتھ

سوچا تھا کہ آپ کو شادی کی آفر بھی کروں۔ مگر ایسا صرف میں نے چاہا تھا۔ سامنے والے کا مزاج جانے بغیر، آج پھر چائے کے ساتھ اگر آپ برا نہ مانیں تو وہی آفر کر سکتا ہوں۔ جو اس دن نہ کر سکا تھا۔''

''رئیس صاحب آپ بہت اچھے انسان ہیں اور میں آپ کے۔'' بات پھر نامکمل رہ گئی۔

''زیادہ بینک بیلنس نہیں بس چوتھی منزل پر واقع تین کمروں والے فلیٹ کا مالک ہوں اور اوسط آمدنی کمانے والا بندہ ہوں پر اتنا یقین ہے کہ آپ کی خواہشوں کو پورا کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتا ہوں۔''

''شرمندہ مت کریں، رئیس صاحب، زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کسی کو مکمل طور پر جانے بغیر نہیں لینا چاہیے۔''

''میں اپنی بات کر رہی ہوں۔ آپ کے بارے میں شک وشبہات کی گنجائش نہیں۔''

''رضیہ میں آپ کو جلد بازی کا فیصلہ کرنے کا نہیں کہہ رہا۔ آپ سوچ بچار کر کے فیصلہ کیجیے۔ مگر اتنا یاد رکھیں میں یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر ہی کر رہا ہوں۔ یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔ جب ارادہ بن جائے تو مجھے فون کر دیجیے گا۔''

''رئیس صاحب شاید قدرت کو یہی منظور ہے اور آپ بھی...... ٹھیک ہے آپ میری والدہ سے مل لیں۔ ایڈریس لکھ لیں۔''

''شکریہ رضیہ۔ چائے پئیں یہ میری زندگی کی سب سے بہترین چائے ہے۔'' رئیس پُرجوش لہجے میں بولا۔

اور میرے لیے یعنی رضیہ سلطانہ کے لیے زندگی کی سب سے بڑی ٹپ جو صرف میری ذات کے لیے تھی۔

کاش کہ میں رئیس کی چائے کی پہلی پیالی اس وقت قبول کر لیتی تو شاید رضیہ سلطانہ نہ ہوتی۔

☆......☆......☆

شادی کے بعد رضیہ سلطانہ کو مسز رئیس بن کر چین کی زندگی گزارنا بڑا دلفریب لگا۔

گھر والوں نے کبھی پلٹ کر نہ پوچھا کیونکہ ان کا شمار جس کلاس میں ہونے لگا تھا۔ وہاں رضیہ سلطانہ نام کی شے کی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے بیٹا قرار دینے والی ماں بھی دامن بچا کر نکل لی۔

لفظوں کا استعمال کرتے ہوئے کہ آخر کو میری میت کو کاندھا بیٹے ہی دیں گے۔ اس عمر میں ان کو ناراض کرنا ٹھیک نہیں۔ میں ان کے ساتھ ہی ان کی مرضی سے ان کے پاس رہوں گی اور ان کی مرضی سے ہی ملوں گی۔

خود کو رضیہ سلطانہ سمجھتے یہ بھول گئی تھی کہ برصغیر پر راج کرنے والی رضیہ سلطان کی شکست بھی اپنوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ پھر میرا بھی اپنوں سے شکست کھانا انوکھی بات نہیں تھی۔

بلاشبہ رئیس ایک بہترین شریک سفر ثابت ہوا۔ فائزہ اور فائز کی پیدائش نے فیملی مکمل کر دی۔ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ نوکری شادی سے کچھ عرصہ قبل ہی چھوڑ دی تھی۔ سب کچھ صحیح چل رہا تھا۔ مگر شاید زندگی میں کچھ اور امتحان ابھی باقی تھے۔

☆......☆......☆

گرومندر پر حسب معمول بے تحاشہ رش ہو رہا تھا۔ فلیٹ کی بالکونی میں کھڑے رئیس اور میں بھاگتی دوڑتی زندگی کا نظارہ کر رہے تھے کہ اچانک سماں بدل گیا۔ دکانوں کے شٹر گرنے لگے فائرنگ کا تبادلہ شروع ہونے لگا۔ بالکونی سے

ہٹنے کی مہلت بھی نہ ملی اور ایک ظالم گولی رئیس کے سر پر آ کر لگی۔ آن کی آن دنیا ہی بدل گئی۔

عدت تک جیسے تیسے گھر میں پڑی کچھ رقم سے گزارا ہوا۔ فائزہ چھٹی جماعت میں اور فائز ساتویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ اسکول گو کہ اوسط درجے کا تھا۔ مگر فیس تو بہر حال ادا کرنی ہوتی ہے۔

تین وقت کے بجائے دو وقت ہی سہی روٹی تو درکار ہوتی ہے غنیمت تھا کہ سر چھپانے کو ٹھکانہ میسر تھا۔ ورنہ حالات کسی نہج پر پہنچ جاتے۔

تمام پریشانیوں کو پلو میں لپیٹے ایک بار پھر نوکری کی تلاش میں نکل پڑی۔ کچھ عمر کا تقاضہ کچھ تفکرات نے مل کر عجب روپ بخشا تھا کہ ناکامیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ہاں میٹرک پاس جوان اور پُرکشش لڑکی کو باآسانی جاب میسر ہو جاتی ہے۔ جبکہ ڈھلتی عمر میں پوسٹ گریجویٹ کو بھی ناکامی سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے۔ اور میں معمولی تعلیم ساتھ لیے تھی۔ معمولی نوکری بھی میسر نہیں ہوئی۔ گزشتہ دو روز مسلسل اخبار دیکھنے کے بعد ایک اشتہار پر نظر ٹھہر گئی۔

''ضرورت ہے۔''

ایک عدد آیا کی جو فالج کی مریضہ کی دیکھ بھال کر سکے۔ مناسب تنخواہ کارکردگی بہتر ہونے کی صورت میں اضافہ۔''

بہادر آباد میں واقع نئی طرز کے خوبصورت بنگلے کے باہر کھڑے چوکیدار سے ایڈریس دریافت کیا۔

''ہاں یہی ایڈریس ہے کس سے ملنا ہے؟''

''منیر صاحب سے ملنا ہے، یہ اشتہار دیا تھا اخبار میں۔''

''آیا کے لیے...... اچھا اچھا اِدھر پہلے کمرے کے بعد دوسرے کمرے میں ہی بڑے صاحب کے ساتھ سب لوگ بیٹھے ہیں۔''

بڑے سے کمرے میں موجود ایک بڑی عمر کے صاحب کے ساتھ ہی بستر پر دراز ادھیڑ عمر عورت چادر تانے لیٹی تھی۔ اور کرسی پر ایک ماڈرن خوبصورت عورت بیٹھی تھی۔ اور اسی ماڈرن عورت نے انٹرویو کی شروعات کی۔

''کیا نام ہے؟ کہاں رہتی ہو؟''

''سلطانہ...... رضیہ سلطانہ نام ہے میرا۔ نیو ٹاؤن کے عقب بنے فلیٹوں میں رہتی ہوں۔''

''حال حلیے سے تو بہتر لگتی ہو۔ کبھی آیا گیری کی ہے۔''

''کی تو نہیں پر وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔''

''بھئی ہمیں تو ایسی عورت کی ضرورت ہے جو تھوڑی بڑی عمر کی ہوتا کہ سکون سے اماں جی کا کام کر سکے۔ شوہر اور بچوں کی فیڈر کا بہانہ بنا کر جلدی چھٹی کی نہ پڑے۔''

''میرے شوہر کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ اور بچے فیڈر کے قابل نہیں ہیں۔ یہ نوکری میری ضرورت ہے۔ مگر ایسا ہرگز نہیں کہ آپ کی ضرورت پوری نہ کر سکوں۔ میں پورا کام ادا کر کے ہی جایا کروں گی۔''

''بڑا افسوس ہوا سن کر...... اچھا ایسا کرو۔ کل صبح سے آ جانا۔ تا کہ تمام کام سمجھا دوں۔ میں اور میرے ہزبینڈ صبح ڈیوٹی پر چلے جاتے ہیں اور شام پانچ بجے آتے ہیں۔ تمہاری چھٹی ہمارے آنے کے بعد ہوگی۔ تمہارا کام صرف اماں جی کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہوگا۔ ابا جی گھر پر ہی ہوتے ہیں ابا جی آپ کو بھی اگر کوئی کام ہو تو بتا دیا کیجیے گا۔''

کمرے میں موجود بڑے صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے کیا کام ہوگا بیٹا جی!“
”ٹھیک ہے تم جاؤ اور کل وقت پر پہنچ جانا۔“ شکریہ ادا کرتے ہوئے بنگلے سے نکل آئی۔
دل مطمئن تھا کہ کام بھی زیادہ نہیں اور تنخواہ بھی مناسب تھی۔ ساس سسر اور بیٹا بہو پر مشتمل یہ مختصر کنبہ کافی بے ضرر نکلا۔ صبح بچوں کو اسکول بھیج کر کھانا تیار کر کے رکھ دیتی فلیٹ کی چابی پڑوس میں دے دیتی۔ خود کو اور بچوں کو زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔

☆......☆......☆

”بھئی رضیہ اگر بیگم صاحبہ سے فارغ ہوگئی ہو تو مجھے ایک کپ چائے بنا دینا۔“
”ارے یہ تو بہت گرم ہے۔ میں گرم چائے نہیں پیتا۔ کپ اِدھر رکھ دو۔ ٹھنڈی ہونے پر پی لوں گا۔ جب تک تم میرا سر دبا دو، سخت درد ہو رہا ہے۔ ہوں کافی آرام آیا درد میں، بھئی جادو ہے تمہارے ہاتھوں میں چائے بھی خوب بنائی ہے۔“
”یہ لو کچھ پیسے رکھ لو۔ بہو کو مت بتانا۔ ورنہ تمہاری تنخواہ سے کاٹ لے گی۔ یہ تمہارا انعام ہے۔ ابھی مہینہ ختم ہونے میں دس دن باقی ہیں۔ ایسے میں ضرورتیں تھوڑی پہلی تاریخ کا انتظار کرتی ہیں۔ چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر سکی۔
اب اکثر بڑے صاحب کو ٹھنڈی چائے کی حاجت ہوئی کسی نہ کسی درد کے ساتھ ایک بار پھر مرضی کی راہ پر چلنا پڑا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ماضی کی کڑک چائے حال کی ٹھنڈی چائے میں تبدیل ہو چکی تھی۔
بڑے صاحب کا درد، کبھی سر، کبھی پیر اور کبھی کمر میں ہوتا۔ تھوڑی سی خدمت اور ٹھنڈی چائے اس کے عوض میں ٹھنڈی ٹپ مل جاتی۔ جس میں فائزہ اور فائز کے اسکول کی کاپیاں اور اسٹیشنری یا پھر چھوٹے موٹے کھلونے آ جاتے۔
جیسے تیسے کر کے فائزہ اور فائز کو میٹرک کرایا۔ بڑے صاحب سے کہہ کر ان کے بیٹے کے کلینک میں فائز کو کمپاؤنڈر لگوا دیا۔ جو کہ زندگی کی آخری ٹپ ثابت ہوئی۔ طویل بیماری جھیلنے کے بعد بیگم صاحب اس دنیا سے رخصت ہوئیں اور ساتھ میں میری نوکری بھی۔

☆......☆......☆

سبزی کی باسکٹ لے کر گھر پہنچی فائزہ کو کھانا بنانے کی ہدایت دے کر بستر پر دراز ہوئے تھوڑی دیر ہی نہ گزری تھی کہ اچانک غیر مانوس دستک دروازے پر ہوئی۔ دروازہ کھلنے پر مانوس چہرہ نظروں کے سامنے تھا۔
”ارے باجی صاحبہ آپ؟ آیئے اندر۔“
”ارے بھئی سلطانہ تم تو بڑی بے مروت نکلیں، بھائی کیا دنیا سے گیا، تم نے بھی پلٹ کر خبر نہ لی۔“
رسمی گلے شکوے کے بعد بڑی نند نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔
”میں رشتوں کو مضبوط بندھن میں باندھنا چاہتی ہوں۔ اپنے بھائی کی نشانیوں کو کہیں اور نہ جانے دوں گی۔“ اور یوں وٹے سٹے کی شادی انجام پا گئی۔ فائزہ بیاہ کر چلی گئی اور کلثوم بہو بن کر گھر میں اتری۔

☆......☆......☆

فلیٹوں کے پیچ سے بچوں کے کھیلنے کی آواز نے خاموشی اور مایوسی میں ارتعاش پیدا کیا اور شاید یہ ان بچوں کی معصوم ادائیں ہی تھیں کہ دل میں خوش کن احساس جاگا اور گھنٹوں دروازے پر کھڑی اُن کے بچپن میں خود کو شامل ہوتا دیکھتی

رہی۔ سوچا چائے بھی یہیں لے آؤں، اس خوبصورت منظر کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔
''کلثوم بیٹا چائے بن گئی ہو تو ذرا ایک کپ مجھے دے دو۔''
''یہ لیں پکڑیں۔'' دس منٹ بعد کلثوم چائے لیے سامنے کھڑی ہو گئی۔
''کلثوم یہ تو باسی چائے ہے۔ اس کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔''
''اوہو...... اب آپ کو اس عمر میں تازہ چائے کی طلب......''
''کیا مطلب ہے؟'' ٹکڑوں میں الفاظ کی ادائیگی کرتے ہوئے ایسا لگا جیسے کلثوم میرے ماضی کو کھنگال رہی ہے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ وجود لرز اٹھا جیسے طوفان کی زد میں ہو۔
''بھئی سنا ہے بڑھاپے میں انسان سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔ اسے اچھا کھانے پینے پہننے اور ڈھنے کی طلب نہیں رہتی بس اپنی عمر کے بچے کھچے دن آخرت کے حساب کتاب کو سوچتے گزارتا ہے۔ دوسرا یہ کہ آپ کا بیٹا ایک معمولی ڈسپنسر ہے اور اس کی تنخواہ اتنی نہیں کہ میں ہر دم دودھ پتی کی تیز چائے آپ کو پیش کرتی پھروں۔''
''اوہ......'' ایک اطمینان کی سانس وجود سے ابھری۔
گویا کلثوم میرے ماضی کی نہیں میرے مستقبل کے حوالے سے بات کر رہی تھی۔ اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ صبح صرف اتنی چائے بنایا کرو جتنی تین افراد پی لیں۔ اور شام میں اتنی کہ دوبارہ تین افراد پی لیں۔ مگر شاید میرے شکستہ وجود کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے میرے لیے باسی چائے ہی تجویز کی تھی۔
شام کو فائز کے آنے کے بعد دو کپ تازہ چائے بناتی۔ دو کے بجائے تین کپ تازہ چائے بنانا شاید اسے گوارا نہ ہو رہا تھا پر اتنا جان لیا میں نے ایسی فرمائش نہ کروں۔ جس سے میرے ماضی کے بے نقاب ہونے کا اندیشہ ہو۔ اور اس ڈر نے ہونٹوں پر قفل لگا دیے۔
بات صرف ایک کپ چائے پر ختم نہیں ہوئی۔ کلثوم کو میرا فلیٹ کے دروازے پر کھڑے ہو کر معصوم بچوں کو دیکھنا ان سے باتیں کرنا بھی کھلتا۔ بلکہ میرا وجود بھی اور اس بات کا ثبوت بھی جلد مل گیا۔

☆......☆......☆

''امی ایک بات کرنی ہے۔'' رات کو فائز میرے پاس بڑی لگاوٹ کے ساتھ بیٹھ گیا۔
''ہاں بولو بیٹا......!''
''امی ہم یہ فلیٹ بیچ کر ناظم آباد چلتے ہیں۔ اسی طرح فائزہ بھی آپ کے قریب رہے گی میرا مطلب ہے ملنا جلنا آسان ہو جائے گا۔''
''یہ کیوں نہیں کہتے کہ کلثوم کا میکہ قریب ہو جائے گا۔''
''امی آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں۔ کلثوم فلیٹ کے بچوں کے شور شرابے اور روڈ کی ٹریفک سے چڑ گئی ہے۔ وہ بالکل یہاں رہنا پسند نہیں کر رہی۔''
''پر بیٹا تم اور ہم بھی تو اسی ماحول میں رہیں ہیں۔ اور لوگ بھی تو رہ رہے ہیں۔ کلثوم اگر دل لگائے تو وہ بھی عادی ہو جائے گی۔''
''امی اپنی بات تو چھوڑیں تمام عمر تو رہ لیں اب بھی آپ کا دل نہیں بھرا۔ اور رہی میری بات تو میں کلثوم کو ناراض نہیں کر سکتا۔''
''آپ کو یاد رہنا چاہیے کہ آپ کی بیٹی بھی کلثوم کے بھائی کے گھر ہے۔ کہیں آپ کی ضد کی

سزا فائزہ کو نہ بھگتنا پڑے۔''

☆......☆......☆

زندگی کا ایک اور موڑ ناظم آباد کے علاقے پر لے آیا۔

جہاں کی سڑکیں وسیع تھیں اور میرے حساب سے کوارٹر بھی قدرے وسیع تھا۔ دو کمرے صحن، غسل خانہ اور باورچی خانہ پر مشتمل یہ گھر فائزہ کے گھر یعنی کلثوم کے میکے سے قریب تھا۔

جہاں گھروں کے فاصلے کم ہوئے وہیں دلوں اور رشتوں کے فاصلے طویل ہو گئے۔ یہ دلوں کے سودے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ دل جڑے ہوں تو طویل راستے بھی باآسانی طے ہو جاتے ہیں۔ پر جب دلوں میں فاصلے بڑھ جائیں تو کوئی بھی تدبیر ان فاصلوں کو سمیٹ نہیں پاتی۔

☆......☆......☆

دکھ سکھ ساتھ لیے دنیا کا کارواں چلتا رہا۔ پر میری تقدیر میں دکھوں کے سوا کچھ نہ لکھا تھا۔ شاید کاتب تقدیر نے سکھ کی اوڑھنی ڈالے بغیر ہی دنیا میں بھیج دیا تھا۔ یا شاید میں نے خود ہی اپنے دکھ کی اوڑھنی اپنے خونی رشتوں پر ڈالنے میں گزار دی۔

ہم انسانوں کی یہ ٹریجڈی رہی ہے ہم اپنی غلطیوں اور ناکامیوں کا ذمہ دار ہمیشہ دوسروں کو ٹھہراتے ہیں چاہے وہ انسان ہو یا قدرت۔

ہاں تو ابھی ناتواں جسم میں اتنی قوت باقی تھی کہ مزید دکھ سہہ سکوں۔ جبھی فائزہ اور فائز دونوں میرے پاس آئے۔

''امی میں دبئی جانا چاہ رہا ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔''

''اچھی بات تو تب ہو گی جب فائز کے ہاتھ کچھ پیسے ہوں گے۔ ویزہ پاسپورٹ سے لے کر دوسرے اخراجات کے لیے۔'' فائزہ نے کہا۔

''یہ تو اس نے سوچا ہو گا نا کہ اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے جبھی دبئی کا ارادہ کیا ہے؟''

''یہ سوچ لیا ہے جبھی تو آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''امی یہ گھر بیچ کر میں اپنا خواب پورا کر سکتا ہوں اور فائزہ کو بھی اس میں سے اس کا حصہ دے دوں گا۔''

''پر فائز بیٹا گھر بیچ دو گے تو ہم رہیں گے کہاں؟''

''امی گھر تو میں کما کر دوبارہ بنا لوں گا۔ دبئی سے ڈھیر سارا کما کر۔ یہاں رہا تو ڈسپنسری میں کھڑا دوائیاں دیتا رہوں گا۔ میری غیر موجودگی میں کلثوم پھوپو کے گھر رہے گی۔''

''اور میں......؟''

''امی پھوپو کا گھر صرف ایک رشتے سے جڑا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ یعنی وہ صرف ہماری پھوپو ہوتیں۔ تو آپ کے لیے گنجائش نکل آتی۔''

مگر سوچیں اس رشتے میں مزید دو رشتے جڑے ہوئے ہیں۔ فائز اور میرا سسرال ہونے کے ناطے نہ آپ کو اچھا لگے گا ان کے ساتھ رہنا اور نہ ہم دونوں کو۔ کلثوم بھابی تو ان کی بیٹی ہیں وہ رہ سکتی ہیں۔''

''لیکن امی آپ فکر مت کریں میں نے اپنے دوست ظہیر کے توسط سے ایک ادارے میں بات کی ہے۔ اسی کے ماموں وہاں کے انچارج ہیں۔ میں دیکھ کر آیا ہوں۔ بہت سہولیات موجود ہیں۔ بہت ساری اور بھی عورتیں موجود ہیں۔ آپ کا دل بھی لگا رہے گا۔ فائزہ ہفتے میں ایک دو بار چکر لگا لیا کرے گی اور جب میں پاکستان آؤں گا تو آپ کو واپس لے آؤں گا۔''

تو کلثوم بی بی تم نے جس نفرت کی ابتدا ایک

کپ باسی چائے سے کی تھی اس کی انتہا یہ تھی۔

☆......☆......☆

کسی بھی عمل کی شروعات چاہے وہ اچھا ہو یا برا...... ابتدا ایک کپ چائے سے ہی ہوتی ہے۔ یہ بات مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔

''کیا سوچ رہی ہیں امی؟'' فائزہ نے اکتائے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے جیسی تم لوگوں کی مرضی۔ میرا کیا ہے۔ وقت ہی تو ہے کہیں بھی رہ کر گزار لوں گی۔'' شکست خوردہ لفظوں کے ساتھ ایک نظر اپنی اولاد پر ڈالی۔ ایک امید کے ساتھ کہ شاید ندامت کی کوئی جھلک نظر آئے۔ پر خوشی سے دمکتے چہروں نے نگاہوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ شاید کہ اپنی شکست کا نظارہ دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

کافی بڑے رقبے پر بنا یہ فلاحی ادارہ، جس کی سرمئی دیواریں گھمبیرتا لیے ہوئے تھیں۔ نیم تاریک کمروں اور روشن صحن میں اونگھتی کھانستی عمر رسیدہ عورتیں اپنے اندر داستانوں کا خزانہ لیے گھومتی نظر آتیں۔ باسی چائے کی مانند۔

اور باسی چائے ہاں باسی چائے کی نوبت شاید کبھی لبوں تک نہیں پہنچ پاتی۔ سنک میں انڈیل دی جاتی ہے۔ جہاں سے وہ نالیوں سے گزرتی ہوئی گندے پانی میں تحلیل ہو کر اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ اور یہی ان کا مقدر ٹھہرتا ہے۔

☆......☆......☆

کئی برس بیت گئے۔ اس ادارے میں رہتے ہوئے۔ فائزہ اور فائز میں سے کسی نے بھی پلٹ کر خبر نہ لی۔ اب تو ان کے نقوش بھی یاد نہیں رہے۔ بس یاد تھی تو بس ایک درد کی لکیر۔

اوہ خدایا دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔

تیز جھکڑ کے ساتھ، نظر کے سامنے رکھی پیالی فضا میں لہراتی۔ بل کھاتی تمسخر اڑاتی اٹھی۔ جس پر 24-11-80 کی تاریخ درج تھی۔ پھر اس نے ہزاروں پیالیوں کی شکل اختیار کر لی۔ ہر نئی تاریخ کے ساتھ کچھ دیر رقص کرنے کے بعد تمام پیالیاں سمٹ کر ایک پیالی میں سموگئیں۔ اب نظر کے سامنے پیالی پر ایک نئی تاریخ ابھری 24-11-2001۔

شکست خوردہ باسی چائے نوحہ کناں تھی۔ لرزتے ہاتھوں سے اسے تھامنے کی کوشش کی مگر ہمت جواب دے گئی۔

☆......☆......☆

''ارے لال خان جلدی آؤ۔ بڑی میڈم جی کو فون کرو۔'' کمرے میں میرے واپس آتی عورتوں کے ساتھ صبح والی ملازمہ بھی تھی کہ بے سُدھ وجود کو دیکھ کر چوکیدار کو آواز لگائی۔

ڈاکٹر صاحب جلدی آئیں۔ ادارے میں موجود ڈاکٹر کو ساتھ لے کر چوکیدار آن پہنچا۔

''اوہ ان کے لواحقین کو اطلاع کر دو۔'' موت کی تصدیق کے ساتھ ڈاکٹر اٹھ کھڑا ہوا۔

''وجہ موت کیا ہوئی ڈاکٹر؟'' دوسری عمر رسیدہ عورت نے پوچھا۔

''موت دماغ کی رگ پھٹنے سے ہوئی ہے۔''

صبح تک تو ٹھیک تھی اماں جب ہم جا رہے تھے۔ جب میں چائے لے کر آئی تھی۔

''ارے یہ چائے دیکھو ابھی تک ویسے ہی پڑی ہے، باسی ہوگئی ہے۔ نذیراں ادھر آ یہ چائے اٹھا سینک میں پھینک دے اور جلدی کر میت نہلانے والی بوا کو بھی بلا لا۔ اماں جی کو دفنانے کو بھی جو بھیجنا ہے۔

☆......☆......☆

''پیدا تو تم لڑکی ہوئی تھیں۔ نام بھی زنانہ رکھا گیا تھا، پھر کیا ہو؟'' مجھے چھیڑ سوجھی۔ گویا اسے اوقات یاد دلائی۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ میری گردن دبا دے...... میں اس کے کمزور پہلو پر مسلسل چٹکی لے رہی تھی۔ وہ چاہنے کے باوجود میرا کچھ نہ بگاڑ سکی کہ اپنے......

تخیل کو تراش کر کہانیاں بنانا پہلے تو میرا مشغلہ تھا۔ پھر یہی روزگار ٹھہرا کہ انٹرٹینمنٹ انڈسٹری میں کہانی کی بڑی اہمیت ہے۔

ایسی کہانی جو کسی نے سوچی نہ ہو۔

کسی نے برتی نہ ہو۔

بالکل ان چھوئی۔

عین میں وہی توقعات جو عاشق اپنی محبوبہ سے رکھتا ہے۔ اسی لیے Work Station پر میرا کمرہ ہمہ وقت 'قصہ خوانی بازار' بنا رہتا ہے۔

گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے......

بھانت بھانت کی کہانیاں سنانے والے......

دور، دور سے چلے آتے ہیں۔

پہلی کہانی میں دو عورتوں کے درمیان ایک مرد آجاتا ہے۔ اس سے اگلی میں دو مردوں کے درمیان ایک عورت آجاتی ہے۔

دو عورتوں کے درمیان ایک عورت......

اور دو مردوں کے درمیان ایک مرد......

ایسی روایات عام زندگی میں تو ملتی ہیں۔ مگر کہانیوں میں خال خال لطافت' چاشنی تضادات سے ابھرتی ہے اور تضادات و تصادم نہ ہو تو کہانی نہیں بنتی...... سپاٹ...... بے رنگ واقعہ رہ جاتی ہے......شوبی کی طرح۔

دھیان اس کی طرف کیا گیا کہ وہ لمحہ بعد سامنے موجود تھی۔

''ڈارلنگ تم کو پتہ ہے آج کل میری زندگی میں کیا ہے؟'' وہ آتے ہی شور مچانے لگی۔

''اتنا پتا ہے کہ تمہاری زندگی میں رومانس دور دور تک نہیں ہے۔'' شوبی نے میری توقع کے مطابق منہ بنایا۔ شدید بے زار کن شخصیت ہے یہ شوبی...... مجھے اس کی بے رنگی سے وحشت ہوتی ہے، چڑ ہوتی ہے کہ انسان' اشیاء' رویے اپنے اصل رنگ میں نہ ہوں تو بڑے اوپرائے اور نحوست زدہ لگتے ہیں۔

دھوپ نہ چھاؤں...... جیسے بدلی چھائی ہوئی ہو۔ جیسے تصویر پر دھول پڑی ہو۔

اس کو دیکھ کر، کسی کی بھی تخلیقی صلاحیت بانجھ

ہو سکتی ہے۔ یہ میرا تجزیہ ہے۔
سو اسے دیکھ کر میں شدت سے اکتا جاتی ہوں۔ میری بے زاری سے بے نیاز وہ ہے کہ سماج کو ہلا دینے والی کہانی کا مطالبہ لیے ہر وقت سر پر سوار رہتی ہے۔ اب میں اسے کیسے بتاؤں کہ کون دیکھنا چاہتا ہے، ٹی وی، فلم کے تفریحی موڈ میں رونے والی نحوست زدہ گندی سندی حقیقت پسندی۔
اس نے میری بور شکل دیکھ کر بات بدلی۔
''اوکے، اوکے تمہیں ڈسٹرب کیا۔'' فٹافٹ وہ کام کی بات پر آگئی۔
''تم نے مجھے جو اسکرپٹ دیا ہے نا اس میں ہیرو کیا سگریٹ پینے والا انسان ہے یا سگار......''
''وہ گھاس کھانے والا انسان ہے۔'' میں نے چڑ کر جملہ پورا کیا۔
جواباً اسے مجھ سے زیادہ غصہ آ گیا۔ میری میز، جس پر کاغذوں کا جمعہ بازار لگا رہتا ہے۔ یہ اسکرپٹ پھینک کر بولی۔
''یار ایک تو تم بھی نا، عجیب عجیب انسان مجھے پکڑا دیتی ہو، اللہ معافی، شعر بولنے والا، مشکل مشکل باتیں کرنے والا، فضول الفاظ منہ سے نکالنے والا، توبہ......''

مجھے اُس پر غصہ آ جائے تو میں اس کی صنف اُسے یاد دلاتی ہوں۔ سو یہی کیا۔

''اے لڑکی...... تم کیسی انسان ہو...... ہائے داوے۔'' سنتے ہی دانت کچکچا کر بولی۔

''سائرہ جی...... ! آئندہ مجھے یہ گالی نہ دینا۔'' میں نے بھی اپنے شاعروں، ادیبوں کی بے عزتی کرنے کا بدلہ لے لیا تو ہی سکون ملا۔ اس کا دل جلانے والی مسکراہٹ سجا کر میں اپنی کہانیوں کی سستی رومانی دنیا میں گم ہونے لگی کہ اس نے اسکرپٹ میرے ہاتھ سے چھینا۔

''کیا میں شکل سے 'چ' لگتی ہوں؟'' چشمہ اتار کر اطمینان سے کہا۔

''لگتی کیا ہنڈرڈ پرسنٹ ہو'' میں نے نظریں جما کر زور دے کر کہا۔

چونکہ وہ ضرورت سے زیادہ سمجھدار ہے، سمجھ گئی مگر میرے الفاظ آگ لگا چکے تھے اور جیسے اس کا سارا وجود جھلنے لگا۔ اتنا کہ اس کے منہ سے شعلے نکلنے لگے اور مجھے لگا کہ میرے کمرے میں شاعری، ناول افسانے کی کتابوں کے جنگل میں آگ لگ جائے گی اور کئی دن تک نہیں بجھے گی۔

''آج سے سات سال پہلے یہ سالی شلوار اتار پھینکی تھی۔''

''اُف بس کردو۔'' میں ویسے ہی کھلی زبان سن کر لرزسی جاتی ہوں۔ خوامخواہ اسے طیش دلایا مگر اب وہ رُکنے والی نہیں تھی۔ جملہ مکمل کیا۔

''اور فیصلہ کیا تھا کہ زندگی جینز میں بسر کروں گی۔'' اس نے چٹکی سے جینز کا موٹا کپڑا پکڑ کر دکھاتے ہوئے کہا۔

''توبہ! سوچ سمجھ کر بولا کرو، کوئی مرد بھی سن سکتا ہے۔''

''کیوں میں کوئی لڑکی ہوں...... عورت ہوں...... کمزور ہوں...... میں کیوں زبان روکوں؟''

''پیدا تو تم لڑکی ہوئی تھیں۔ نام بھی زنانہ رکھا گیا تھا، پھر کیا ہو؟'' مجھے چھیڑ سوجھی۔ گویا اسے اوقات یاد دلائی۔

اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ میری گردن دبا دے...... میں اس کے کمزور پہلو پر مسلسل چٹکی لے رہی تھی۔

وہ چاہنے کے باوجود میرا کچھ نہ بگاڑ سکی کہ اپنے کیریئر کو جیک لگانے کے لیے اس کو مجھ سے کہانی درکار تھی۔ جس کو ڈائریکٹ کر کے وہ شوبز مارکیٹ میں اِن ہو سکے۔ ان سب معاملات کے پیش نظر وہ کچھ دھیمی ہوئی۔

''دیکھو دادا! وہ ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی نا...... اس کو ایک دن میں نے اپنے ہاتھوں قتل کر دیا۔'' اس نے اپنے نرم و نازک ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا جو کسی طرح کسی قاتل کے ہاتھ نہ دکھتے تھے۔

''نہیں! اتنے پیارے ہاتھ کسی کا خون نہیں کر سکتے۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا جو اس نے جھٹکے سے کھینچ لیا۔

''یہی بات بری لگتی ہے۔''

''کیا؟'' میرا حیران ہونا بجا تھا۔

''اپنے رنگ و روغن کا قصیدہ سننا۔''

''یار! عورت کی فطرت ہے۔''

''یقیناً تمہارے شاعروں نے بتایا ہوگا۔ سوری! میں نہیں مانتی ان مردوں کو جو عورت کے سامنے شاعر ہو جاتے ہیں۔''

''اے احمق! کبھی ان کے آگے بے وقوف بن کر دیکھ۔'' میں نے شرارت سے اسے گھیرا، وہ ایک لمحے کو بے قوفی کی زد میں آ گئی اور اس کا اعترافی موڈ بن گیا۔

''یہ جو میں دکھتی ہوں نا...... ہمیشہ ایسی نہیں تھی۔ اچھی خاصی نیک پروین تھی۔ لپٹی لپٹائی، چھپی چھپائی۔''

''یہ کون سی صدی کا قصہ ہے؟'' میں حیران ہو کر انکشاف کی زد میں آ کر بولی۔ وہ جھینپ کر رہ گئی۔

''جب میں نئی نئی کام کرنے نکلی تھی۔ غلطی سے صحافت کا پیشہ اختیار کیا کہ پڑھے لکھوں کی فیلڈ ہے۔ قلم سے جہاد کروں گی۔ جرائم کو بے نقاب کروں گی۔ اصلاح معاشرہ کروں گی۔ کام سیکھوں گی۔ یوں سمجھ جانی! خوابوں کی دنیا میں کھو گئی۔'' پھر وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔

''ہوش میں آئی تو پتہ چلا کہ سکھانے والا استاد مجھے محبت سکھانے پر تلا ہوا ہے۔ رومانس میں ماہر کرنے پر اتر آیا ہے۔'' میں ہنسنے لگے کہ اس کی پھیکی زندگی میں زنانہ ملائمت کے آثار دریافت ہو رہے تھے۔ میں خوش ہونے میں حق بجانب تھی۔

''مرد عاشق ہوتا ہے عورت حسن ہوتی ہے۔ دونوں کے سمبندھ سے کائنات چل رہی ہے۔ سیکھ لینا تھا، آگے کام آتا، بہت ترقی ملتی۔''

''کیوں مجھ میں صلاحیت کی کمی تھی۔ میں چل سکتی تھی، پھر سکتی تھی، کام سیکھ سکتی تھی۔ جس پہ دل آتا، اس پر مر بھی سکتی تھی۔ پر یوں نہیں...... نیوز روم کے ڈیسک پر کیا بیٹھی...... چیف ایڈیٹر سے لے کر پیون تک کی محبوبہ بن چکی تھی۔

دو دن گزرے، دو ہفتے گزرے، دو مہینے گزر گئے۔ کوری کی کوری...... ویسے سب او کے ٹیک تھا۔ مگر جانی! مجھے کام کی پیاس تھی...... اور پھر......''

وہ رک گئی۔ ٹھہر گئی، پھر اپنے مطالبہ پر آ گئی۔ جس سے میں بدمزہ ہوتی ہوں۔

''یار جانی! مجھے آگے جانا ہے بہت آگے، سماج کو بے نقاب کر دینے والی بلاسٹ کرنے والی کہانی، ایک عدد کہانی، یار جو قلم سے نہ کر سکی۔ وہ کیمرے سے کروں گی گندگی کو گندا دکھاؤں گی۔''

''شوبی! وہ محبوبہ...... اس کا کیا ہوا؟''

کہانی اور کمزوری سننے کی انسانی فطرت مجھ میں جاگ گئی۔ میں نے پچھلی بات کا سرا تھمایا۔

کاغذوں کے جمعہ بازار میں چٹخارا چاہیے تھا۔

''کھاتی اپنی مرضی کا ہوں...... پہنتی اپنی مرضی کا ہوں...... جاگتی اپنی مرضی کا ہوں۔'' پھر قطعی لہجے میں بولتے ہوئے ایک بار پھر رُکی۔

''تو پھر سوؤں گی بھی اپنی مرضی کا۔''

''اوہ......!''

''پھر میں نے شلوار......''

''اے رُک رُک......'' میں بوکھلائی۔

''مطلب میں نے دوپٹہ پھینکا۔ چوڑیاں ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔ سینڈلیں ماسی کو دے دیں۔ لپ اسٹک، نیل پالش کو آگ لگا دی اور ایسی بن گئی۔'' اس نے اپنے مردانہ حلیے والے وجود پر حقارت بھری نظر ڈالی۔

''کسی نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے گلے سے لگایا۔ کسی نے چائے کی آفر دی۔ ڈھابے پر بیٹھ گئی۔ کسی نے سستا جملہ پھینکا۔ میں نے کرارا جوک سنایا۔ سب ٹھنڈے پڑ گئے۔''

نہ چھپن چھپائی، نہ لگائی بجھائی، نہ چٹخارہ، نہ مزہ، میں بدمزہ ہو گئی۔ وہ چہک کر بولی۔

''دیکھو جانی! یہ کانا پھوسی بیکار ہے۔ سارے پتے کھول کر رکھ دو تو کوئی نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔''

''جب میدان میں اترے ہیں تو کھیلے بغیر، یا ہارے، جیتے بغیر گھر جانے کا فائدہ۔'' میرا اپنا فلسفہ ہے۔

''جانی! فائدہ یہ ہوا کہ 'عزت' بچ گئی۔'' وہ آنکھ دبا کر بولی۔ مجھے اس فلمی ڈائیلاگ پر ہنسی آ گئی۔

وہ بھی ہنستے ہنستے دیرینہ مطالبہ دوہراتے نکل گئی۔

''اگلی باری...... تم مجھے دے ہی دو۔ ایک کہانی...... سماج کا بھرم کھولنے والی، ٹھیک......''

اور میں رومانی مکالمے لکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ حقیقت اور فرض میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ حقائق کھردرے ہوتے ہیں۔ خیال کتنا رومانی ہوتا ہے۔ انٹرٹینمنٹ انڈسٹری کے لیے کہانی وہی اچھی ہے جو تخیل سے پھوٹتی ہے۔ جہاں سب اچھا اچھا ہے، یا ہو جاتا ہے۔ مگر ایسی کہانی شوبی کو نہیں چاہیے۔ کافی دن گزر گئے۔

بغیر انتظار کرائے ایک بار پھر وہ میرے سامنے آ گئی اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔ شور شرابا آج اس کے مزاج میں نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا۔ وہ سمٹی سمٹائی سی ہے۔ جسم کو چرائے ہوئے، مجھے عجیب سا محسوس ہوا مگر میں نظر انداز کر کے اپنے کام میں گم رہی۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ کہنے لگی۔

''سائرہ جی! جینز پہنو یا شلوار...... سالی فلمی عزت کہیں محفوظ نہیں۔'' میں دوہرائی ہوئی کہانی سننے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھی کہ زندگی کی سب سے خوبصورت کہانی میں سے 'عاشق' کا کردار منہا کر کے ہر قصے کو سپاٹ کر دیا جائے۔ وہ میرا موڈ دیکھ کر اپنے مطالبے پر آ ئی۔

وہ اسی سوال کو دوہرا رہی تھی۔

''سماج کو ہلا دینے والی۔''

''نہیں ملی۔'' اس کا سوال پورا نہ ہوا تھا کہ میں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

اس نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا۔ پست لہجے میں بولی۔

''سائرہ جی! تم کو پتہ ہے اب میری زندگی میں کیا ہے؟''

''مار کٹائی، گالم گلوچ...... اور کیا ہے یار! فلرٹ کرنا مردوں کی فطرت ہے اس سے سمجھوتہ کر......''

''مطلب......'' وہ تیکھی ہو کر سیدھی ہوئی۔ اس کی تقریر کے پیش نظر میں نے پہلے بولنا شروع کر دیا۔

''جاؤ...... منہ توڑ دو...... فلرٹ کرنے والوں کا۔'' میں نے اس کی تھکی طبیعت کو جوش دلایا۔

''نہیں!''

''تم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں کیا؟ جبڑا کیوں نہ چیرا؟'' وہ بے دم ہو کر گری۔

''سائرہ جی! کیسے منہ توڑ دوں؟ چوڑیاں اگرچہ میں نے نہیں پہن رکھیں۔'' اس نے ڈنڈا سی کلائیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کا لہجہ مزید پست ہوا۔ وہ رکی پھر بے چارگی سے بولی۔

''اس بار بھی مرد ہوتا تو میں اس کا منہ ضرور توڑتی۔ پھر تمہارے پاس آتی۔'' چند لمحے خلا میں گھورتی رہی۔ پھر جھرجھری لے کر بولی۔

''مگر چوڑیاں اس نے پہن رکھی تھیں...... اور میں کچھ بھی نہ کر سکی۔'' سماج کو ہلا دینے والی لائن خود اسی نے مجھے دے دی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ اس پر کہانی لکھ کر اسے دوں یا اب تک محفوظ رہ جانے والی عزت پر مبارکباد دے کر اسے رخصت کروں۔''

☆☆......☆☆

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

افسانہ

دانیہ آفرین

محبت رنگ عید کا

"زاور! شادی باعث پریشانی نہیں ہے، شادی تو مسرتوں کا سبب ہے، ہم لوگوں نے شادی کو مشکل کیوں سمجھ لیا ہے، سادگی سے فرض وسنت ادا کر کے بھی تو زندگی شروع کی جا سکتی ہے، ہم لوگوں نے دنیاوی رسوم اور ریاکاری کے کانٹے اپنے دامن میں بھر لیے ہیں، ہم لوگ......

سوا نیزے پہ کھڑا سورج اہل زمیں کے صبر کا امتحان لے رہا تھا ہوا بھی اس کی ہمنوا بنی اہل نفس کی مشکلات میں اضافہ کر رہی تھی۔

زمین پر دھواں چھوڑتی گاڑیاں بھی ان دونوں کا ساتھ بڑی تندہی سے دے رہی تھیں۔

نڈھال خالی پیٹ بس سٹینڈ پہ کھڑے اسے 15 منٹ ہو گئے تھے روٹ کی بس آنے کا نام نہیں لے رہی تھی

دھندلائی آنکھوں سے اس نے پھر سڑک کی طرف دیکھا خراماں خراماں مطلوبہ بس آتے دکھائی دی

فائلز سنبھال کے جلدی سے اس نے ہاتھ دیا او شکستہ قدموں سے آج ایک بار پھر مایوس واپس لوٹ گیا۔

☆......☆......☆

ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک سے گزرتی گاڑیوں کو دو سیاہ آنکھیں امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی ارد گرد آس کے دیے جلائے وہ اب تک اہل زمین کو متوجہ نا کر پایا تھا۔

اے فضل تم آج پھر آ گئے پاس سے گزرتے سفید شلوار قمیص زیب تن کیے ان مہذب شخص نے چند لمحوں حیرانی سے رک کے انہیں دیکھا میاں تم بھی بڑے عجیب ہو کوئی کام دھندا نہیں ہوتا پھر بھی نقصان اٹھاتے ہو پھر منہ اٹھائے چلے آتے ہو اپنی داڑھی کو ہاتھ لگاتے محفوظ صاحب آنکھوں میں حیرانی لیے ان کے قریب آ گئے

روزی روٹی کے لیے گھر سے نکلتا ہوں نفع نقصان میری قسمت جواب دے فضل انگیٹھی میں کوئلے ڈالنے لگے بھئی آج بڑے زور کی بھوک لگی ہے بیگم بھی گھر پر نہیں ہے محفوظ صاحب ایک سٹول پر بیٹھ گئے

فضل بسم اللہ پڑھ کے تیز ہاتھوں سے چپل کباب فرائی کرنے لگا

فضل میاں کیا لذیز کباب بناتے ہیں قسم سے سواد آ جاتا ہے چپلی کباب اور کلچوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے انہوں نے ہمیشہ کی طرح آج بھی داد

دی

فضل میاں تمہیں سمجھایا بھی ہے میاں روڈ پر لگایا کروا اپنا سٹال تم ہو کے مانتے ہی نہیں

افسوس سے کہتے ہوئے وہ جیب سے پیسے نکالنے لگے

محفوظ صاحب روڈ پہ سٹال کا روز کا کرایہ 300 روپے ہے گھر کے لیے کماؤں یا ان لوگوں کو دوں فضل ہاتھ صاف کر کے محفوظ صاحب سے پیسے وصول کرنے لگے

اللہ ان بدبختوں سے حساب لے گا غریبوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے محفوظ صاحب فضل کے لیے ہمیشہ دکھی ہو جایا کرتے تھے اللہ کرم کرے فضل نے پور امید بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھ کے کہا

چلو ہم چلتے ہیں مصافحہ کر کے محفوظ صاحب اپنی راہ کو چل دیے کچھ دیر بعد فضل اپنا سامان سمیٹ کے مایوس سے گھر لوٹ گئے روز شام سے رات تک وہ اسٹال لگائے وہ آنکھوں میں امید لیے ہر رہگزیر کو امید سے تکتے بمشکل اتنی آمدنی تھی کے کبابوں کا خرچ نکل آتا کسی دن اگر قسمت مہربان ہوتی تو صبح کے ناشتے اور دن کے کھانے کے پیسے ہو جاتے اور کبھی کبابوں کے بچے قیمے سے گزارا ہو جاتا

☆......☆......☆

شام ڈھلتے ہی موسم نے اپنا ہاتھ کچھ ہولا کیا تو روح زمین کو سکون کی کچھ ساعتیں میسر ہوئیں

ٹھنڈے پانی سے دھلائی کے بعد صحن کا موسم بھی کچھ بہتر ہو گیا تھا چار پائی پہ دوزانو بیٹھے وہ خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

"فارینہ بیٹا ایسے کیوں بیٹھی ہو؟" چار پائی پہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے امی نے فکر مندی سے پوچھا

دھڑ دھڑ

اس سے پہلے فارینہ کوئی جواب دیتی دروازہ بجنے لگا

" لگتا ہے فضل آ گئے جاو بیٹا دروازہ کھولو"

"سر پہ دوپٹہ درست کر کے فار دروازہ کھولنے اٹھ گئی۔

سامنے فضل صاحب اپنا سامان لیے کھڑے تھے

"بابا آج بھی بچ گیا مال فار۔" نے ان کے ہاتھ سے سامان لیتے ہوئے دکھ سے پوچھا

"بیٹا دکھ نہیں کرتے" اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے فضل نلکے کی طرف بڑھ گئے

فار بچا ہوسامان فریج میں رکھنے لگی۔

"زوار آ گیا؟" منہ ہاتھ تولیے سے خشک کر کے فضل بھی سیما کے پاس چارپائی پہ آ بیٹھے

"بچہ آج بھی سارا دن ڈگریاں لیے خاک چھانتا رہا ہے" سیما بیگم نے آنکھ میں آئی نمی کو صاف کرتے ہوئے جواب دیا

" اداس مت ہوا کرو آپ اس طرح ہمت ہار جائینگی تو بچوں کو ہمت کون دلائے گا میں نہیں چاہتا بچے اپنی امید کھو دیں اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے ہمارے پاس" سیما بیگم کو آج فضل صاحب کا لہجہ بھی دل گرفتہ محسوس ہوا تھا

"ماں جی آج بھی کھانے میں کباب تل لوں فارینہ نے کچن سے پوچھا

"ہاں بیٹا کباب تل لو ورنہ قیمہ خراب ہو جائے گا" فضل صاحب نے چار پائی پہ دراز ہو کے کہا

"فارینہ دو انڈوں کا آملیٹ بھی بنالو اپنے لیے اور زوار کے لیے"

ٹھیک ہے ماں جی

اچھا کیا بچوں کے لیے آملیٹ کا بول دیا بچے بھی بے چارے بچے ہوئے کباب کھا کھا کے اکتا گئے ہوں گے"، سیما بیگم میں سوچ رہا ہوں کل سے جتنا بھی مال بچے گا غریبوں میں بانٹ آؤں گا کسی مفلس کے پیٹ میں گیا لقمہ ہی شاید ہماری مشکلات میں کمی کر دے"

فضل نے پر سوچ انداز میں کہا

"جو آپ کو بہتر لگے" کہہ کر سیما بھی فارینہ کا ہاتھ بٹانے کچن میں چلی گئیں۔

☆......☆......☆

" فضل صاحب رمضان آ رہے ہیں میں سوچ رہی ہوں اس عید پہ ہم فارا اور زوار کی رخصتی کر دیں "ناشتے کی ٹرے ان کے سامنے کر کے سیما نے شوہر کو بغور دیکھا

"سیما جی زوار کی بھی جاب ابھی نہیں لگی میرے حالات بھی کچھ ٹھیک نہیں "فضل کچھ تذبذب کا شکار تھے

"فضل فارینہ کو ہم نے اس کے ماں باپ کے گزرنے کے بعد بچپن سے ہی پالا ہے بچوں کا نکاح ہوا ہے رخصتی میں دیر نہیں کرنی چاہیے بچی جو ابھی کھاتی اوڑھتی ہے بعد میں بھی وہی کھائے گی اوڑھے گی۔

اور ہم نے کونسا دھوم دھڑکا کرنا ہے بس ایک چھوٹی سی رسم کر کے فارینہ کو زوار کے کمرے میں لے جانا ہے"

سیما نے شوہر کو قائل کرنا چاہا

"وہ سب ٹھیک ہے چند رشتے داروں اور محلے والوں کو تو بلانا ہی ہوگا نا ولیمہ کے کھانے کے لیے.. ولیمہ سنت ہے سیما جی" فضل نے چائے کا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے یاد دلایا۔

"سب ہو جائے گا فضل فارینہ کا جوڑا میں نے پہلے سے ہی تیار کیا ہوا ہے رمضان آرہا ہے کبابوں کی خرید افطار کے وقت بڑھ جائے گی زوا کو کہوں گی ٹیوشن کی دو ماہ کی فیسیں ایڈوانس لے لے میں بھی اپنے جھمکے بیچ دیتی ہوں فضل صاحب پیسہ تو آتا جاتا رہتا ہے اس اہم کام میں مزید دیر نہیں کریں نکاح کے بعد رخصتی کو اتنے عرصے تک روک کے رکھنا اسلام میں بھی جائز نہیں ہے میں گھر میں کھانے کا انتظام کرلونگی

آپ چند ضروری عزیز و اقارب کو کہہ آئیں عید کے دن کھانا ہمارے ساتھ کھالیں" سیما نے اپنا ترتیب کردہ پروگرام فضل صاحب کو بتایا

"ٹھیک ہے آپ جو مناسب سمجھیں میں بھی کوشش کرتا ہوں روڈ پہ سٹال کی جگہ مل جائے تا کہ کچھ آمدن بڑھ جائے"

☆......☆......☆

دن بھر شدید گرمی کے بعد شام ڈھلتے ہی موسم بہتر ہو گیا تھا. ہلکی ہلکی مدھر ہوا جسم و جاں کو سرور بخش رہی تھی. پچھلے آدھے گھنٹے سے چھت کی منڈیر پر کہنیاں ٹکائے سوچوں میں گم وہ آسمان پر غیر مرئی نکتے کو گھور رہا تھا۔

"چائے لے لیجیے" زاور اپنے عقب سے آنے والی آواز پہ اچانک چونکا تھا، اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو گلابی ہالے میں پر نور چہرے پہ دل فریب مسکراہٹ سجائے وہ اسی سے مخاطب تھی

"تم کب آئیں؟" زاور نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھام لیا

"کچھ دیر پہلے" دھیرے سے کہہ کے وہ بھی دیوار کی منڈیر پہ زاور سے ذرا فاصلے پہ آ کے کھڑی ہوگئی

"آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں" فارینہ نے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا

"نہیں ایسی بات نہیں ہے" زاور نے فارینہ کو اپنی طرف غور سے دیکھتا پا کے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"آپ کی آنکھیں آپ کے جھوٹ کا پول کھول رہی ہیں" فارینہ نے مسکرا کے کہا۔

"تم بچپن سے ہی میرا جھوٹ پکڑ لیتی ہو" زاور نے ہلکے سے مسکرا کے کہا۔

"فارینہ! امی ابا ہماری رخصتی کا سوچ رہے ہیں" منڈیر پہ کمر ٹکا کے اس نے اپنا رخ فارینہ کی طرف کرلیا۔

"کیوں' آپ نہیں چاہتے رخصتی؟" فارینہ نے چونک کے اس کی بات کاٹی۔

"یار ایسی بات نہیں ہے بس میں اس لیے پریشان ہوں ابھی میری اچھی جاب نہیں ہے' تمھاری ضروریات و خواہشات کیسے پورا کروں گا، اچھی جاب لگ جائے تو۔"

"زاور! شادی باعث پریشانی نہیں ہے، شادی تو مسرتوں کا سبب ہے، ہم لوگوں نے شادی کو بشکل کیوں سمجھ لیا ہے، سادگی سے فرض و سنت ادا کر کے بھی تو زندگی شروع کی جاسکتی ہے، ہم لوگوں نے دنیاوی رسوم اور ریا کاری کے کانٹے اپنے دامن میں بھر لیے ہیں، ہم لوگ باہر سے رخ موڑ کے اپنے لیے خاردار جنگل کا انتخاب کرتے ہیں، میں آپ کے ہم قدم ہر دشوار راستے سے گزرنے کو تیار ہوں" فارینہ نے اپنی عادت کے برخلاف قدرے تیز لہجے میں جذباتی انداز میں کیا، زاور

خاموشی سے کھڑا بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا
"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" زاور کی خود پر نظریں جمے دیکھ کے فارینہ نے جھنجلا کے پوچھا
"سوچ رہا ہوں، امی سے کہوں عید کا انتظار نہ کریں نیک کام میں اب مزید دیر نہیں ہونی چاہیے" لبوں پر شریر مسکراہٹ سجائے زاور نے اسے معنی خیزی سے دیکھا
"زاور!!!" اس کی بات کا مفہوم سمجھتے ہی فارینہ نے اسے گھورا اور الٹے قدموں نیچے بھاگ گئی، زاور کے جاندار قہقہے نے اس کا نیچے تک تعاقب کیا تھا

☆......☆......☆

رمضان کے بابرکت مہینے نے ہر سو اپنا نور بکھیرا ہوا تھا اہل ایمان رحمت کے عشرے میں اللہ تعالی سے اپنے لیے رحمت طلب کر رہے تھے..
"فارینہ بیٹا افطار کی تیاری کر لی؟" عصر کی نماز کی ادائیگی کے بعد سیما تسبیح ہاتھ میں لیے صحن میں آ کے بیٹھ گئیں
"جی امی شربت بنا لیا ہے کھجوریں بھی دھو کے کچن میں رکھ دیں" فارینہ نے کچن سے جواب دیا
دھڑ دھڑ
دروازہ بجا تھا سیما دروازہ کھولنے اٹھ گئیں
"اسلام علیکم امی!"
زاور سلام کرتا اندر آ گیا..
"وعلیکم السلام.. جیتے رہو بیٹا.."
سیما بیگم نے پیار سے بیٹے کے سر پہ ہاتھ پھیرا..
"امی آج ایک نئی ٹیوشن لگی ہے ایڈوانس ملے تھے کچھ فروٹ لے آیا ہوں" زاور نے ان کی طرف شاپر بڑھایا.

"ماشاء اللہ، اللہ رزق میں اور برکت دے". میں فارینہ کو دے کے آتی ہوں.
"فارینہ اور پھل لایا ہے بیٹا انہیں افطار کے لئے کاٹ لو"
"جی امی فارا نے مسکرا کے شاپر ان کے ہاتھ سے لے لیا.
شاپر میں سے نظر آتے امرودوں نے اس کا موڈ فریش کر دیا تھا.
امرود فارینہ کی کمزوری تھے زاور اس کی اس کمزوری سے واقف تھا.

☆......☆......☆

عشرہ رحمت امت محمدی صل اللہ علیہ وسلم پہ رحمت کی برسات کر کے گزر گیا تھا.
گیارہویں روزے سے عشرہ مغفرت شروع ہو گیا تھا.
سب مسلمان اپنی عبادتوں کے ذریعے اللہ سے مغفرت مانگ رہے تھے..
گزرتے روزوں کے ساتھ عید کی تیاریاں بھی تیز ہو رہی تھیں. بازاروں میں رش بڑھتا جا رہا تھا.
فضل کے محبت کدہ میں بھی رمضان کے احترام و اکرام کے ساتھ ساتھ فارینہ اور زاور کی رخصتی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں تھیں.
سیما محنت سے جوڑے گئے پیسوں کو احتیاط کے ساتھ خرچ کر رہی تھیں.

☆......☆......☆

اسلام علیکم
بھائی فضل پارسل کے لیے 5 کباب بنا دو آج گھر جا کے کھانا کھاؤں گا" مغرب کی نماز کے بعد محفوظ صاحب فضل صاحب کے اسٹال پہ آ گئے
5" منٹ رکو بھائی ابھی گرم بنا کے دیتا ہوں" فضل پھرتی سے قیمے میں مصالحہ مکس کر کے کباب

بنانے لگے

"فضل میاں آج کل تم چپ چپ ہوتے ہو کیا بات ہے؟" محمود صاحب نے فضل کا بغور جائزہ لیا۔

"محفوظ بھائی رمضان میں اللہ کا شکر ہے اتنی آمدن ہو جاتی ہے کہ گھر کا خرچ پورا ہو جائے بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں کی اس عید پہ بیٹے کی تقریب کر دیں

میں چاہ رہا ہوں سادگی سے مگر عزت سے ولیمے کا کھانا دے دوں بس اسی لیے کچھ پریشان ہوں"

کباب فرائی کرتے کرتے فضل صاحب نے تفصیل بتائی۔

"تم فکر مت کرو میاں اللہ پاک تم سے یہ فرض و سنت باخوبی ادا کروا دے گا" تسلی دیتے ہوئے محفوظ صاحب اسٹول سے اٹھ گئے

"یہ لیجیے بھائی بچوں کے لیے میں نے اسپیشل کباب بنائے ہیں" شاپر محفوظ صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے فضل نے مسکراتے ہوئے بتایا

"یہ لو زوار بیٹے اور فارینہ بیٹی کے لیے چھوٹا سا تحفہ لے لینا" محفوظ صاحب نے ہزار ہزار کے دس نوٹ انکی طرف بڑھائے

"بھائی صاحب یہ!!!"

"فضل میاں فارینہ ہماری بھی بچی ہے یہ ہمارا اور فارینہ کا معاملہ ہے بیٹی کی شادی ہر باپ کے لیے باعث مسرت ہوتی ہے ہمیں بھی اس خوشی میں شامل ہونے دیں" محفوظ صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں ٹوک دیا۔

اللہ تمہاری مشکلات حل کرے صدق دل سے دعا کر کے محفوظ صاحب گھر کی طرف بڑھ گئے

"فضل صاحب رحمت کے اس فرشتے کو دور تک جاتا دیکھتا رہے

محفوظ صاحب جیسے نیک دل انسانوں کی وجہ سے ہی دنیا قائم ہے جو اکثر بھوک نا ہونے کے باوجود بھی محض فضل صاحب کی مدد کی غرض سے کباب خریدتے تھے۔ کاش ابن آدم سفید پوشوں کا بھرم رکھنا سیکھ جائے۔

☆......☆......☆

"ماں جی آپ اتنا سب کچھ کیوں کر رہی ہیں میں نے کونسا بیاہ کر کے کہیں اور جانا ہے" پکوڑوں کے لیے پیاز کاٹتی ہوئی فارینہ نے میرون کامدار سوٹ پلنگ پر پھیلائے سیما سے پوچھا۔

"پگلی یہ تو کچھ بھی نہیں ہے میرا بس چلے تو اپنے بیٹی کے لیے پورا بازار خرید لاوں" سیما نے پیار سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا

"ماں جی مجھے بس آپ کی دعائیں اور محبت چاہیئے" فارینہ نے آنکھوں کے کٹوروں میں آنسو بھر کے کہا

"میری دعائیں ہمیشہ اپنے بچوں کے ساتھ ھیں خدا گواہ ہے رحیمہ (فارینہ کی ماں) کے بعد میں نے تمہیں زوار سے بڑھ کے چاہا ہے میرے آنگن کی پھول ہو تم، میری بیٹی بہو دوست سب کچھ ہو" خود سے لپٹائے ہوئے جذباتی لہجے میں گویا تھیں۔

"ساس بہو میں کیا جذباتی سین چل رہا ہے؟" شرٹ فولڈ کرتے ہوئے زوار کمرے سے نکلا تھا۔

"خبردار جو ساس بہو کا نام لیا ہم ماں بیٹی ھیں" سیما نے بیٹے کو مصنوعی غصے سے دیکھا۔

"اچھا جی آئندہ خیال رکھونگا"

جوتوں کے تسمے بند کرتے ہوئے اس نے ہنسی دبا کے کہا۔

"کہیں جارہے ہو بیٹا؟"

"جی امی دعا کریے گا کام کے سلسلے میں ایک بندے سے ملنا ہے" دعائیں لینے کے لیے اس نے اپنا سر جھکایا۔

"اللہ پاک ہر کام میں آسانی کریں" شفقت سے بیٹے کو دعائیں دے کے سیما بیگم کچھ دیر آرام کے لیے اندر چلی گئیں۔

"بیگم صاحبہ چپکے چپکے دیکھنے کی بجائے براہ راست دیکھیے" زوار نے شرارت سے سامنے کھڑی فارینہ کو جھک کے دیکھا

"ایسی کوئی بات نہیں" غلطی پکڑے جانے پہ اس نے خجل ہو کے کہا

"فارینہ دعا کرنا آج خوشخبری لیے گھر لوٹوں" زوار چانک سنجیدہ ہوا تھا

"زوار انشاء للہ سب اچھا ہوگا بے فکر ہو کر جائیں" فارینہ نے اسے ریلکس کرنا چاہا

"اچھا تو ہونا ھی ہے بیگم صاحبہ کا چہرہ جو یکھ لیا" زوار قدم بڑھاتا اس کے قریب آ گیا

"میرے خیال سے ماں جی کو آواز دے لیتی ہوں" فارینہ نے اسے وارن کیا

"ہاہا تم بھی نا" ہنستا ہوا وہ چند قدم پیچھے ہٹ گیا

"اللہ حافظ" لبوں پہ مسکراہٹ سجائے اس نے اپنی وجہ زندگی کو الوداع کہا۔

جب بچے جوان ہو جائیں تو شادی میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے چھوٹے چھوٹے فضول عذروں کی وجہ سے شادی میں تاخیر ہی معاشرے میں پھیلتی برائی کا سبب ہے۔

☆......☆......☆

"اللہ خیر کرے آج زوار اور فضل ابھی تک گھر نہیں لوٹے" تراویح پڑھ کے سیما نے گھڑی دیکھی تو پریشان ہو گئیں۔

"ماں جی ابھی تھوڑی دیر پہلے تراویح ختم ہوئی ہے آتے ہی ہونگے دونوں آپ کچھ دیر آرام کر لیں بابا اور زوار آئیں گے تو آپکو اٹھا دونگی"۔

فارینہ نے سیما کو کاندھوں سے پکڑ کے پلنگ پہ لیٹا دیا۔

"لو آ گئے"۔ دروازہ بجنے کی آواز پہ سیما بیگم اٹھ بیٹھیں۔

"آپ بھی نا" فارینہ نے مصنوعی غصے سے انہیں دیکھا۔

"السلام علیکم بابا" دروازے پر فضل صاحب کو سلام کر کے اس نے ہاتھ سے سامان لیا۔

"آج دیر کر دی آپ نے" سیما بھی فارینہ کے پیچھے آ گئی تھیں۔

"جی بیگم صاحبہ آج ختم القران تھا دعا ہو رہی تھی اس لیے تھوڑی دیر ہوگئی۔ یہ لیجیے آپ بھی کھایئے اور فارینہ بیٹا کو بھی دیجیے۔" کیک کا ایک چھوٹا سا ڈبہ فضل نے ان کے آگے بڑھایا۔

"یہ لیجیے سنبھال کے رکھیئے" فضل نے ہزار کے نوٹ سیما کو دیے۔

"یہ......؟؟" سیما بیگم نے نوٹوں کو حیرت سے دیکھا۔

"اللہ نے ایک اللہ والے کے ذریعے ہماری مدد کی ہے" فضل نے مسکرا کے بیگم کو مطمئن کیا۔

"الحمد اللہ، فضل آپ بلاوا تو دے آئے نا عزیز و اقارب کو کل چاندرات ہو سکتی ہے۔" سیما نے فکر مندی سے پوچھا۔

"جی جی بیگم صاحبہ ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ کے حکم کی تعمیل نا ہو" فضل نے مسکرا کے کہا۔

"شاید زوار آ گیا"

دروازہ بجا تو سیما نے اپنا قیاس ظاہر کیا۔

"میں دیکھتا ہوں۔"

"السلام علیکم امی بابا" زوار کے چہکنے کی آواز

صحن میں گونجی

"وعلیکم السلام جیتے رہو بیٹا"

امی مجھے ایک کوچنگ سنٹر میں جاب مل گئی ہے فی الحال 15000 ہزار تنخواہ ہے۔

میں نے سوچا کب تک اپنی ڈگریوں کے شایان شان بہترین جاب حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پہ ہاتھ دھرا بیٹھا رہوں گا۔"

مٹھائی کا ڈبہ کھول کے اس نے خوشی سے بتایا

"ماشاءاللہ مبارک ہو بیٹا" سیما نے اس کا ماتھا چوما۔

"بہت مبارک ہو برخودار" فضل بھی اسکے گلے لگ گئے۔

"بہت اچھا کیا بیٹا حلال رزق جس طرح حاصل ہو اس سے منہ نہیں موڑنا چاہیے اللہ پاک نے ہمارے لیے رزق ضرور رکھا ہوتا ہے ہم انسان ہی غلط سمت دوڑ رہے ہوتے ہیں۔" فضل نے گلاب جامن منہ میں ڈالے۔

"جاؤ بیٹا فارینہ کو بھی یہ خوشخبری سناؤ" سیما نے اسے یاد دلایا۔

وہ جو کچن کی طرف جانے کے لیے پر تول رہا تھا ماں کی بات پر فوراً سے پیشتر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

"السلام علیکم"

زوار کی آواز پہ وہ برتنوں کو خواہ مخواہ الٹ پلٹ کرنے لگی فارینہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی تھی۔

"بیگم ہم آپ کے منتظر ہیں" زوار اس کے ساتھ جا کے کھڑا ہو گیا۔

"مبارک ہو" نچلا ہونٹ دبائے اس نے نظریں نیچی کیے مبارک باد دی۔

"ارے واہ میں نے تو کچھ بتایا بھی نہیں تم نے مبارک باد بھی دے دی لگتا ہے میرے دل کا حال پڑھنے لگی ہو" زوار نے شرارت سے اس کے آنچل کو کھینچ کے کہا۔

"ماں جی ذرا کچن میں آئیے گا" فارینہ کے بلند آواز میں امی کو پکارنے پر زوار اسے غصے سے گھورتا ہوا کچن سے الٹے قدموں سے بھاگا تھا۔

☆☆......☆☆......☆☆

بادلوں کی آنکھ مچولی نے سب کو بے چین کیا ہوا تھا، بچے بڑے سب بے صبری سے چاند کا انتظار کر رہے تھے۔

افق پہ گھنی سیاہ بدلیوں کی اوٹ میں چھپا چاند یہ منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

وہ بھی آسمان پہ نظریں ٹکائے چاند کے دیدار کو بیتاب کھڑی تھی۔

"چاند مبارک" اپنے عقب سے آتی زاوور کی آواز پہ وہ اچھلی تھی۔

"ارے میں ہوں آپ کا شوہر نامدار"

"آپ کب آئے؟" سانسیں بحال کر کے فارینہ نے اسے گھورا۔

"میں پچھلے پانچ منٹ سے یہاں موجود ہوں آپ چاند کو ڈھونڈنے میں مصروف تھیں جبکہ آپ کا چاند ادھر کھڑا ہے۔"

زاور نے مسکرا کے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"فارینہ چاند رات مبارک"

زاور نے اس کا ہاتھ تھام کے کہا۔

فارینہ نے نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں اس کے لئے محبت کا ایک جہاں آباد تھا۔

اور وہ محبت خلوص و پیار کے دیپ جلائے بس اسی کی منتظر تھی۔

"آپ کو بھی مبارک"

فارینہ نے مسکرا کے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

فلک پہ چمکتا چاند محبت کے اس ملن پہ مسکرا دیا۔

☆☆......☆☆......☆☆

مکمل ناول

نسیم آمنہ

توبہ

''میں وعدہ کرتی ہوں، کوئی اچھا موقع دیکھ کر خود بیٹھ کر بات کروں گی، اپنے باپ کے مزاج کو تو جانتی ہو۔ ابھی وہ ضد میں آجائے گا۔'' اُس نے اب بھی نور شیر کو کچھ کہنے کی کوشش کی تو تھی کہ گل پری اِس رشتے پر راضی نہیں ہوگی مگر اُس نے سُننے کی......

ہاجرہ سمجھ نہ پاتی تھی کہ نیلماں کو دیکھ کر نور شیر کی آنکھوں میں یہ کیسی چمک آجاتی ہے۔ وہ اس چمک کو کوئی نام نہ دے پاتی تھی۔ کیا ہوتا تھا اُن آنکھوں میں محبت، حسرت، رشک، ہوس......!

مگر نہیں، کوئی اپنی ہونے والی بھرجائی پر ایسی نظر کیسے ڈال سکتا تھا جو عمر میں اُس کی اپنی بیٹی کے برابر ہو، جو اُس کے لاڈلے چھوٹے بھائی کی منگ ہو اور بھائی بھی وہ کہ جسے اُس نے اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہا ہو۔

اُس کی اپنی سگی بیٹی گل پری تو باپ کی شفقت بھری نگاہ کے لیے ترستی رہ جاتی تھی مگر نور شیر بس اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر سرسری سا حال چال پوچھ کر آگے بڑھ جاتا جیسے باپ ہونے کا فرض ادا کر دیا ہو۔ اپنا سارا پیار وہ فلک شیر پر لٹاتا تھا۔ اُس کے منہ سے نکلی ہر خواہش پوری کرتا تھا۔

فلک شیر اُس سے کوئی پچیس برس چھوٹا تھا باپ کے مرنے کے بعد نور شیر نے مکمل طور پر اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ فلک شیر اُس وقت خاصا کم سن تھا۔ منجھلا بھائی نور حسن اپنے بیوی بچوں میں مگن تھا۔ اُسے گھر بیٹھے زمین کی آمدنی سے اپنا حصہ مل رہا تھا کسی دوسری ذمہ داری سے اُسے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ اُس کی بیوی شاکرہ بھی لیے دیے رہنے والی مغرور سی عورت تھی۔ اُسے اپنے میکے والوں کی امارات پر بڑا مان تھا۔ نور حسن بیوی سے خاصا دبتا تھا۔ شاکرہ نے صاف کہہ دیا کہ اُس سے کوئی امید نہ رکھی جائے۔ اُس کے اپنے بکھیڑے کچھ کم نہیں ہیں، تین بیٹیاں، ایک بیٹا، اُن کی دیکھ بھال کر لے یہی بڑی بات ہے، نور حسن نے ہاں میں ہاں ملائی۔

بہنیں دونوں بیاہی تھیں اور اپنے سُسرالیوں کی مرضی کی تابع تھیں۔ نور شیر نے ہاجرہ سے مشورہ لینے کی چنداں ضرورت نہ سمجھی اور فلک شیر کو گھر لے آیا۔ اگر وہ مشورہ لیتا بھی تو ہاجرہ میں اختلاف کی جرأت کہاں تھی۔ نور شیر نے اُسے اتنی اہمیت دی ہی کب تھی۔ وہ یہ رشتہ یوں نبھا رہا تھا جیسے کوئی گلے میں زبردستی پڑا

ڈھول بجاتا ہو۔ احسان کا بوجھ الگ دھرتا تھا۔
یہ شادی اُس نے ماں باپ کی قسموں سے مجبور ہو کر کی تھی اور پھر برادری کا معاملہ تھا۔ دونوں کے باپ بچپن کے گہرے دوست تھے۔ اِس یاری کو رشتہ داری میں بدلنے کے لیے انہوں نے بچوں کی کم عمری میں ہی اُن کے رشتے طے کر ڈالے۔ جوان ہو کر نور شیر نے رسہ تڑانے کی بہت کوشش کی تھی مگر ناکام رہا پھر اور کسی پر بس نہ چلا تو سارے بدلے ہاجرہ کی ذات سے چکائے۔ وہ فطرتاً حسن پرست تھا۔ نور بھی اونچا لمبا خوبرو جوان تھا۔ معمولی شکل وصورت کی ہاجرہ بی بی اس کے دل میں اُتر ہی نہ سکی۔ نور بڑی دبنگ شخصیت کا مالک تھا۔ مضبوط ڈیل ڈول، بھاری رعب دار آواز، گھنی مونچھیں، پورے خاندان پر اُس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ چھوٹے بہن بھائی باپ کا درجہ دیتے تھے۔ خاندانی معاملات میں اُس کا فیصلہ حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا۔ زمینداری وہی سنبھالتا تھا۔ سب بہن بھائیوں کے دُکھ سکھ میں کام آتا تھا۔ وہ ایک اچھا منتظم، اچھا بھائی ضرور تھا۔ شاید کسی حد تک اچھا باپ بھی کہ گل پری کی تمام ضروریات وقت پر پوری ہوتی تھیں۔ مگر ایک اچھا شوہر کبھی نہ بن سکا۔ ہاجرہ کی ذات کی نفی کر کے اُس کے مردانہ اَنا کو تسکین ملتی تھی۔

شوہر کی الفت ویگانگت ہاجرہ کے لیے ایک خواب ہی رہی۔ اُس کی شکل وصورت اور خاندان کی کم حیثیتی کا طعنہ دینا نور شیر کے لیے ایک معمول کی بات تھی۔ شومئی قسمت گل پری کے بعد ہاجرہ کی کوئی اور اولاد نہ ہو سکی۔ سو یہ بھی اُس کی کوتاہی ٹھہری۔ نور شیر کو ہر روایتی مرد کی طرح بیٹے کی شدید تمنا تھی اِس محرومی کو کم کرنے کے لیے اُس نے فلک شیر کو بیٹے کی طرح پالا تھا وہ ہاجرہ پر احسان جتاتا تھا کہ اُس نے وارث کے لیے دوسری شادی نہیں کی حالانکہ یہ اُس کا حق تھا۔

وہ دوسری عورت تو نہیں لایا مگر دوسری عورت پر تو کوئی پابندی نہیں تھی۔ ایک کے بعد ایک اُس کی زندگی میں کئی عورتیں آئیں اور چلی گئیں۔ لوگ اس کی رنگین مزاجی کے قصے چٹخارے لے کر سناتے تھے۔ ہاجرہ نے جب کبھی احتجاج کیا دو چار ہاتھ سہنے پڑے۔ تھک ہار کر وہ دل پر پتھر رکھ کر صبر کر گئی۔

دوسروں کے سامنے نظریں جھکا کر اپنے سر کے سائیں کی تعریف کر کے بھرم قائم رکھتی آنکھ اس لیے نہ اٹھاتی کہ کہیں وہ اُس کا جھوٹ پکڑ نہ لیں۔ جوانی کی دیوانگی کا دور اب گزر چکا تھا۔ اِس ادھیڑ عمری میں نور شیر میں ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ ہاجرہ بھی مطمئن ہو گئی تھی مگر اب لگتا تھا جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں کسی نے پتھر پھینک کر ہلچل پیدا کر ڈالی ہو۔ بجھی ہوئی راکھ میں کوئی چنگھاری سلگ پڑی ہو۔ شوہر کی رگ رگ کو پہچاننے والی ہاجرہ اُس کی اس نظر کو پہچان کر بھی انکاری تھی۔ وہ اِسے اپنا وہم سمجھ کر جھٹلانا چاہتی تھی۔ غلط فہمی، نظر کا دھوکہ اور کچھ نہیں۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کا شک ایک ایسی آگ کو ہوا دے جو اُس کے گھر کو خاک کر ڈالے۔ دونوں بھائیوں میں دشمنی کی ایسی بنیاد پڑے جس کا انجام خون ریزی ہو۔

یوں بھی وہ اِن دنوں گل پری کی وجہ سے پریشان تھی۔ شوہر کی بے توجہی کی ماری ہاجرہ نے اپنے وجود کی تمام تر محبت گل پری پر لٹا دی تھی۔ وہی اُس کی امیدوں کا مرکز تھی۔ اُس کی بے

رنگ زندگی کے لیے بہار کا جھونکا تھی۔ گل پری کا نام اُس نے بڑے چاؤ سے رکھا تھا وہ اُس کے لیے گل سی نازک اور پریوں سی پیاری تھی۔ گل پری بھی ماں سے بہت محبت کرتی تھی۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اُس کی پیاری پیاری تتلاتی ہوئی باتیں ہاجرہ کا دل موہ لیتی اُس کی ساری اُداسی ختم کر لیتی تھیں۔ پھر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی ماں کی سکھی سہیلی بنتی گئی۔

گل پری نے رنگ و روپ باپ کا لیا تھا تو ضد اور نڈر پن بھی ورثے میں ملا تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ جو جی میں آتا وہ کرتی تھی۔ وہ ماں کی طرح معصوم اور حساس بھی تھی۔ نور شیر فلک شیر کو اُس پر ترجیح دیتا تو وہ یہ ناانصافی برداشت نہ کر پاتی تھی۔ اپنی ماں کے ساتھ اُس کا برتاؤ بھی اُسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس کے پاس سوالوں کی ایک پٹاری تھی۔ جس میں سے وہ سوالات نکال نکال کر ماں کی طرف پھینکتی تھی اور اُسے اُن سب سوالوں کے جواب بھی چاہیے ہوتے تھے۔

''بابا مجھ کو پیار کیوں نہیں کرتا؟ بابا دیر سے گھر کیوں آتا ہے؟ بابا میرے لیے کھلونے کیوں نہیں لاتا؟ بابا تم سے جھگڑتا کیوں ہے؟ بابا فلک شیر کو گھمانے لے جاتا ہے مجھے کیوں نہیں؟''

ہاجرہ رسان سے سنبھل سنبھل کر ایک ایک سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتی۔ جب کوئی بات نہ بنائی جاتی تو تنگ آ کر ہاتھ جوڑ دیتی کہ ''میری ماں اتنا مت بولا کر لڑکیوں کے لیے اتنا بولنا اچھا نہیں۔''

''تم تو کہتی ہو لڑکیوں کے لیے اتنا ہنسنا بھی اچھا نہیں۔'' ہاجرہ اثبات میں سر ہلاتی تو وہ بولتی۔

''پھر تم کہو گی کہ لڑکیوں کے لیے سانس لینا بھی اچھا نہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ جان بوجھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ ہاجرہ جتنا اُسے ٹوکتی تھی اتنا ہی وہ کھل کر ہنستی تھی۔ قلقل کرتی ہنسی جھرنوں کی طرح اُس کے لبوں سے پھوٹتی اور چاندنی کی طرح اُن کے آنگن میں بکھر جاتی جو مدت سے اپنی مالکن کی چوڑیوں کی چھنکار اور اُس کے لبوں کی سچی ہنسی سے محروم تھا۔ ہاں وہ اپنے ہونٹوں پر بناوٹی ہنسی خوب سجانا جانتی تھی۔ محلے والوں میں سے کوئی ہمدرد عورت یا خاندان کی بڑی بوڑھی ہمدردی جتانے کی کوشش کرتی تو وہ یوں بھولی بن جاتی جیسے دور دیس میں رہنے والی کسی انجان عورت کے زخموں کو چھیڑا جا رہا ہو۔

گل پری کی ہنسی ہاجرہ کو خوف زدہ کرتی تھی یہ نہیں تھا کہ وہ اُس سے حسد کرنے لگی تھی بلکہ وہ اِس کے انجام سے ڈرتی تھی۔ وہ جوان ہوتی بیٹی کے تیور دیکھ کر خائف رہتی تھی۔ اُس نے تو صبر شکر سے جیسے تیسے اپنا وقت گزار لیا تھا اور اپنی دانست میں اچھا ہی گزارا تھا گھر میں روپیہ پیسہ نوکر چاکر کی کمی نہ تھی، خاندان میں عزت تھی مگر گل پری کسی سمجھوتے کی قائل نہ تھی۔ وہ باپ کے غصے اور ظاہری فوں فاں سے ڈرنے اور دبنے والی نہیں تھی، اپنے حق کے لیے لڑنا جانتی تھی۔ اکثر باپ کے سامنے احتجاج کرنے کھڑی ہو جاتی تھی اور اپنی منوا کر ہی چھوڑتی تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ ماں کو ڈرنے کا شوق ہے تو ڈرتی رہے۔ یہ اُس کی اپنی کمزوری ہے۔ مگر وہ کمزور نہیں ہے، کھری بات کہے گی۔ ہاجرہ اُسے باپ کے ڈراوے دیتی مگر وہ چٹکیوں میں اُڑا دیتی تھی۔

نور شیر بظاہر گھر کے معاملات سے کتنا بھی

لاتعلق سہی مگر بیٹی کی اٹھان دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے پرواز سے پہلے پر کتر لینے کی ٹھانی اور اچانک ہی اُس کا رشتہ نور حسن کے بیٹے میر حسن کو دینے کا اعلان کر ڈالا وہ دونوں ماں بیٹی اِس فیصلے پر حیران پریشان رہ گئیں۔ خاص کر گل پری کا بُرا حال تھا۔ چہکتی مینا کو چپ لگ گئی تھی۔ اُس نے شاہ در کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ بچپن کا بھولپن جوانی کے بانکپن میں ڈھلا تو اُسے احساس ہوا کہ اُس کا دل صرف شاہ در کے نام پر ہی دھڑکتا ہے۔

''نور شیر نے ہاجرہ کو حکم دیا کہ لڑکی اب سیانی ہو چکی ہے۔ آنکھیں کھلی رکھا کرو مجھے اِس کا لڑکوں سے گھلنا ملنا پسند نہیں۔'' اُس کا اشارہ شاہ در کی طرف ہی تھا۔ گل پری تو میر حسن کے سائے سے بھی دور بھاگتی تھی۔ گل پری اِس پابندی کو خاطر میں نہ لائی۔ بچپن کی دوستی بھی اب اچانک کیا ہو گیا تھا۔ شاہ در کو دن بھر کی روداد سنائے بغیر اُس کا تو کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ عشق کی وادی میں قدم رکھ دیا تھا اب چاہے سر رہے یا کٹے اُسے انجام کی پرواہ نہیں تھی۔ ہاجرہ سب جانتی تھی۔ اُس نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

اب گل پری ہاجرہ سے ناراض تھی کہ اُس نے اتنا انتظار کیوں کیا ہاجرہ تو خود یہ کوشش کرنے میں لگی تھی کہ کسی طرح نور شیر سے بات کرنے کی ہمت کر سکے مگر اُس سے پہلے اُس نے اپنا یہ فیصلہ سنا ڈالا تھا۔

گل پری کی میر حسن سے کبھی نہ بنی تھی۔ شاکرہ کے بچے مزاجاً اُسی پر گئے تھے۔ شاکرہ بھی جہاں ہاجرہ کو خود سے حقیر سمجھتی تھی وہاں گل پری کے شاہانہ مزاج پر سو سو باتیں بناتی تھی۔

ہاجرہ نے گل پری کے آگے ہاتھ جوڑ کر اُسے باپ کے سامنے زبان کھولنے سے روکے رکھا تھا۔ جانتی تھی کہ وہ اِس وقت جذبات میں کچھ بھی اُلٹا سیدھا بول دے گی بات بننے کی بجائے بگڑ ہی جائے گی۔ نور شیر نے کل کی بجائے آج ہی اُس کا ہاتھ پکڑ کر رخصت کر لینا تھا۔

''میں کوئی تمہاری طرح موم کی گڑیا ہوں کہ بابا ہاتھ پکڑ کر رخصت کرے گا اور میں ہو جاؤں گی۔ میں اُس کے محل کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گی، دیکھ لینا۔'' گل پری کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اُس کی ذہنی کیفیت دن بدن عجیب ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی ماں سے اُلجھتی، اونچا اونچا بولتی، کبھی روتی، کبھی ہنستی، کبھی گھنٹوں چپ پڑی رہتی۔ ماں کی ساری زندگی ایک مثال کی طرح اُس کے سامنے تھی۔ وہ اِس فیصلے کو قسمت کا لکھا سمجھنے اور زبردستی کا یہ طوق گلے میں ڈالنے پر ہرگز راضی نہیں تھی۔ ہاجرہ فی الوقت اُس سے مہلت چاہ رہی تھی۔

''میں وعدہ کرتی ہوں، کوئی اچھا موقع دیکھ کر خود بیٹھ کر بات کروں گی، اپنے باپ کے مزاج کو تو جانتی ہو۔ ابھی وہ ضد میں آ جائے گا۔''
اُس نے اب بھی نور شیر کو کچھ کہنے کی کوشش کی تو تھی کہ گل پری اِس رشتے پر راضی نہیں ہو گی مگر اُس نے سُننے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ وہ فیصلہ سنانے والوں میں سے تھا۔ حُجت سننے والوں میں سے نہیں۔''

مگر دوسری طرف گل پری بھی تو اُسی کی بیٹی تھی۔ ضدی اور ہٹیلی، ہاجرہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ جاتی تھی۔

''تو نے سمجھایا اور بابا سمجھ گیا، واہ ری خوش فہمی...... بابا کا غصہ دیکھ کر تیری آواز نہیں نکلتی

بات کیا ہوگی۔ اور تجھے ڈھنگ سے بات کرنا آتا
کہاں ہے؟ بنتے کام کو بگاڑ ہی دو گی۔ پھر مجھے کہو
گی اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ صبر کرو...... تجھے صبر کر
کے کیا مل گیا ماں...... مجھ میں تجھ جتنا حوصلہ نہیں
ہے۔ چاچی کو دیکھا ہے مجھے کن نظروں سے
دیکھتی ہے۔ جیسے قصائی بکری کو دیکھتا ہے۔ اگلے
پچھلے سارے حساب چکائے گی۔ بچپن سے لے
کر میں نے آج تک اُسے جتنا تنگ کیا اُس کے
سارے بدلے لے گی۔ اُس کی بیٹیاں بھی ایک
سے بڑھ کر ایک چغل خور، چڑیلیں، خون پی
جائیں گی وہ میرا...... شروع ہی سے جلتی ہیں۔
اور وہ میر حسن وہ تو بابا کی دوسری کاپی ہے۔ ایک
آنکھ نہیں بھاتا مجھے، میں اُن کے گھر ایک دن
نہیں رہ سکتی۔ ساری زندگی کیسے رہ پاؤں گی۔
میرا دم وہیں گھٹ جائے گا۔ بس تو بابا کو میری
طرف سے ناں کہہ دے۔ ورنہ میں تو کہہ ہی
دوں گی۔'' گل پری جوشِ جذبات میں بولنے پر
آتی تو بولتی ہی چلی جاتی تھی۔ ہاجرہ کو تو وہ ہمیشہ
ہی لاجواب کر دیا کرتی تھی۔

ہاجرہ جانتی تھی کہ وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے
آخر گل پری کو صبر آ ہی جائے گا۔ اُس نے بھی تو
نور شیر جیسے مشکل شخص کے ساتھ زندگی کے اتنے
سال گزار لیے تھے مگر وہ یہ بات ابھی گل پری
سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ سُن کر اور بھڑک جاتی یہ
فرق ضرور تھا کہ وہ نور شیر کی تمام تر جفا کاریوں
کے باوجود دل ہی دل میں اُس سے محبت کرتی
تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی اپنے نام کے ساتھ اُس
کا نام جڑا پایا تھا اور گل پری کو میر حسن سے کوئی
دلچسپی نہیں تھی۔ اپنی چچی کی تنقیدی نظروں، چبھتے
جملوں اور میر حسن کے چھچھورپن سے اُسے سخت
چڑ تھی۔ اپنی چچا زاد بہنوں سے بھی اُس کی کبھی نہ
بنی تھی۔

کچھ اُن لوگوں کا زعم، بناوٹی شان و شوکت
کچھ اُس کے اپنے مزاج کا تیکھا پن، تعلقات
میں ہمیشہ تناؤ سا رہا تھا۔ شاکرہ بی بی کو اپنے
خاندان اور حسن اپنی گوری چٹی رنگت کا غرور تو تھا
مگر اندر ہی اندر وہ ہاجرہ سے حسد بھی کرتی تھی۔
اول تو روپیہ پیسہ سارا نور شیر کے ہاتھ سے گزر کر
آتا تھا۔ اِس طرح خاندان میں ہاجرہ کا رتبہ ذرا
بڑھ کر تھا اور پھر نور شیر کی ماں بہنیں اُس کی
خدمت گزاری اور سلیقہ مندی کی تعریفیں کرتی
رہتی تھیں۔ نور شیر کی ماں اُسے دعائیں دیتی دنیا
سے رخصت ہوئی تھی۔ شاکرہ سے یہ برداشت نہ
ہوتا تھا مفت کا بیر باندھ لیا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا میری جنڈری ابھی
ذرا ٹھہر تو سہی۔'' گل پری کو بہلائے بغیر ہاجرہ
کے پاس چارہ نہ تھا۔

''ابھی تو تیرے بابا نے ایک بات ہی کی
ہے کوئی بارات تو دروازے پر نہیں آ کھڑی
ہوئی۔''

''وہ بھی دروازے پر آئے گی شادیانے
بجیں گے اور تم کچھ بھی نہیں کر سکو گی۔ مت کہا کرو
مجھے اپنی جان، اپنی زندگی۔ تمہیں اپنی تو کوئی فکر
نہیں میری کیا خاک ہوگی۔ اگر تم نے اپنا حق مانگا
ہوتا۔ پہلی بار ہی بابا کا اٹھا ہاتھ روکا ہوتا تو آج
ایسا نہ ہوتا۔ آج تمہاری بھی اُس کی نگاہ میں کوئی
حیثیت ہوتی، تمہاری بات میں بھی کوئی وزن
ہوتا۔''

شاکرہ بی بی کے بقول گل پری نے چار
کتابیں کیا پڑھ لی تھیں۔ اُسے بڑی بڑی باتیں
کرنی آ گئی تھیں۔ اسی لیے تو وہ لڑکیوں کی تعلیم
کے خلاف تھی۔

''تم عورتوں نے خود اپنے آپ کو کم تر بنایا ہے ورنہ اللہ نے اُس کے حقوق بھی پورے رکھے ہیں۔ اُسے عزت اور پیار دینے کا کہا ہے مگر تم سے تو وہ بھی نہیں مانگا گیا۔'' ہاجرہ سوچ میں گم ہوگئی۔ جو حقوق مانگنے سے ہی ملیں وہ تو پھر بھیک ہوئی۔ ابھی وہ نور شیر کے سامنے اتنا تو نہیں گری تھی کہ اُس سے بھیک مانگتی۔

''شاکرہ چاچی جیسی عورتیں بھی تو ہیں کسی کی کیا مجال ہے جو اُسے اُلٹا سیدھا کہہ سکے۔ چاچا کے ایک ایک پل کا حساب رکھتی ہے...... اور تم...... بابا ڈیرے پر عورتیں لاتا رہا اور تم نے ہونٹ سی رکھے، کیوں ماں کیوں؟'' گل پری اُس سے سو سو سوال کرتی تھی۔ یہ سوال کبھی نہ کیا تھا۔ ہاجرہ ایک لمحے کے لیے سُن ہوگئی شرم و خفت سے چہرہ سرخ ہونے لگا۔

بیٹی باپ کی سرگرمیوں سے بے خبر نہیں تھی بس لحاظ کا پردہ رکھا ہوا تھا۔ نور شیر کو اپنی من مانیوں میں کسی چیز کا ہوش کہاں رہتا ہے۔ گل پری کے متنفر ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ لحاظ کا یہ پردہ اگر باپ کے روبرو ٹوٹ جاتا تو کیسا طوفان آتا یہ سوچ کر ہی ہاجرہ کو جھرجھری آگئی۔

''تم نے اپنی زندگی تو برباد کر ہی ڈالی اب چاہتی ہو کہ میں بھی ایسا ہی کروں۔ ایک غلط فیصلے کی بلی چڑھ جاؤں، تم تو سب کچھ جانتی ہو۔ پھر بھی......!'' گل پری کو اُس سے ہزاروں شکوے تھے۔ وہ ہاجرہ کو بہت مضبوط دیکھنا چاہتی تھی، چاہتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کی ڈھال بنے مگر ہاجرہ کے لیے یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔

اُس نے نظریں چرالیں۔ نور شیر تو یہ بات سُننا بھی گوارا نہ کرتا۔ گل پری کو کوئی کیسے سمجھائے کہ وہ اُس کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

''اچھا تو پھر مجھ سے کچھ کہنے کی بجائے اُسی سے مانگ جس سے مانگنا چیتا ہے۔'' اُس نے تنگ آکر آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

''تو اُس کے در پر سجدے کر کر کے، سر پٹخ پٹخ کر تھک گئی۔

''اُس نے تیری سُن لی جواب میری سنے گا۔'' ''میں کہاں کی ولی ہوں۔'' گل پری آج دنیا جہاں سے برگشتہ تھی۔

ہاجرہ دہل کر رہ گئی۔ ''کفر مت بول۔'' گل پری مچل گئی۔

''اماں میں کیا کروں، میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو آج بابا بستر پر پڑا ہوتا۔ اُس نے جب جب تجھ پر ہاتھ اٹھایا میں نے تب تب اُس کے ہاتھ ٹوٹنے کی دعا مانگی مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ خدا میری نہیں سُنتا، بالکل بھی نہیں سنتا۔''

ہاجرہ باپ کے لیے اُس کے لہجے کی سفاکی پر ششدر رہ گئی۔ نور شیر کی سیاہ کاریوں نے اُس کی بیٹی کے ذہن پر گہرے نقش چھوڑے تھے۔ اُس کے دل میں نفرت کا زہر بھر دیا تھا۔

شاہ در کی محبت اِس زہر کا تریاق تھی مگر نور شیر اُس کی زندگی کی یہ واحد خوشی بھی اُس سے چھین لینا چاہتا تھا۔

شاہ در کوئی غیر نہیں ہاجرہ کا سگا بھتیجا تھا۔ گل پری کے بچپن کا سنگی ساتھی مگر نور شیر اُس سے غیروں سے بھی برا سلوک کرتا تھا۔ اُسے ہاجرہ کے سارے خاندان سے بغض تھا اور انہیں خود سے کم تر گردان کر زیادہ مل جول رکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔

ہاجرہ کے بھائی کے پاس زیادہ روپیہ پیسہ نہ سہی خلوص و محبت کی کوئی کمی نہ تھی۔ شاہ در بھی

پڑھا لکھا لائق نوجوان تھا۔ اپنی پھوپی سے اُسے بڑی محبت تھی اور پھوپی زاد سے اُنسیت جو جوانی کی سرحد عبور کرنے تک پیار میں بدل چکا تھا۔ وہ شہر میں زیرِ تعلیم تھا۔ جب بھی گاؤں آتا پھوپی سے ملنے کے بہانے چکر ضرور لگاتا تھا۔

نور شیر مروت میں اُسے اپنے گھر آنے سے صاف صاف منع تو نہیں کر پایا تھا مگر اُس سے سیدھے منہ بات کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ اُس کا سرد اور خشک رویہ دیکھ کر شاہ در نے خود ہی احتیاط کرنی شروع کر دی۔

نور شیر کے اصل عناد کی وجہ کچھ اور تھی وہ اُس خاندان سے دوبارہ تعلق نہیں جوڑنا چاہتا تھا۔ ہاجرہ اپنے میکے کی حمایت میں کبھی کچھ کہتی تو زہر میں بجھے چند جملے اُسے خاموش کرا دیتے تھے۔ نور شیر جہاندیدہ مرد تھا دونوں کی پسندیدگی بھانپ چکا تھا اس لیے حد بندی کے طور پر گل پری کی نسبت طے کر ڈالی۔ وہ تو چٹ منگنی پٹ بیاہ کر کے قصہ ہی نپٹا لیتا کہ بیچ میں فلک شیر نے اپنا رولا ڈال دیا۔

نور شیر کے لاڈ پیار نے فلک شیر کو بگاڑا نہیں تھا وہ بڑا سعادت مند اور بیبا نوجوان تھا مگر پھر بہت کچھ بدل گیا۔ نیلماں اتفاقاً ہی اُس سے ٹکرائی تھی اور کچھ ایسی ٹکرائی کہ اُس کی نیند، چین آرام بھوک پیاس، دل و دماغ سب لوٹ گئی۔ فلک شیر نے ضد پکڑی کہ شادی کرنی ہے تو صرف اور صرف نیلماں سے...... پیاری نیلو...... سے

ایک ہنگامہ سا کھڑا ہو گیا۔ خاندان میں کوئی بھی اِس رشتے پر تیار نہ تھا۔ خاص طور پر نور شیر تو بالکل بھی نہیں۔ اُن لوگوں کا تعلق قریبی گاؤں سا تھا غیر برادری تھی۔ معمولی سا رہن سہن اور کچھ ایسے نیک نام بھی نہیں تھے۔ خاندان کے لڑکے بدمعاشیاں کرتے دندناتے پھرتے تھے۔ لڑکیاں فیشن میں ماہر اور خاصی تیز طرار مشہور ہیں۔ ہاں حسن کی بہتات تھی۔ جس کی وجہ سے دل پھینک نوجوانوں میں وہ گھرانا کافی مشہور تھا۔ اِس شہرت پر فلک شیر حامی بھرتا بھی تو کیسے اُسے اپنی خاندانی نجابت پر بڑا ناز تھا ایسے لوگوں کو تو وہ منہ لگانا بھی پسند کرنا چہ جائیکہ رشتہ مانگنے اُن کی دہلیز پر جانا، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

فلک شیر کو اُس نے ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر پالا تھا۔ سینت سینت کر، سنبھال سنبھال کر کہ کہیں اُسے آج کے دور کی ہوا نہ لگ جائے۔ فلک شیر بھی سیدھا سادا بھولا بھالا سا تھا۔ اُس میں آج کل کے لڑکوں جیسی کوئی برائی، کوئی تیزی نہیں تھی۔ نور شیر کی ہر بات مانتا تھا مگر اس بار جانے کیا ہو گیا تھا۔

نور شیر کی مخالفت، سمجھانا بجھانا کچھ بھی کام نہ آیا فلک شیر بھی اپنے نام کا ایک نکلا، ضد پر اڑا رہا۔ منت سماجت، حجت بازی، رونے دھونے، خوشامد سے کام نہ چلا تو اُس نے اپنا آخری حربہ آزمایا۔

بھوک ہڑتال کر دی۔ چند ہی دنوں میں نڈھال ہو گیا۔ اتنا سا منہ نکل آیا۔ نقاہت کے مارے، بولنا دوبھر ہو گیا۔ مجنوں بنا پڑا رہتا، وہی ایک ہی رٹ کہ مرتا مر جاؤں گا اپنی بات سے نہ ہٹوں گا۔ نیلماں کو زبان دی ہے۔

اُس کی یہ حالت دیکھ کر نور شیر کی جان پر بن گئی پہلے تو غصے میں نیلماں کی ایسی تیسی کرتا رہا مگر پھر جب فلک شیر پر غشی کے دورے پڑنے لگے تو اُسے ہتھیار ڈالتے ہی بنی با دل نخواستہ اُسے رشتہ لے کر جانے کی حامی بھرنی ہی پڑی جو جتنا کھوکھلا ہوتا ہے اتنا ہی بجتا ہے۔ لڑکی والوں کی شرط تھی

کہ انہیں پوری عزت دی جائے اور سارے معاملے حسب دستور طے کیے جائیں۔

اُس کے بعد وہ لوگ تو جیسے انتظار میں بیٹھے تھے۔ نور شیر کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پہلی ہی نشست میں بات پکی ہوگئی۔ منگنی کی انگوٹھی کے تبادلے ہوگئے۔ نور شیر واپس لوٹا تو یہ اعتراف کرنے پر مجبور تھا کہ لڑکی واقعی بہت خوبصورت اور طرحدار ہے۔ تھوڑی سی مغرور ہے مگر یہ غرور اُس پر جچتا ہے۔ باقی باتیں بھی بقول اُس کے سنی سنائی تھیں۔ لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے باتیں بنانے ورنہ وہ لوگ اتنے بھی برے نہیں جتنا سُنا تھا۔ سطحی سا گھرانہ ضرور ہے مگر لڑکی اچھی ہے۔

یہ سند ملنے کے بعد تو فلک شیر کے پیر زمین پر نہ پڑتے تھے، اترایا اترایا پھرنے لگا۔

گل پری اپنا غم بھول کر چچا کی سادگی پر حیران ہوتی تھی۔ نیلماں کے حوالے سے کتنی عجیب عجیب سی باتیں تو خود اُس نے سُن رکھی تھیں۔ عورتیں آ کر بتاتی تھیں کہ کافی مزاج دار ہے اُس کے خواب بڑے اونچے ہیں خود کو فلمی ہیروئن سمجھتی ہے۔ فلک شیر جیسے سیدھے سادھے بندے کا اُس کے خوابوں میں کوئی گزر نہیں تھا۔ یہ رشتہ اُسے پسند نہ آیا تھا مگر پھر شاید اپنے گھر والوں کے دباؤ پر یا پھر پیسے کی چمک دمک دیکھ کر راضی ہوگئی۔ اب خوش تھی یا مطمئن یہ بتانا مشکل تھا۔ مگر اپنی شادی کی تیاریوں میں ضرور لگی تھی۔

گل پری نے جب نیلماں کو دیکھا تو پہلی نظر میں ناپسند کرلیا۔ وہ ہوشیار سی لڑکی اُسے اپنے بیچارے سے چچا کے لیے بالکل بھی موزوں نہ لگی تھی مگر اُس کی سُنتا کون عمر کے زیادہ فرق نہ ہونے کی وجہ سے وہ فلک شیر سے کافی حد تک بے تکلف تھی۔ وہ بھی اپنے دل کی بات کرلیا کرتا تھا

مگر اب نیلماں کے آنے کے بعد فلک شیر کے پاس نہ اُس کے لیے وقت بچا تھا اور نہ پہلے سی توجہ، اُسے نیلماں کے علاوہ اور کچھ سوجھائی نہیں دیتا تھا۔

اُس کی گفتگو نیلماں سے شروع ہو کر نیلماں پر ختم ہوتی تھی۔ وہ نیلماں کے خلاف کچھ سُن نہیں سکتا تھا۔ کچھ کہو تو جذباتی ہوجاتا تھا۔ اُس کا حال اُس بچے سا تھا جسے اپنا من پسند کھلونا مل گیا ہو جسے وہ سینے سے لگائے پھرتا ہو۔ گل پری مذاق میں بھی نیلماں کے بارے میں کچھ کہتی تو بُرا مان جاتا۔ ہاجرہ کے روکنے ٹوکنے پر گل پری نے اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

فلک شیر کے قصے میں وقتی طور پر گل پری کا معاملہ دب گیا تھا۔ ہاجرہ خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ فی الحال تو سر پر ٹنگی تلوار ٹل گئی تھی۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ کیا پتہ کوئی معجزہ ہی ہوجائے۔ یہ رشتہ اُسے بغیر کسی معجزے کے ہوتا دکھائی تو نہیں دیتا تھا۔ نور شیر کے سامنے اپنے میکے کی حمایت میں جب بھی کچھ کہنے کی کوشش کی تھی منہ کی کھائی تھی۔

ہاجرہ کے بھائی کی بڑے بازار میں کپڑے کی اچھی خاصی چلتی دکان تھی مگر نور شیر کی نگاہ میں وہ بزاز تھا۔ جبکہ نیلماں کو وہ سر آنکھوں پر بٹھا رہا تھا۔ گھر میں فلک شیر کے بعد اب نیلماں کا سب سے بڑا حمایتی نور شیر ہی تھا۔ نیلماں حد سے زیادہ پُراعتماد نکلی اپنی ہونے والی سُسرال بے دھڑک آنے لگی تھی۔ یہاں اپنی شادی کی تیاری میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔

وہ نور شیر جس کا دبدبہ پورے خاندان میں مشہور تھا اُس کے سامنے ایکدم موم پڑ جاتا تھا۔ نیلماں کافی منہ پھٹ تھی اور اُس کی بدتمیزی کو

چھوٹی صاف گوئی کو خود شیر ''ذرا سی شوخ ہے..... بچی ہے ابھی۔'' کہہ کر ٹال جاتا اور وہ بچی ہاجرہ کی نظروں کے سامنے دو دو جوان مردوں کو اپنی انگلیوں پر نچا رہی تھی۔ دونوں ہر بات میں اُس کی پسند ناپسند کو ترجیح دیتے تھے۔ فلک شیر تو فلک شیر، نور شیر بھی کپڑے، لتے، زیور وغیرہ کے معاملے میں اُس کے ذوق کی تعریف کرتا تھا۔ گھر کے رنگ و روغن تک میں اُس کی رائے لی گئی تھی۔ وہ جب بھی آتی فرمائشی کھانے پکتے، ہاجرہ کا سارا دن چولہے کی نذر ہو جاتا۔

اتنی زیادہ پذیرائی پر نیلماں کو ساتویں آسمان پر پہنچنا ہی تھا۔ شروع شروع میں دنیا دکھاوے کے لیے اُس کا کوئی نہ کوئی چھوٹا بھائی یا بہن ساتھ آتے تھے کہ لوگ معیوب نہ سمجھیں مگر پھر جب نیلماں نے پیر جما لیے تو یہ تکلف بھی جاتا رہا۔ وہ شادی سے پہلے ہی سے گھر میں مالکانہ استحقاق جتانے لگی تھی کبھی ملازماؤں پر حکم چلاتی کبھی گل پری کو کسی بات پر ٹوک دیتی کبھی ہاجرہ کی کسی بات میں اختلاف کا پہلو نکال لیتی ہاجرہ جز بز ہو کر رہ جاتی۔ گل پری تو پہلے ہی خلاف تھی اب اور بھی کترانے لگی وہ اُس کے آنے پر کسی نہ کسی بہانے کمرے میں بند ہو جاتی تھی۔ نیلماں محسوس کرتی تھی اور جتاتی بھی تھی مگر گل پری کو اُس کی پروا نہیں تھی وہ اپنی مرضی کی مختار تھی کسی سے ملنے کو دل نہیں چاہے گا تو نہیں ملے گی، کوئی بات غلط لگے گی تو ضرور کہے گی۔

نور شیر پھر بعد میں ہاجرہ پر ہی خفا ہوتا تھا کہ اُس نے بیٹی کو اخلاق نہیں سکھائے۔

نور شیر کا یہ التفات اور پھر اُس کی نگاہ ہاجرہ کے اندر کوئی شے کھٹکتی ضرور تھی مگر وہ اپنی ہر سوچ کا گلا گھونٹ لیتی کہ ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ نور شیر فلک شیر سے بہت محبت کرتا ہے۔ اسی حوالے سے اُس کی بیوی کو بھی عزیز رکھتا ہے۔ پھر جس دن نیلماں نے اُس کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اپنے باپ برابر مرد کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ اپنی گوری انگلیوں سے تھام کر پیار بھری خفگی سے کہا۔

''اب میں سگریٹ پیتا نہ دیکھوں، ذرا جو اپنی صحت کا خیال ہو کچھ پتہ بھی ہے سگریٹ صحت کے لیے کتنی بُری ہے، بندے کو ختم کر ڈالتی ہے۔'' ہاجرہ گنگ ہو کر اُس کی جرأت دیکھتی رہ گئی۔

اُدھر نور شیر جوشِ جذبات سے مغلوب ہو گیا، روہانسا سا ہو کر بولا۔

''یہاں کسی کو میری پروا ہی کہاں ہے، بس پیسہ کمانے کی مشین ہوں۔''

''اب میں جو آ گئی ہوں۔ خوب خیال رکھوں گی آپ کا۔'' نیلماں نے نگاہوں کے تیر چلائے۔ نور شیر جیسے گھاگ بندے کے لیے صنفِ نازک کے ان اشاروں کی گتھیاں سلجھانا کون سا مشکل کام تھا۔

سیدھی سادھی ہاجرہ گھر بیٹھنے والی عورت سہی بے وقوف نہیں تھی۔ اُس لمحے جان گئی کہ اُس کے گھر میں وہ کھیل کھیلا جانے والا ہے جو نیلماں جیسی اکثر عورتیں اکثر مردوں کے ساتھ کھیلا کرتی ہیں۔

ایسا آج سے نہیں سینکڑوں برس سے ہوتا چلا آیا ہے۔ جب ہزاروں لوگوں پر حکومت کرنے والا طاقتور زور آور مرد خوشی خوشی اپنی نکیل ایک عورت کے ہاتھ میں دے کر خود غول سے بچھڑے اونٹ کی طرح سر جھکائے اُس کے پیچھے یوں چل پڑتا ہے جیسے وہی اُس کی اصل مالک ہو۔

☆.......☆.......☆

نیلماں ہمیشہ کی طرح یوں دندناتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تھی جیسے کوئی بادشاہ اپنے مفتوحہ علاقے میں داخل ہوتا ہے۔ فلک شیر بازوؤں میں ڈھیر سارا سامان سنبھالے اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔

نیلماں کے چہرے پر غصے کی ہلکی ہلکی سرخی تھی جبکہ فلک شیر بوکھلایا بوکھلایا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتا تھا مگر نیلماں ہنہ کر کے منہ موڑ لیتی تھی۔ اُس کی انہی اداؤں پر تو فلک شیر کی جان جاتی تھی۔

گھر کے مرکزی گیٹ سے دالان' دالان سے برآمدے اور برآمدے سے اندر ہال کمرے تک وہ یونہی منمناتا رہا جس کا جواب نیلماں کی ایک گھوری تھا۔

گھر کی ملازمائیں اُس کی یہ درگت دیکھ کر دبی دبی ہنسی ہنستی تھیں۔ اُن کے لیے یہ روز ایک نیا تماشہ ہوتا تھا۔ گاؤں میں شادی سے پہلے یوں بلا جھجک ہونے والی سسرال آنے کا رواج نہ تھا۔ اس لیے وہ سب حیران ہوتی تھیں چپکے چپکے باتیں بھی کرتی تھیں مگر نیلماں، نیلماں تھی۔

"بھرجائی جی...... ذرا ٹھنڈی بوتل تو پلوانا۔" کمرے کے وسط میں آ کر نیلماں نے سلام جھاڑنے کے ساتھ آواز دی۔

"نہیں بلکہ شربت بنوا دو...... آگے ہی کلیجہ سڑ رہا ہے۔" یہ جملہ اُس نے ایک کاٹتی ہوئی نظر فلک شیر پر ڈال کر کہا جس سے آج جانے کون سا قصور سرزد ہو چکا تھا۔

"اور میں یہ کپڑے درزی سے اٹھوا لائی ہوں۔ ڈیزائن دیکھ لینا ٹھیک ہیں یا نہیں...... ورنہ اُس کے منہ پر مار آؤں گی۔" وہ ساری تیاری اپنی مرضی سے کر رہی تھی مگر سامنے والے کو یوں شامل کرتی جیسے اُسی کے مشوروں پر تو چل رہی ہو۔

ہاجرہ نے ملازمہ کو گلاس نکال کر دھونے کا کہا اور خود شربت گھولنے لگی۔ خود اپنے ہاتھوں سے خاطر داری نہ کرو تو نیلماں کو رنج ہونے لگتا تھا۔

نیلماں نے چادر اُتار پھینکی اب اپنے گھر میں بھلا کیا پردہ اُس کی قمیض پسینے میں بھیگ کر بدن سے چپک رہی تھی۔ شربت کی ٹرے اُٹھا کر لاتی ہوئی ہاجرہ نے نظریں چرالیں۔

حسن بے پرواہ تھا، کچھ گرمی، کچھ برہمی کی تپش سے لال بھبھوکا چہرہ، پیڈسٹل فین کے سامنے کھڑے ہونے کی وجہ سے رخساروں کو چومتی سیاہ آوارہ لٹیں۔

سامنے کمرے کے اَدھ کھلے دروازے سے اپنے جہازی پلنگ پر نیم دراز دکھائی دیتے نورشیر کی ساری توجہ اُس جانب تھی اُس کی نظر کو کون پابند کرتا۔

گل پری وہیں کمرے میں ہی بیٹھی تھی برداشت نہ کر سکی تو اخبار چھوڑ کر اُٹھ کر چلی گئی۔ بظاہر اپنی دھن میں مگن نیلماں کی نظروں نے اُس کا پیچھا کیا مگر اُس وقت چہرے پر پرچھائیں تک نہ آنے دی۔

چند گھونٹوں میں گلاس خالی کر کے اُس نے ہتھیلی کی پشت سے اپنے ہونٹوں کو صاف کیا۔ لال ہونٹوں پر شربت کے لال قطرے، دکھائی ہی کب پڑتے تھے۔

نورشیر کی ساری کسلمندی جاتی رہی وہ بے اختیار اُٹھ کر دروازے کی چوکھٹ پر آ کھڑا ہوا اور محبت پاش لہجے میں بولا۔

"دشمنوں کی خیر ہو، آج مزاج اتنا گرم کیوں

ہے؟'' نیلماں کی آمد ہمیشہ اُسے بہار کے جھونکے کی طرح لگتی تھی اُس کی نقرئی ہنسی سے بے جان در و دیوار جاگ سے اٹھتے تھے۔آج غصہ کررہی تھی تو اور بھی بے چین کررہی تھی۔

''چھوڑیں ناں بھائی جی...... کیا کریں گے سن کر......'' نیلماں کو تجسس ابھارنا خوب آتا تھا۔

''نہیں، نہیں، تم کہوتو۔'' نگاہیں پُر شوق تھیں لہجہ بے تاب فلک شیر کا بس نہ چل رہا تھا کہ ہاتھ جوڑ کر نیلماں کو بولنے سے باز رکھے۔

''بھائی جی اب کے شہر جاؤ تو میری بتائی ہوئی چوڑیوں کے ساتھ ساتھ فلک شیر کے ناپ کی چوڑیاں بھی ضرور لیتے آنا۔'' نیلماں نے تنک کر ناز بھری شکایت کی فلک شیر اور بھی خجل ہوگیا۔نظروں ہی نظروں میں التجا کرنے لگا مگر وہ نیلماں ہی کیا جو اُس کی سُن لے۔وہ جب جب فلک شیر کی سادہ لوحی کا مذاق اڑاتی تھی نور شیر کو بہت لطف آتا تھا اس وقت بھی سمجھ گیا کہ اِس تمہید کے پیچھے کوئی دلچسپ کہانی ہے۔

''آج کیا قصور ہوگیا میرے شہزادے سے؟''

''ہم لوگ درزی کے پاس سے آرہے تھے اُدھر گلی کے کونے پر ایک لفنگا اپنے دوست کے ساتھ راستہ روک کر کھڑا ہوگیا اور آپ کا یہ نازوں پلا شہزادہ جان عالم لگا انہیں سمجھانے کہ بھائی یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔شریف لوگ ایسا نہیں کرتے۔'' نیلماں نے فلک شیر کی نقل اُتاری۔

فلک جو سر کھجا رہا تھا گڑبڑا کر وضاحتیں دینے لگا۔

''وہ دو تھے۔پھر اتنا سامان...... اور ہو سکتا ہے کہ اُس کے اور بھی......''

نور شیر اُس کی بات کاٹ کر ایکدم جوش میں آکر گرج اٹھا۔

''کس مائی کے لال نے اتنی جرأت کی تھی۔ مجھے نام بتاؤ، حشر بگاڑ دوں گا اُس کا......اُس کی ماں روئے گی اُسے......''

''رہنے دیں بھائی جی، ٹینشن نہ لیں...... لیں یہ ٹھنڈا شربت پئیں اور ٹھنڈے ہو جائیں۔'' نیلماں نے جھٹ سے اٹھ کر شربت کا گلاس لے جاکر اُسے تھمایا۔

''آپ فکر نہ کریں، میں نے کیا چھوڑ دینا تھا اُسے یونہی، مجھے کیا ایسی ویسی سمجھ رکھا تھا جو راستہ روکا، جوتی اُتار کر ایسی پھینٹی لگائی کہ دوبارہ اس گلی میں نظر نہیں آئے گا۔'' اُس نے فخریہ اپنا کارنامہ سنایا تو نور شیر باوجود غصے کے ایک جاندار قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔

کیسی جی دار لڑکی تھی اور کردار والی بھی۔

شربت پی کر غصہ قدرے کم ہوا تو وہ فلک شیر کو سرزنش کرنے لگا کہ اُسے یوں نیلماں کو اپنے ساتھ گاؤں کی گلیوں میں پیدل نہیں لیے پھرنا چاہیے۔

طے یہ پایا کہ نیلماں اب کہیں بھی آنے جانے کے لیے گھر کی گاڑی استعمال کرے گی آخر وہ اِس گھر کی عزت تھی۔

دستر خوان بچھایا جانے لگا تو نیلماں کو جیسے اچانک خیال آیا۔

''یہ گل پری کہاں چلی گئی۔ابھی تو یہاں بیٹھی تھی۔'' سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے نیلماں پھر سے بولی۔

''یوں تو میں عمر میں اُس سے کوئی دو چار برس چھوٹی ہی ہوں گی مگر رشتے میں بڑی ہوں۔

مگر شاید ابھی اُسے اِس بات کا احساس نہیں ہے، سلام کرنا بھول جاتی ہے۔''

نور شیر کی تنبیہی نگاہ ہاجرہ کی طرف ہی اٹھی تھیں ایسے احساس تو مائیں دلاتی ہیں۔

ہاجرہ سے کوئی اور جواب نہ بن پڑا تو بولی۔

''میں دیکھتی ہوں شاید اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اُس کے اٹھنے سے پیشتر ایک جھٹکے سے گل پری کے کمرے کا دروازہ کھلا اُس نے باہر نکل کر بغیر کسی کی طرف دیکھے بلند آواز میں سلام کیا اور کھانا لگانے میں ماں کی مدد کرنے لگی۔ نیلماں خفت مٹانے کے لیے چہکی۔

''شاید تمہیں میرا کہنا برا لگا میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ اپنا سمجھ کر...... اِس بہانے تمہاری صورت تو دیکھنے کو ملی۔''

گل پری زبردستی اپنے ہونٹوں کو کھینچ کر مسکراہٹ نام کی چیز ہونٹوں پر لائی جیسے کہہ رہی ہو اب خوش، باپ اور چچا سامنے نہ ہوتے تو شاید وہ تڑ سے کوئی جواب بھی دے دیتی۔ کھانا اُس نے زہر مار کرنے والے انداز میں ہی کھایا تھا۔ نور شیر کا بس نہ چل رہا تھا کہ ایک تھپڑ لگا کر گل پری کا سوجا ہوا بوتھا درست کر ڈالے، بیچاری نیلماں اُس سے ہنس بول رہی ہے اور یہاں اس کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔

ساری شہ ماں کی ہے لڑکی کو سر چڑھا کر رکھا ہے۔ اب اِس کا علاج کرنا ہی پڑے گا، پہلی ہی فرصت میں اِسے چلتا کرنا ہے، اُس نے عزم کر لیا۔

اُدھر فلک شیر کے دل میں بھی گرہ پڑ گئی تھی۔ نیلماں ٹھیک ہی تو شکوہ کرتی ہے کہ گل پری اُسے پسند نہیں کرتی حقیر سمجھتی ہے۔

☆......☆......☆

سرخ تھال سا بنا سورج افق کے کنارے سمٹ آیا تھا دم توڑتی کرنیں منڈیروں کو چھوڑ رہی تھیں۔ دور کسی گھر سے اٹھتی دھویں کی سرمئی سی لکیر اونچا اٹھتے ہوئے سفید بادلوں کے گلے لگنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

فضا میں ایک نامعلوم سی یاسیت گھلی تھی یا شاید یہ گل پری کے دل کی اندرونی کیفیت تھی۔ آج کل اُس پر ہر وقت اُداسی اور جھنجلاہٹ طاری رہنے لگی تھی۔ ہر شے سے ہی دل اچاٹ ہو رہا تھا۔ ہر گزرتا ہوا دن اُس کے دل میں نئے وسوسے جگا تا تھا مگر کسی کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہی نہیں تھا۔ خاص کر شاہ در کو، وہ ہر بات کو بڑی سہولت سے لیتا تھا۔

وہ دونوں چھت کی طرف جانے والے زینے پر ایک دو قدم کے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ شاہ در کی نظریں اُس کے چہرے پر کھوئی ہوئی شوخی تلاش کرتی تھیں۔ اُس کی برجستگی، خوش گفتاری، خوش دلی اب تنک مزاجی میں ڈھل گئی تھی۔ بات بات پر ناراض تو وہ پہلے بھی ہوا کرتی تھی مگر اب تو اُس کا مزاج عجیب پل میں تولہ پل میں ماشہ سا ہو گیا تھا۔

گل پری گم سم بیٹھی تھی۔ چچا کا اُکھڑا اُکھڑا رویہ اور بابا کا دو ٹوک انداز، اُسے اپنے کانوں میں آنے والے لمحوں کی دھمک صاف محسوس ہوتی تھی۔ بابا اُسے کوئی رعایت دینے پر تیار نہ تھا۔ اگلی فصل اُتری نہیں اور اُس کا بیاہ ٹھہرا نہیں اگر نیلماں کے گھر والوں نے جلدی کا عذر نہیں مچایا ہوتا تو شاید نور شیر پہلے بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونے کی سوچتا مگر فلک شیر بھی جلدی شادی کے لیے اُتاؤلا ہو رہا تھا۔ نور شیر اسے قائل نہ کر سکا۔

راتوں کو نیند ٹوٹتی تو گل پری کروٹوں میں صبح

کردیتی تھی۔ کہاں جائے، کس سے فریاد کرے۔ یہ وقت نکل جاتا تو سب نے ہاتھ ملتے رہ جانا تھا مگر ابھی ماں کی قسموں نے زبان پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ گل پری کو نہ اُس کی تسلی پر یقین آتا تھا نہ وعدے پر اعتبار مگر وہ یقین کرنے پر مجبور تھی۔

فلک شیر کی شادی کے بعد اُسے اپنی خیر ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ نیلماں کے انداز دیکھ رہی تھی وہ گل پری کو اپنا حریف سمجھتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک واضح پیغام ہوتا تھا۔ گل پری جان چکی تھی کہ نیلماں اِس گھر میں قدم جماتے ہی اُس کے قدم اکھاڑنے کی کوشش کرے گی۔

اپنی ماں کو تو گل پری جانتی تھی کہ اُس نے خوش گمانیوں میں ہی زندگی گزار رہی ہے مگر زیادہ غصہ اُسے شاہ در پر آتا تھا۔ وہ اِس معاملے کو سنجیدگی سے کیوں نہیں لیتا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا کا راگ الاپتا رہتا ہے۔

نیلے آسمان کی وسعتوں میں پنکھ پھیلائے ایک دوسرے کی ہمراہی میں تیرتے پرندوں کو حسرت سے دیکھتے ہوئے اُس نے اپنی چپ توڑ کر ہزار بار کا دہرایا سوال پوچھا۔

''کبھی سوچا بھی ہے ہماری محبت کی اِس کہانی کا کیا انجام ہوگا؟'' اپنے جذبوں کے اظہار میں وہ جتنی بے باک تھی۔ شاہ در اتنا ہی محتاط رہتا تھا۔ وہ اتنا نپا تلا بولتا تھا جیسے الفاظ ضائع ہونے کا ڈر ہو جبکہ گل پری بے تکان بولتی چلی جاتی تھی جو اُس کے دل میں ہوتا تھا کہہ ڈالتی تھی۔ شاہ در کی یہی خوبی تو اُسے سب سے زیادہ پسند تھی کہ وہ بہت اچھا سامع تھا اپنے دل کی ساری باتیں وہ اُس کے ساتھ کرلیا کرتی، اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں، اپنے دکھ، اپنی پسند، اپنی ناپسند، اپنی ماں کے لیے اُس کے احساسات، باپ کے لیے جذبات، خواہشیں، چاہتیں، شکوے، ناراضگیاں، محبتیں، شاہ در جب بھی شہر سے آتا گل پری کے پاس اُسے سنانے کے لیے ڈھیروں باتیں ہوتی تھیں۔ شاہ در مسکراتی، نثار ہوتی نظروں سے اُسے دیکھتا اور سُنتا جاتا تھا۔ بیچ میں کبھی کبھی اثبات میں سر کو ہلانا، حیرت افسوس یا ستائش کا اظہار کرنا بھی ضروری ہوتا تھا ورنہ گل پری جھگڑتی کہ وہ ڈھنگ سے اُس کی بات سُن نہیں رہا۔

آج شاہ در آیا تھا تو اُسے لگا جیسے وہ بولنا بھول گئی ہے اور اگر بولتی بھی ہے تو اُس کے الفاظ چوٹ کے سوا اور کچھ نہیں دیتے۔ اِس وقت بھی اُس نے اِس سوال کے جواب میں ہمیشہ کی طرح بہت سنبھل کر کہا۔

''میں ایسی تکلیف دینے والی باتیں نہیں سوچا کرتا۔ سوچنے کے لیے اور بھی اچھی اچھی باتیں ہیں۔''

جدائی کے یہ چند دن وہ گل پری کے بارے میں ہی سوچ کر گزارتا تھا۔ اتنے جتن کر کے وہ یہاں اس سے ملنے آتا تھا مگر اب اُسے دیکھ کر گل پری کے دل کی بے قراری اور بڑھ جاتی تھی وہ کسی نہ کسی بات پر اُس سے اُلجھ پڑتی تھی۔

''بلی کو دیکھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے کیا موت ٹل جاتی ہے؟'' گل پری نے طنزیہ کہا۔

''اور مرنے سے پہلے مر جانے کی سوچنا کون سی عقلمندی ہے؟'' شاہ در نے اُلٹا سوال پوچھا۔

''مت سوچو ایک روز وہ مجھے ڈولی میں بٹھا کر لے جائے گا اور تم منہ دیکھتے رہ جانا۔ پھر میں

پوچھوں گی یہی ہے تمہاری غیرت۔'' گل پری کی اِس بات پر شاہ در کو تازیانہ سالگا۔
'' آئندہ مجھے بے غیرت کا طعنہ مت دینا، چاہوں تو تمہیں ابھی اٹھا کر لے جاؤں مگر برادری اور تمہارے باپ کا شملہ نیچا ہونے کے خیال سے ڈرتا ہوں۔ اُن کی عزت کا خیال روک لیتا ہے ورنہ......''
سدا کے نرم مزاج شاہ در کا یوں بھڑک جانا گل پری کو اچھا تو لگا مگر وہ اور بھی اُس سے بہت کچھ چاہتی تھی۔ مزید چڑانے کے لیے بولی۔
'' ہونہہ اِس کے علاوہ اور تم کر بھی کیا سکتے ہو، کیسا ٹھنڈا خون ہے تمہارے خاندان کا، لڑنے سے پہلے ہی ہتھیار پھینک ڈالتے ہو۔ ایک تم اور ایک اماں، آخر دونوں کا خون ایک ہی تو ہے۔ چاہتے ہو کہ بغیر کچھ کہے، کیے خود بخود سب کچھ ہو جائے۔ سارا قصور تمہارا ہے ایک بار بھی تو تم نے بابا سے میرا ہاتھ نہیں مانگا۔ تم کچھ کہتے تو شاید وہ بھی کچھ سوچتے۔'' گل پری بولتے بولتے تھک گئی تو سارا الزام اُس پر دھر ڈالا۔
شاہ در جانتا تھا کہ وہ کس ذہنی اور جذباتی اذیت سے گزر رہی ہے۔ اس لیے وہ اُسے بول کر دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع دیتا تھا۔ وہ چپ ہوئی تو آہستگی سے بولا۔
'' تم جانتی ہو میں ایسا کرنا چاہتا تھا مگر پھوپی نے روک لیا کہ ابھی مناسب نہیں۔''
'' تو اور میں کیا کہہ رہی ہوں۔ یہی تو رونا ہے اماں بھی تمہاری طرح بزدل ہیں۔ مگر نہیں تم تو بلکہ بزدلوں کے سردار ہو، ابھی بھی بابا کے پیچھے چھپ چھپ کر آتے ہو جیسے کہ اپنی سگی پھوپی سے ملنا کوئی جرم ہو۔ اماں نے ساری زندگی مناسب وقت کے انتظار میں گزار دینی ہے۔ ابھی تک تو وہ سہانا وقت نہیں آیا جس کے وہ خواب دیکھتی آئی ہے۔ جیسے کہ بابا نے واقعی اُسے اتنی عزت، برابری کا اتنا درجہ دے ہی دینا ہے کہ پاس بٹھا کر مشورہ کرے اور سنے۔'' گل پری کی باتیں تلخ سہی پر ان میں کڑوی سچائی تھی۔
شاہ در ایک لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ اپنی پھوپی کے لیے اُس کا دل بھی کڑھتا تھا مگر وہ کچھ کر نہیں پاتا تھا۔
'' تم دونوں جانے کن احمقوں کی جنت میں رہتے ہو۔ جیسے کہ ایک دن اچانک سب کچھ تمہاری مرضی کا ہو جائے گا۔ کایا پلٹ جائے گی۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ وقت نامہربان ہو جائے تو خود سے ہماری جھولی نہیں بھرتا، اپنی خوشیاں اپنے جتن سے حاصل کرنا پڑتی ہیں۔'' وہ تقدیر سے زیادہ تدبیر کی قائل تھی۔
'' چاچا جیسے بدھو نے بھی کسی نہ کسی طرح اپنی منوا لی، تم تو اُن سے بھی گئے گزرے نکلے۔''
شاہ در کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔
'' لڑکی تم نے ایک ہی سانس میں مجھے اور اپنی ماں کو احمق، بزدل اور چچا کو بدھو کہہ دیا۔ یہ کچھ زیادہ نہیں ہو گیا۔'' اُس نے بات کو ہلکا پھلکا رنگ لینے کے لیے شگفتگی برتنی چاہی مگر گل پری آج سخت خفا تھی۔
شاہ در کی عادت تھی کہ وہ کسی مسئلے کو سر پر سوار نہیں کرتا تھا ہر کام آرام اور سکون سے کرتا تھا جبکہ گل پری آج اور ابھی کی قائل تھی۔ اِسی بات پر دونوں میں ٹھن جاتی تھی۔ گل پری کا خیال تھا کہ شاہ در نے اتنے سال یونہی ضائع کر دیے تھے۔
'' دیکھو مجھے باتوں سے بہلانے کی کوشش نہ کرو، میرا موڈ ویسے ہی بہت خراب ہے۔'' اُسے

یہ جتانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ یہ مظاہرہ شاہ در اتنی دیر سے کر ہی رہ تھا اور یوں بیٹھا تھا جیسے گل پری کے منہ سے پھول ہی تو جھڑ رہے ہوں۔

''اچھا سنو، تم جو چاہتی ہو میں کرنے کو تیار ہوں مگر شادی والے گھر میں ایک نیا ہنگامہ کھڑا کرنا کیا اچھا ہوگا۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔'' گل پری نے بچوں کی طرح منہ بسورا۔

''پر ہے...... اتنی جلدی مایوس نہیں ہوتے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا، ابھی کونسا تمہیں منگنی کی انگوٹھی پہنا دی گئی ہے، چلو تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تو خدا سے امید رکھو، کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔'' اُسے اتنا حساس دیکھ کر شاہ در کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔ وہ اپنے بارے میں نور شیر کے خیالات سے آگاہ تھا اُس کا رویہ ابھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہونے دیتا وہ کچھ بن کر ہی اُس کے سامنے جانا چاہتا تھا۔ ابھی تو اُس کی تعلیم ادھوری تھی۔ کوئی اچھی نوکری ملنے کی فل الحال کوئی امید نہیں تھی پھر وہ گل پری کا ہاتھ مانگتا بھی تو کس برتے پر، نور شیر کے پاس انکار کے سو جواز تھے۔

''تم اور تمہاری امیدیں......'' گل پری ٹھپ ٹھپ سیڑھیاں اُترتی نیچے چلی گئی۔ آج کل اُن کی ہر گفتگو کا اختتام ایک لاحاصل بحث کے بعد یونہی ہوا کرتا تھا۔ وہ بچپن ہی سے اپنی منوانے کی عادی تھی۔ ہر کھیل اُس کی مرضی، اُس کی شرطوں پر ہی طے ہوتا تھا مگر زندگی کوئی کھیل تو نہیں تھی۔ شاہ در وہیں بیٹھا خالی ذہن کے ساتھ آسمان کی نیلاہٹ میں گھلتی شفق کی سرخی کو دیکھتا اور سوچتا رہا۔

☆......☆......☆

نیلماں کے گھر والے لالچی ہی نہیں موقع شناس بھی ثابت ہوئے۔ انہوں نے لوہا گرم دیکھ کر ایک نئی شرط رکھ دی۔ سارے معاملات بالا ہی بالا نور شیر سے ہی طے ہوئے تھے۔ نور شیر شادی کی تاریخ طے کرنے صرف نور حسن کو ساتھ لے گیا تھا۔ اس اہم موقع پر بھی اُس نے ہاجرہ کو ساتھ لے جانا گوارا نہیں کیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ زنانیوں نے جا کر کھپ ہی ڈالنی ہے۔ واپس آ کر اُس نے مژدہ سنایا۔

''میں نہر والی زمین لڑکی کے حق میں مہر میں لکھ رہا ہوں۔'' ہاجرہ لق دق رہ گئی۔

''نہر والی زمین! مگر وہ تو بہت کام کی زمین ہے۔''

''ہے تو، مگر اُن لوگوں کی شرط تھی۔''

''ہمارے کون سے ہزاروں مربعے ہیں جو وہ ایسی شرطیں رکھیں گے۔''

''ہوتے بھی تو کون سا تو نے مجھے اُن کا وارث دے رکھا ہے۔'' نور شیر برجستہ بولا۔ وہ یہ طعنہ دینے سے کبھی نہ چوکتا تھا جانتا تھا کہ یہ ہاجرہ کی دُکھتی رگ ہے۔ ہاجرہ ایک لمحے کے لیے چپ سی ہوگئی پھر بولی۔

''گل پری تو ہے...... یہ تو اُس کا حق ہے۔''

''واہ...... بیٹی کے نام زمین کر دوں تا کہ اُس کے سُسرال والے قبضہ کر کے عیش کریں۔ کر دی نا وہی کم عقلی کی بات۔'' آج نور شیر کے عزیز بھائی کا گھر بیٹی کا سُسرال ہو گیا تھا۔

''اب سمجھا، نور حسن کا بھی یہی خیال ہوگا، جبھی تو اتنی مخالفت کر رہا تھا مگر میں بھی بندے کی اصل نیت پہچانتا ہوں۔ میری سمجھداری دیکھ، میں نے بھی شرط رکھ دی کہ فلک شیر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ پھر تو زمین بھی ہمارے ہاتھ رہی

ناں۔ فلک شیر من موجی ہے۔ اُس نے کہاں زمینداری کے بکھیڑے میں پڑنا ہے، قبضہ تو میرا ہی رہے گا۔'' نور شیر خود کو داد دے رہا تھا کہ لڑکی والوں کی ضد بھی پوری ہوگئی اور اُس کا کام بھی بن گیا ساروں میں واہ واہ الگ ہوئی۔

''ہمیشہ یہاں رہیں گے۔'' ہاجرہ کا دل ڈوب سا گیا۔

''ہاں اچھی لڑکی، ہنسی مسکراتی ...... یہاں آئے گی تو گھر میں رونق ہو جائے گی، تم ماں بیٹیوں جیسی ماتمی صورت نہیں ہے کہ بندہ گھر آئے تو جی گھبرانے لگے۔'' نور شیر نے طنز کیا۔ ہاجرہ اپنی پریشانی میں دھیان نہ دے سکی۔ اُن کی آمدنی کا زیادہ تر انحصار اسی نہر والی زمین پر تھا۔ نور شیر سے ایسی نادانی کی توقع نہیں تھی۔ بعد میں بڑے مسئلے کھڑے ہو سکتے تھے۔ فلک شیر کی تو خیر سمجھ آتی کہ عشق اندھا ہوتا ہے اور فلک شیر تو یوں بھی عقل کا کچھ ماٹھا تھا۔ مگر نور شیر جیسے بندے کو یہ کیا ہو گیا تھا کہ بلا چوں چراں اُن کی ہر بات پر لبیک کہتا چلا آ رہا تھا۔ اُس کی پُراسرار مسکراہٹ میں کون سا راز چھپا تھا۔

''وہ لوگ بھی سچے ہیں، غیر لوگوں میں لڑکی دیتے ہر کوئی ڈرتا ہے، ضمانت چاہتا ہے۔''

نور شیر نے کہا تو ہاجرہ بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''خیر اب اتنی بھی قیمتی نہیں ہے اُن کی لڑکی، اتنا اچھا رشتہ تو نصیب سے ملتا ہے، ہمارے فلک شیر کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی تھوڑی تھی۔''

اُس کا یہ تبصرہ نور شیر کو گراں گزرنا ہی تھا۔

''میری چیز ہے میں مالک ہوں جو چاہے کروں، کوئی اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہے۔''

کسی کے اعتراض کو وہ خاطر میں بھی کب لاتا تھا ابھی بھی جانے کیوں وضاحتیں دے رہا تھا جبکہ یہ اس کے مزاج کے خلاف تھا نور حسن شاید اُس کے فیصلے پر ناراض ہو کر گیا تھا مگر اُسے پروا نہیں تھی۔ زمین وراثت میں ضرور ملی تھی مگر اُس کی مٹی کو سونا اُسی کی محنت نے بنایا تھا وہ اُس پر اپنا پورا حق سمجھتا تھا۔

☆......☆......☆

شادی ہوئی اور بہت دھوم دھڑا کے سے ہوئی نیلماں بیاہ کر اُن کے گھر آ گئی۔ وہ حسین ہی نہیں ذہین بھی تھی۔ یہ اندازہ تو اُسے پہلے ہی ہو چکا تھا کہ نور شیر کی نظروں میں ہاجرہ کی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہے اُس کے لیے گل پری بھی کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی۔ گھر کی ساری بادشاہی مردوں کے ہاتھ میں ہے۔ سو اُس نے گھونگھٹ اٹھاتے ہی اپنے رنگ ڈھنگ دکھانے شروع کر دیے۔ وہ اُن دونوں ماں بیٹیوں کو نظر انداز کر کے مردوں کو قابو کرنے کے گُر آزمانے لگی۔ فلک شیر تو اُس کا بن دام غلام تھا ہی اب تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ اُس کے کہے پر دن کو دن رات کو رات کہتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ بھائی جی، بھائی جی کرتے ہوئے نور شیر کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھی۔ کبھی لاڈ سے کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کرتی، کبھی ہنسی سے دھری ہوتے ہوئے نت نئے مزے دار قصے سناتی۔ تو کبھی اُس کی جی داری، اُس کی انتھک محنت اور عقل و ذہانت کی یوں تعریفیں کرتی کہ نور شیر کا سینہ خوشی سے پھول جاتا۔

دوسری طرف گھر کی ذمہ داریوں سے اُس نے کوئی سروکار نہ رکھا تھا اُس کے لیے ہاجرہ جو تھی پہلے تو اُس نے دلہناپے کے بہانے خوب آرام کیا پھر صاف کہہ دیا کہ اُسے تو گھر کے کاموں کی عادت ہی نہیں ہے۔ دوسروں کے

سامنے بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتی کہ ''گھر تو بھرجائی جی کا ہے، اصل مالکن تو وہی ہیں، وہ جانیں کہ گھر کیسے چلانا ہے۔'' سننے والا اُس کی اعلیٰ ظرفی کا معترف ہوجاتا۔ وہ دن چڑھے سوکر اٹھتی ڈٹ کر کھاتی پیتی پھر شام کو ہار سنگھار کر کے تیار ہوجاتی۔ فلک شیر سے خوب چاؤ چونچلے ہوتے پھر نور شیر گھر آتا تو اُس کے ساتھ محفل جمتی۔ غرض کہ ایک چہل پہل سی لگی رہتی تھی۔ پھر کبھی کبھی نیلماں کا اپنا جی کرتا تو ملازمہ سے اپنی نگرانی میں دونوں مردوں کی پسند کے پکوان تیار کرواتی اور وہ دونوں ہر ہر لقمے پر یوں تعریف کرتے جیسے آج سے پہلے کوئی ذائقہ دار شے حلق سے اُتری ہی نہ ہو۔

ہاجرہ اتنی سی لڑکی کے چلتر پر حیران ہوتی تھی اُس نے یہ گُر کبھی نہ سیکھے تھے اب فلک شیر مکمل طور پر اُس کی مٹھی میں تھا نور شیر الگ تعریفیں کرتا نہ تھکتا تھا۔

نیلماں کا ہنسنا بولنا، اُس کے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ، اِس کا بننا سنورنا، اُس کے چٹکلے، زندگی کا ترنگ وہ ہاجرہ کو مثال دیتا کہ عورت ایسی ہوتی ہے۔ فلک شیر کیسا شاد اور سرشار رہتا ہے اُسے رہنا بھی چاہیے اُسے تو جیتے جی جنت مل گئی تھی۔ اچھی بیوی قدرت کا انمول تحفہ ہوتی ہے۔ یہ بات تو دین بھی کہتا ہے فلک شیر کو یہ تحفہ مل گیا تھا اور خود وہ......!

جملے کا آخری حصہ ایک ٹھنڈی آہ میں ڈھل جاتا۔ آنکھوں کی حسرت اب زبان پر آنے لگی تھی۔

ہاجرہ کے دل میں نیزے کی اَنی سی کھُب جاتی۔ وہ اُسے دیکھتی رہ جاتی۔ نور شیر نے اُس کے اندر عورت پن جگایا ہی کب تھا۔ وہ اعتماد وہ ناز اور بانکپن جو اپنے مرد کی گہری پیار بھری نگاہ سے پیدا ہوتا ہے وہ نگاہ اُس کے حصے میں آئی ہی کہاں تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا اُس میں اُس کی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اُس کی ساری خواہشیں، سارے ارمان نور شیر کی نفرت و تعارف سے جھلس کر رہ گئے تھے۔ وہ اُس سے ناپسندیدہ چیز کا سا برتاؤ کرتا تھا۔ کڑی دھوپ میں تنہا اتنا طویل سفر کاٹ کر وہ بیوی سے ماں کے درجے تک پہنچی گھر کی مالکن بھی کہلائی مگر محبوبہ کا درجہ نہ پاسکی۔

نیلماں شادی سے پہلے ہاجرہ سے پھر بھی کافی خوش اخلاق برتتی تھی مگر اب اُسے کسی گنتی میں نہ رکھتی تھی ہر بات میں اپنی من مانی کرتی تھی۔ ہاجرہ کوئی کام کہتی تو ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال دیتی تھی۔

ہاجرہ نور شیر سے اُس کے رویے کی شکایت تو نہیں کرتی تھی کہ وہ اِس کی عادی ہو چکی تھی مگر وہ نیلماں سے یہ ضرور پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ وہ آگ اور تیل کا یہ کھیل کیوں کھیل رہی ہے۔ یا تو یہ اُس کا بھولپن ہے یا وہ حد سے زیادہ چالاک ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے نیلماں اُس سے کوئی خاموش انتقام لے رہی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں......؟ اُن دونوں کا اپنا اپنا الگ مقام تھا۔ مگر دونوں میں بہت فرق بھی تھا۔ دونوں کو ساتھ کھڑا کرو تو یہ فرق اور نمایاں ہوجاتا تھا۔

نیلماں نئے زمانے کی لڑکی تھی جبکہ ہاجرہ پرانی روایات کی پروکار ایک کا شباب ڈھل رہا تھا دوسری کلی سے چٹک کر پھول بنی تھی۔ ہاجرہ معمولی نقش و نگار کی حامل ڈھیلی ڈھالی سی عورت تھی۔ عورت کو اپنے مرد کا پیار و احترام نہ ملے تو یونہی ڈھل جاتی ہے۔ جبکہ نیلماں چست اور تیز

طرار تھی اُس کے انگ انگ سے کشش پھوٹتی تھی۔ اُسے اپنے حسن کو اجاگر کرنا خوب آتا تھا۔ اس میں ایک طنطنہ بھی تھا۔ کسی ضد پر اڑ جاتی تو بس اڑ جاتی۔ وہ دھڑلے سے فلک شیر سے اپنی منواتی تھی۔ ہاجرہ نور شیر کی ایک تیز نگاہ پر دبک کر رہ جاتی تھی۔ وہ نہ اقتدار کی جنگ میں شریک تھی نہ مقابلہ حسن میں۔ وہ نیلماں کے مقابلے میں آنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر نیلماں کیا چاہتی تھی۔

نیلماں نے درمیان میں فاصلے بڑھا دیے تھے۔ شادی کے بعد سے گل پری بھی اب نہ پہلے کی طرح ناگواری ظاہر کرتی تھی۔ نہ اُس کے کسی معاملے میں دخل دیتی تھی۔ وہ اپنے خول میں سمٹ گئی تھی۔ ایک ہی گھر میں وہ تین عورتیں اجنبیوں کی طرح زندگی بسر کر رہی تھیں۔

☆......☆☆

اُن کی پرانی ملازمہ لطیفاں ابھی ابھی اُن تینوں کو چائے کی پیالیاں تھما کر اجازت لے کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی تھی۔ گاؤں میں گیس ابھی تک نہیں آئی تھی۔ یوں تو گھر میں سلینڈر سے چلنے والے گیس کے چولہے بھی تھے مگر شاہ در کو لکڑیوں پر پکے سوندھی سوندھی خوشبو والی گاڑھی چائے بہت پسند تھی۔ وہ جب بھی آتا ہاجرہ اُس کی فرمائش پر خاص اُس کے لیے یہ چائے ضرور بنواتی تھی۔

صحن میں بچھی چارپائیوں میں سے ایک پر وہ اُس کے مقابل بیٹھا تھا گل پری ان گھڑیوں کے تھم جانے کی دعا کرتی تھی مگر ایسا ہوتا نہیں تھا۔ تازہ بجھے ہوئے چولہے سے اٹھتی دھوئیں کی باریک لکیر ابھی تک فضا میں ہلکورے کھا رہی تھی۔ بجھتی ہوئی لکڑیوں میں سے کوئی لکڑی چٹختی تو دبی ہوئی چنگھاریاں حوصلہ پا کر ستاروں کی طرح چمکنے لگتی تھیں۔ نرم ہوا کے جھونکے برابر سے سرسراتے ہوئے گزرتے تو یہ ستارے مزید شریر ہو کر اُس کا ہاتھ تھام کر آنگن میں پھیل جاتے۔

رات سُست رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ گل پری ہاتھ میں چائے کی پیالی تھامے سر جھکائے ان جلتے بجھتے ستاروں کا کھیل دیکھ رہی تھی۔ بالکل اُس کی قسمت کی طرح کبھی لو دیتے، امید بڑھاتے تو کبھی اپنی چھب دکھا کر اندھیرے میں چھپ جاتے۔

پچھلی بار بھی شاہ در اُس سے ناراض ہو کر گیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اپنے ساتھ ساتھ اُسے بھی مایوس کر دیتی ہے پھر وہاں ہاسٹل میں اُسے ایک پل چین نہیں آتا۔ گل پری نے سوچا تھا کہ وہ آج ایسا نہیں کرے گی۔ اُس سے اچھی اچھی باتیں کرے گی۔ پیار کی، بہار کی، موسم کی، تتلیوں کی، بارش کی، پنچھیوں کی......مگر کیسے......!''

نور شیر کچھ عرصے تک تو گھر آئی نئی دلہن کی ناز برداریوں میں یوں معروف رہا کہ باقی سارے کام ثانوی ہو گئے اور پھر زمین نام کرنے والے معاملے پر بھی نور حسن سے کچھ کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگے۔

گھر میں دوبارہ اُس کی شادی کا تذکرہ ہونے لگا تھا۔ شاید جلد ہی کوئی تاریخ بھی طے کر لی جاتی۔ گل پری نے پریشان ہو کر شاہ در کو خبر کر ڈالی وہ فوراً چلا آیا تھا مگر کرتا کیا۔

گل پری کو اُس سے ڈھیروں شکوے تھے۔ شاہ در اُس سے محبت تو بے شک کرتا تھا مگر جی دار نہیں تھا۔ گل پری کا خیال تھا کہ شہر کی ہوا نے اُسے اور بھی بزدل بنا دیا ہے۔ پڑھا لکھا تھا تو زمانے سے ڈرتا تھا۔ اُسے احتیاط کے تقاضے

ازبر تھے مگر محبت کے پہاڑے یاد نہ رہتے تھے۔

اُس کے نزدیک گل پری چونکہ اب میر حسن کی منگ تھی اس لیے یہ سب اتنا آسان نہیں تھا جتنا وہ سوچ رہی تھی۔

اگر وہ ہمت کرتا اُس کا ہاتھ تھامتا تو گل پری اپنے باپ کے ارادوں سے ٹکرا جاتی، زمانے سے لڑ جاتی، رسموں رواجوں کو توڑ دیتی۔ پھر بھی بات نہ بنتی تو وہ اُس کے ساتھ گھر سے بھاگ جاتی۔ وہ عشق کی اِسی انتہا پر تھی سود و زیاں سے بے نیاز لیکن شاید شاہ در ایک سیڑھی نیچے کھڑا تھا۔

گل پری ایک بٹی ہوئی عورت بن کر زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ آخر اُس کی رگوں میں بھی تو نور شیر کا گرم جذباتی لہو دوڑتا تھا مگر صرف اُس کے اکیلے چاہنے سے کیا ہوتا تھا۔

شاہ در اُس کی ماں کی طرح ٹھنڈے دل و دماغ سے فیصلہ کرتا تھا۔ وہ نسل در نسل چلنے والی دشمنی سے ڈرتا تھا۔ یہاں کسی کی منگ یا منکوحہ پر ہاتھ ڈالنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔ جس کا خمیازہ نسلوں کو بھگتنا پڑتا تھا۔ روایات سے بغاوت کا مقدر موت تھی۔ رشتے خاندانوں کی باہمی رضا مندی سے طے پاتے تھے۔ جبھی تو نور شیر جیسا اڑیل مرد بھی خاندان کی مرضی کے آگے سر جھکانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ آج زمانہ بدل ضرور گیا تھا۔ گاؤں میں تعلیم عام ہو رہی تھی مگر روایات وہی پرانی تھیں۔ رسم و رواج قانون سے زیادہ معتبر سمجھے جاتے تھے۔

یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی شاہ در دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وہ گل پری سے تعلق توڑ نہیں سکتا تھا۔ اُس کی خوش امیدی اُسے ہر بار یہاں کھینچے چلی آتی تھی۔ وہ اُسے دیکھ کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھاتا۔ کچھ شکوے سنتا، کچھ امیدیں دلاتا، پھوپی سے دکھ سکھ کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا اور چلا جاتا۔

وہ دونوں اپنے انجام سے بے خبر اس ڈگر پر چلتے چلے جا رہے تھے۔ اُن کے نصیب میں کیا لکھا تھا۔ وصال یا ملال، وہ نہیں جانتے تھے اب تو جاننا بھی نہیں چاہتے تھے خاص کر شاہ در تو بالکل بھی نہیں۔ وہ مایوسی کی باتیں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا جبکہ گل پری قنوطی ہو رہی تھی۔ وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی مگر کچھ مانگنے کے بجائے اُداسی سے واپس گرا لیتی۔

نوشتۂ دیوار سامنے تھا۔ تقدیر لکھی جا چکی تھی۔ نور شیر کا کہا پتھر کی لکیر تھا۔ وہ جان دے اور لے تو سکتا تھا مگر اپنی زبان سے پھر نہیں سکتا تھا۔ ہاجرہ کی اُس کے آگے نہ کبھی چلی تھی نہ چلنے کا امکان تھا۔

آج انہیں جیسے گفتگو کا کوئی موضوع نہیں سوجھ رہا تھا۔ بار بار اُن کے درمیان ایک سنجیدہ سی خاموشی آ کر ٹھہر جاتی تھی۔ وہ تینوں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چپ ہو کر سوچنے لگتے کہ آخر اب زندگی کیسے گزرے گی۔

آج گل پری کے سوالوں کا شاہ در کے پاس کوئی امید بھرا جواب نہ تھا۔ گل پری سوچتی تھی کہ وہ میر حسن کے ساتھ کیونکر رہ پائے گی۔ میر حسن یہ تو نہیں جانتا تھا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے مگر یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ اُسے پسند نہیں کرتی، گل پری نے کبھی چھپانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی مگر میر حسن کو اِس کی مطلق پروا نہیں تھی۔ گل پری کے چاہنے نا چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہونا تو وہی تھا جو بڑوں نے طے کیا تھا۔ اُن کا سامنا ہونے پر وہ خاص اُسے چڑانے کے لیے مونچھوں پر تاؤ دے کر مسکراتا تھا۔

ہاجرہ جانتی تھی کہ اُس کی حساس دل بیٹی اُن پتھر جیسے لوگوں کے درمیان کبھی خوش نہیں رہ پائے گی۔ وہ جو کبھی اُس کے جذبات کا خیال نہ کرتے تھے اُس کی بیٹی کی کیا قدر کریں گے۔ وہاں قدم قدم پر اُس کی عزتِ نفس کو کچلا جائے گا اور وہ اتنی اَنا پرست اور خوددار ہے کہ ٹوٹ جائے گی مگر جھکے گی نہیں اُس کی طرح ادھوری دوغلی زندگی گزارے گی۔

باپ کا پیسہ اور ماں کا گھمنڈ، میر حسن تو سونے پہ سہاگہ تھا گل پری کی حیثیت وہاں ایک مفتوحہ علاقے کے علاوہ اور کیا ہوگی۔ ہاجرہ یہ سب جانتی تھی مگر جو کچھ ہونے جارہا تھا اُسے روکنے سے قاصر تھی۔ اُس کا دل اپنی بے بسی پر تڑپ رہا تھا۔ اپنے اندر کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے وہ شاہ در سے اُس کے کالج کے بارے میں لایعنی سوال کیے جارہی تھی جن کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ وہ گاہے بگاہے چائے کی چسکی لیتے ہوئے بے اختیاری میں ایک پُرشوق نگاہ گل پری کے چہرے پر ڈالتا پھر گھبرا کر ہٹالیتا جیسے اب نظر کر دیکھنے کا حق کھو چکا ہو۔

چند ہفتوں کی تو بات ہے پھر وہ ہمیشہ کے لیے پرائی ہو جائی تھی۔ مگر دل تھا کہ ہر بار کی طرح یہ حقیقت تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔ اُس کے دل کی کشمکش اُس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ گل پری بھی اُس کی نظروں سے بے خبر نہیں تھی۔ اُن کی تپش سے اُس کی پلکیں رخساروں پر لرز رہی تھیں۔ کبھی کبھار بے ارادہ ہونٹوں کے کناروں پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ بھی رقص کرنے لگتی مگر اگلے لمحے سہم کر دم توڑ دیتی پھر کبھی کبھی وہ مصنوعی خفگی سے شاہ در کو دیکھی جیسے پوچھ رہی ہو اب اِس لگاوٹ کا مقصد......

ہاجرہ یہ چوری پکڑ کر بھی جان بوجھ کر انجان بن جاتی تھی وہ ان معصوم پریمیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی تھی۔ پھر تو شاید ان لمحوں نے ایک خوبصورت مگر دل دکھا دینے والی یاد بن کر رہ جانا تھا۔

تبھی صحن کا بیرونی دروازے دھڑاک سے کھلا۔ اندر قدم رکھتے نور شیر کو دیکھ کر تینوں اپنی اپنی جگہ دھک سے رہ گئے نیلماں اپنے میاں کے ساتھ میکے دن گزارنے گئی ہوئی تھی۔ جس طرح وہ شاہ در کو دیکھ کر آنکھیں نچاتی، معنی خیز باتیں کرتی تھی اور بات بے بات گل پری پر فقرے کستی تھی شاہ در نے اُس کی موجودگی میں یہاں آنا چھوڑ دیا تھا۔ نور شیر بھی ایک شادی کی تقریب میں ضروری شرکت کا کہہ کر شام سے نکلا تھا ابھی اُس کا اتنی جلدی واپسی کا امکان نہیں تھا۔ اُس کے دوستوں کی محفلیں تو دیر تک چلتی تھیں۔

اپنے خیالوں میں انہیں باہر احاطے میں گاڑی رُکنے کی آواز ہی نہ سنائی دے پائی تھی۔ بڑا پھاٹک چوکیدار ہی کھولتا تھا۔ یوں باپ کو سامنے دیکھ کر گل پری کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس نے گھبرا کر دوپٹہ پیشانی تک سرکالیا۔ شاہ در نے سنبھل کر سلام کیا۔ نور شیر نے ایک لمحہ ٹھٹک کر انہیں دیکھا پھر رُکھائی سے سلام کا جواب دے کر تیز قدموں سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور وہاں سے کڑک کر ہاجرہ کو آواز دینے لگا۔ ہاجرہ ہڑبڑاتی ہوئی اٹھی اُس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہورہے تھے۔ وہ جوں توں پانی کا گلاس بھر کر کمرے تک پہنچی تھی۔

نور شیر ایک ہی سانس میں غٹاغٹ سارا گلاس چڑھا گیا پھر اُسے گھور کر بولا۔

''تو میرے پیچھے یہ سب ہو رہا ہے......

کیوں آیا ہے یہ یوں بے وقت؟''

''شہر واپس جا رہا تھا، مجھ سے ملنے آ گیا نمانا......'' ہاجرہ دبی دبی آواز میں بولی۔

''کیوں تجھ سے ملے بغیر اِس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا؟'' نور شیر غرایا۔

''شرم حیا بیچ کھائی ہے تم ماں بیٹی نے، جوان جہان بیٹی کو پیچھے غیر مرد کے ساتھ اکیلا چھوڑ آئی ہو، غیرت کہاں ہے تیری؟'' اُس کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ باہر صحن تک جا سکے۔

ہاجرہ صدمے سے سُن ہو گئی۔ نور شیر سے کون پوچھتا کہ اپنے بھائی کی غیر موجودگی میں اُس کی بیوی کے ساتھ قہقہے لگاتے تمہاری غیرت کہاں جا سوئی ہے۔''

''میرے بھائی کا بیٹا شریف ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا ہے۔'' وہ بمشکل بولی۔

''وہ کوئی غیر نہیں ہے، گل پری بچپن سے اُس سے مانوس ہے۔ اب تو وہ اپنے کمرے میں جا چکی ہے۔''

اُس کا اتنا جواب بھی نور شیر نے کہاں برداشت کرنا تھا۔

''میں نہ آتا تو نہیں جاتی ہاں......! بڑی تکلیف ہوئی ہو گی پھر میرے آنے کی؟ اتنا ہی شریف زادہ ہے تو کہہ دو اُسے میری غیر موجودگی میں میرے گھر میں نہ آئے۔ یا پھر میں جا کر کہہ دوں......!''

نور شیر سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اخلاق و مروت بالائے طاق رکھ کر یہ سب شاہ در کو صاف صاف کہہ بھی دیتا۔ یوں بھی اِس وقت اُس نے کون سی کسر چھوڑی تھی۔ ہاجرہ کے ہونٹ کانپنے لگے مارے رنج کے گلا رندھ سا گیا۔ ہر عورت کی طرح اُس سے بھی اپنے میکے والوں کی بے عزتی برداشت نہ ہوتی تھی۔ مگر کرنی پڑتی تھی۔ نور شیر اِن دنوں یوں بھی لڑنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ نیلماں اور فلک شیر کو ہنستا بولتا دیکھ کر اُسے اپنی زندگی کی ناکامیاں اور ستانے لگی تھیں۔

ہاجرہ مری مری چال کے ساتھ واپس لوٹی تو صحن خالی پڑا تھا۔ شاہ در کی چائے کا پیالہ یونہی بھرا ہوا چوکی پر دھرا تھا۔ گل پری اپنے کمرے میں لیٹی چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی۔ اُس نے ایک شکوہ بھری نگاہ ماں پر ڈال کر کروٹ بدلی تو منہ سے ایک آہ نکل گئی۔

ہاجرہ کی ٹھنڈی سانس میں اُس سے کہیں زیادہ درد تھا۔

☆......☆......☆

پھر انہی دنوں جب نیلماں ہواؤں میں اونچا اور اونچا اڑ رہی تھی اچانک وہ ہو گیا جس کا ہاجرہ نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ نور شیر بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح گھر میں داخل ہوا تھا۔ آج سورج آگ برسا رہا تھا اور اُس سے کہیں زیادہ قہر نور شیر کی آنکھوں میں تھا۔ غصے کی شدت سے اُس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنے کمرے میں بے خبر سوئے پڑے فلک شیر کو جھنجوڑا پھر تقریباً کھینچ کر بازو سے پکڑ کر پلنگ سے اُتارا تھا۔ فلک شیر اِس اچانک افتاد پر بدحواس ہو گیا۔

نور شیر جو کچھ کہہ رہا تھا وہ باہر کھڑی ہاجرہ کے پلے تو نہیں پڑ رہا تھا مگر بات جو بھی تھی، گھمبیر اور سنگین تھی۔ نور شیر کسی کو غائبانہ بک جھک رہا تھا۔ پھر ہاجرہ پوچھتی رہ گئی مگر وہ فلک شیر کو اپنے ساتھ لیے اُسی آندھی طوفان کی طرح باہر نکل گیا۔

ہاجرہ سراسیمہ تھی گل پری ناشتہ چھوڑ کر آ گئی

تھی۔ ملازمائیں منہ کھولے کھڑی تھیں سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ایسی کیا آفت آ گئی تھی مگر کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ گل پری نے ہی اندازہ لگایا کہ ضرور کوئی زمینداری کا پھڈا ہوگا۔ ہاجرہ کی فکر دوگنی ہوگئی گل پری شانے اُچکا کر دوبارہ اپنے ناشتے میں لگ گئی۔ بیچاری مشرقی بیویاں، شوہر سے سو گلے ہوں گے اور اُسے کچھ ہو جائے تو اتنی ہی پریشان بھی ہوں گی، اُس نے سوچا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہوگی اماں، بابا کی تو یونہی عادت ہے۔ ذرا سی بات کو بڑھا چڑھا کر ہنگامہ کھڑا کرنے کی۔'' اُس نے ہاجرہ کو اِدھر سے اُدھر چکر کاٹتے دیکھ کر آواز دی۔ ہاجرہ خفا ہوکر اُسے دیکھنے لگی۔ کبھی جو ملازماؤں کی موجودگی کا خیال کرلیں یہ باپ بیٹی۔

چین نہ آیا تو اُس نے لطیفاں کو پیچھے دوڑایا کہ معلوم تو کر کے آئے کہ ڈیرے پر کوئی جھگڑا ہوا ہے یا فلک شیر کی ہی شامت آئی ہے۔ وہ بیچارہ تو اپنی نیند پوری کر رہا تھا رات گئے تک بیوی کی ناز برداریوں میں جو لگا رہتا تھا۔ اُس کا تلوا گھر میں ٹکتا نہیں تھا روز کے سیر سپاٹے تھے۔ ابھی بھی اپنی کسی سہیلی سے ملنے اُس کے گھر گئی تھی۔ لطیفاں بدحواسی میں جوتی نہ ڈھونڈ سکی تو ننگے پاؤں ہی گلی تک نکل گئی۔ نکڑ تک پہنچی تھی کہ اُلٹے پیروں واپس پلٹ آئی۔ نور شیر کی گاڑی دھول اڑاتی چلی آرہی تھی۔ بڑا پھاٹک سرعت سے کھولا گیا۔ گاڑی احاطے میں آرکی نور شیر اُترا پھر اُس نے گھسیٹ کر کسی کو اُتارا اور دیکھنے والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ کوئی اور نہیں نیلماں تھی جسے دونوں بھائی بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے لیے چلے آرہے تھے۔

نور شیر نے ایک لات مار کر دروازہ کھولا اور نیلماں کو زور سے اندر دھکیل دیا۔ وہ نیلماں دن رات گھر میں جس کے نام کی مالا جپتی جاتی تھی اِس حال میں تھی کہ دوپٹہ پیروں میں رُل رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ طمانچوں سے سرخ تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اُسے بری طرح مارا پیٹا گیا ہو۔ نیلماں اِس دھکے سے صحن کے وسط میں فرش پر آ گری۔ دونوں بھائی دوبارہ اُس پر پل پڑے۔ نور شیر کے منہ سے گالیوں کا طوفان جاری تھا۔ فلک شیر کی آنکھوں میں بھی خون اُترا ہوا تھا۔ نیلماں اپنے بچاؤ کے لیے چلا رہی تھی مگر دونوں میں سے کوئی بھی اُسے بخشنے پر تیار نہ تھا۔

ملازمائیں حیران پریشان دم سادھے کھڑی تھیں۔ ہاجرہ کا بھی کچھ یہی حال تھا پھر یکلخت اُسے جیسے ہوش آیا۔ وہ بیچ بچاؤ کی کوشش کرنے لگی مگر نور شیر نے کھینچ کر اُسے دور ہٹا دیا۔

نیلماں ٹھوکروں کی زد میں آ کر اِدھر اُدھر لڑھک رہی تھی۔ وہ اب گڑگڑاتے ہوئے معافیاں مانگ رہی تھی۔

اُس کی حالت غیر ہو رہی تھی ہاجرہ سے نہ رہا گیا وہ ایک بار پھر درمیان میں آ گئی۔

''کچھ بتاؤ بھی تو کیا ہوا ہے۔ کیا لڑکی کی جان لو گے۔ ایسا کیا قصور کر دیا ہے اُس نے۔'' اُس نے سختی سے فلک شیر کا بازو تھام لیا۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ نور شیر غصے میں پاگل ہو جاتا ہے پھر اُسے کچھ سوجھائی نہیں دیتا مگر وہ نیلماں کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔ اِس بات پر اُسے یقین نہیں آرہا تھا۔

فلک شیر نے اُس کے لحاظ میں مجبوراً ہاتھ روک لیا مگر نور شیر نے بھنا کر دو چار ہاتھ اُسے بھی جڑ ڈالے۔ ہاجرہ کی آنکھوں کے سامنے

ترمرے ناچ اٹھے۔ وہ لڑکھڑائی تو گل پری جو اس دوران پرے رکھی چارپائی پر آرام سے بیٹھی یہ سارا تماشا یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی دلچسپ فلم دیکھ رہی ہو غصے سے اٹھی اور زبردستی ہی ہاجرہ کو تھام کر ایک طرف لے آئی۔

''رہنے دو ناں اماں......ان لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے، آپ ہی جانیں، ہم کون ہوتے ہیں بیچ میں پڑنے والے۔'' وہ باپ کے گھورنے کی پروا کیے بغیر اونچی آواز میں بولی۔

ہاجرہ کا دل نیلماں کو اِس بے دردی سے پٹتا دیکھ کر پسیج گیا تھا۔ وہ اُس کی ساری زیادتیاں بھول گئی تھی۔

''ارے مرجائے گی لڑکی۔'' اُس نے دہائی دی۔

''مرجانے دو، ہمارا کیا۔'' گل پری بے نیازی سے بولی۔ کبھی کبھی وہ بے رحمی کی حد تک بے حس ہوجاتی تھی۔

''ہاں بھرجائی یہ اِسی قابل ہے، میں اپنے ہاتھوں سے اِس کا گلا گھونٹ دوں تو اچھا ہے۔ یہ ایک ناگن ہے ناگن۔'' فلک شیر کی آواز غم و غصے کی شدت سے پھٹ رہی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

''اِس نے میرے پیار کی قدر نہیں کی، میرے اعتبار کا خون کر ڈالا۔ اِس نے میری عزت کو داغ لگا دیا، میں اِسے معاف نہیں کروں گا، کبھی بھی نہیں۔''

نیلماں بلک بلک کر رونے لگی۔ ہاجرہ کے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ فلک شیر کو اُس نے اتنا غصے میں اور یوں جذباتی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً کوئی بہت بڑی بات ہوئی تھی۔

''نیلماں پر ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات تھی فلک شیر نے تو کبھی اُس سے تیکھے لہجے میں بھی بات نہیں کی تھی۔ وہ سہہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔ کل تک سر آنکھوں پر بٹھائی جانے والی آج مٹی پر پڑی سسک رہی تھی۔ اُس کا بدن زخموں سے چور تھا۔ مگر دونوں مردوں کے دل میں کوئی رحم نہ جاگا تھا۔

''لیکن اِس نے کیا کیا ہے؟'' اُس نے ڈرے ڈرے انداز میں پوچھا۔ فلک شیر سے کچھ بولنا دوبھر ہو رہا تھا اُس نے نور شیر کی طرف دیکھا۔ نور شیر نے لطیفاں کے علاوہ باقی سب ملازماؤں اور اُن کے بچوں کو ڈانٹ کر وہاں سے بھگا دیا تھا۔ لطیفاں اُن کی پرانی وفادار تھی۔ ابھی اِس وقت یہاں اُس کی ضرورت تھی۔ وہ منہ میں انگلیاں ڈالے کھڑی تھی۔ رسوائی کی داستان اب چھپانی مشکل تھی مگر نور شیر اپنے منہ سے ہاجرہ کو یہ سب کیسے بتا سکتا تھا۔ مجبوراً فلک شیر کو ہی سارا قصہ سنانا پڑا۔

نیلماں کسی لڑکے کے ساتھ تنہائی میں ملتے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ لڑکا فرار ہوگیا وہ دھرلی گئی۔ بتانے والے نے یہ بھی بتایا کہ اُس لڑکے سے اُس کا پرانا یارانہ چل رہا تھا۔ وہ تو فلک شیر کے ساتھ شادی پر تیار ہی نہیں تھی مگر موٹی آسامی دیکھ کر گھر والوں کی رال ٹپک پڑی۔ انہوں نے بہلا پھسلا کر راضی کرلیا۔ شادی کے بعد بھی اُس نے اپنا چلن نہیں بدلا تھا۔ چوری چھپے اُس لڑکے سے ملتی رہی آج بھی سہیلی کے گھر کا بہانہ کر کے اُدھر ہی گئی تھی۔ کسی جاننے والے نے دیکھ کر نور شیر کو خبر کردی تھی۔

یہ سب دہراتے ہوئے فلک شیر کے جذبات بار بار بے قابو ہوتے رہے تھے۔ ہاجرہ سن کر ششدر رہ گئی۔ یہاں نیلماں کے ہنسی قہقہے، اُس

کے سولہ سنگھار، ناز نخرے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ یہاں ناخوش ہے اُس پر زبردستی کی گئی ہے۔ جانے وہ کس قماش کی عورت تھی۔ ایک طرف دونوں مردوں کو اُلو بنا رہی تھی۔ دوسری طرف چھپکے چھپکے اپنے عاشق سے ملتی تھی۔

نیلماں کی جان بخشی تو کردی گئی تھی مگر اندر کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ نور شیر نے نیلماں کو اناج کی کہن رسیدہ کوٹھری میں بند کردیا تھا۔ سب کو سختی سے ہدایت کردی گئی تھی کہ اُس کا دروازہ کھولنے یا اُسے کھانا پانی دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ اُسے زندہ رکھا گیا ہے۔ اب باقی کا فیصلہ اُس کے گھر والوں نے کرنا ہے۔ اُن لوگوں کو کہلوا دیا گیا تھا کہ آ کر اِس گند کو سمیٹ جائیں۔ وہ اِس کے ناپاک خون میں ہاتھ رنگ کر دنیا و عاقبت خراب نہیں کرنا چاہتے۔

لطیفاں کو نگرانی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ پوری طرح چوکس تھی۔

☆......☆......☆

وہ رات سب پر بہت بھاری گزری۔ فلک شیر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ وہ ہاجرہ کی قسم کے آگے مجبور ہو گیا تھا۔ ورنہ خود اپنے ہاتھوں اس بے وفا فریبی عورت کی جان لے لینا چاہتا تھا جسے اُس نے دیوانہ وار چاہا تھا۔ سارے خاندان سے ٹکر لے کر اپنایا تھا اور وہ اُس کے منہ پر بے وفائی کا جوتا مار گئی۔ نیند ہاجرہ کی آنکھوں سے بھی کوسوں دور تھی کبھی نیلماں دنیا کی ذلیل ترین عورت لگتی کبھی اُس کے زخموں اور دن بھر کی بھوک پیاس کا سوچ کر ترس آنے لگتا۔ نور شیر نے آج اُس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ تو شاید کسی جانور سے بھی نہ کیا جاتا ہو۔ نیلماں نے اُس کی ناک کے نیچے جو کھیل رچایا تھا اُس سے اِس کی غیرت و حمیت پر گہری چوٹ لگی تھی ہاجرہ کم از کم آج کی رات نور شیر کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جانتی تھی آج وہ بھرا ہوا ہوگا۔ عافیت اِسی میں تھی کہ وہ گل پری کے کمرے میں سو جائے۔ گھبراہٹ بڑھتی تو وہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے گل پری کی طرف دیکھتی تھی مگر وہ یوں بے سدھ سو رہی تھی جیسے بڑے دنوں کی بے آرامی کے بعد سکون کی نیند سوئی ہو۔

اُدھر اپنے کمرے میں نور شیر زخمی شیر کی طرح اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔ وہ خود کو عقلِ کل سمجھتا تھا۔ مگر بالشت بھر کی لڑکی اُس سے ہاتھ کر گئی تھی۔ وہ جب ٹھٹھے مار کر فلک شیر کے بونگے پن کا مذاق اڑاتی تھی تو وہ خوش ہو کر اِسے اُس کی شوخی اور زندہ دلی قرار دیتا تھا اُسے سب سے زیادہ غصہ خود کو بے وقوف بنائے جانے پر تھا۔ وہ جسے اپنی سمجھداری پر بہت ناز تھا۔ تحفے تحائف کے نام پر گھر کی نئی نویلی دلہن پر جانے کتنا پیسہ لُٹا چکا تھا اور یہی نہیں اپنی قیمتی زمین بھی اُس کے نام لکھ چکا تھا۔ یہ صدمہ بھی کچھ کم نہیں تھا اب سب سے پہلا کام اُسے یہی کرنا تھا کہ وہ کھاتے بدل لے ساتھ ہی وہ اپنے گریبان میں جھانکتا تو شرمسار ہوا جاتا تھا۔ سارا فتور اُس کی نیت کا تھا۔ آنکھوں پر نفس نے ایسی پٹی باندھی تھی کہ نہ عمروں کا فرق یاد رہا نہ رشتوں کا احترام، بظاہر وہ اس لگاؤ کو کوئی بھی نام دے دیتا مگر اصل حقیقت یہی تھی کہ اُس کے دل میں چور تھا۔ ایسا چور جس سے نیلماں بھی اچھی طرح واقف تھی اور جان کر اُسے اُکساتی تھی۔ رشتوں کا تقدس کچے دھاگے کی طرح تڑخ گیا تھا۔

ہاجرہ کی رات بڑی بے چینی سے کروٹیں

بدلتے کٹی تھی پھر جانے کس گھڑی جوں توں نیند آسکی تھی فجر کے لیے بھی آنکھ نہ کھل سکی۔ صبح بیدار ہوتے ہی اُسے پہلا خیال نیلماں کا ہی آیا۔

''نگوڑی کہیں جان سے ہی نہ گزر گئی ہو۔''

یہ سوچتے ہوئے وہ اُٹھ بیٹھی۔ دن چڑھ آیا تھا۔

کمرے سے باہر نکل کر دیکھا تو پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ اناج والی کوٹھری کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا تھا اور نیلماں کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔ لطیفاں غش پڑی سو رہی تھی۔ ہاجرہ نے دو ہتھڑ مار کر اسے جگایا۔ اُس کے ہائے واویلے پر سب جمع ہوگئے۔ نور شیر نے یہ جان کر اپنے سر کے بال نوچ لیے کہ نیلماں خالی ہاتھ نہیں گئی بلکہ اپنے ساتھ سارا زیور، قیمتی پرچہ جات اور سب سے بڑھ کر اپنے نام کی گئی اراضی کے کاغذات بھی ساتھ لے گئی ہے۔ اِس حالت میں بھی وہ پکا کام کرگئی تھی۔ اُس کی عیاری اور مکاری نے سب کو دنگ کر ڈالا تھا۔ نور شیر سب پر گرج برس رہا تھا۔ گھر کے ہر فرد سے پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔ فلک شیر کی نیند کافی گہری ہوتی تھی سر پر ڈھول بھی بجاؤ تو پتہ نہ چلے اُس کی الماری سے سب کچھ اتنی صفائی سے نکال لیا گیا تھا کہ اُسے خبر تک نہ ہوسکی تھی۔ یہ عقدہ نہ کھل سکا کہ نیلماں نے کوٹھری کا بند دروازہ کیسے کھولا جبکہ نور شیر نے اپنے ہاتھوں سے تالا لگا کر چابی فلک شیر کے حوالے کی تھی اور وہ پورے یقین سے کہہ رہا تھا کہ اُس نے اُسے چابیوں کے گچھے میں ڈال کر حفاظت سے تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ نور شیر کا کہنا تھا کہ یہ کسی گھر کے بھیدی کا کام ہے سب سے پہلا شک لطیفاں پر کیا گیا وہ تھر تھر کانپتے ہوئے اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہنے لگی کہ اُس کے فرشتے بھی بے خبر ہیں۔ وہ تو نور شیر کی ہدایت کے عین کوٹھری کے دروازے کے قریب بستر بچھا کر سوگئی تھی۔ رات بھر کی جاگی تھی سو صبح آنکھ لگ گئی تھی۔ لطیفاں یوں بھی اِس گھر کی پرانی وفادار نمک خوار تھی۔ نور شیر کے غیض وغضب سے خوب واقف تھی ایسی جرأت کرنے سے پہلے یقیناً سو بار سوچتی۔

باقی سب نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ شاید غلطی سے کوٹھری کا تالا صحیح طرح بند ہونے سے رہ گیا ہو۔ نیلماں جیسی کائیاں لڑکی کے لیے یہ موقع بہت تھا۔

ہاجرہ کے دل میں جانے کیوں ایک کھٹک سی تھی۔ اُس نے تنہائی میں گل پری کو کریدنے کی کوشش کی۔

''کیا کہتی ہو، یہ کس کا کام ہوسکتا ہے؟ یہ تالا کھلا رہنے والی بات میرے دل کو تو نہیں لگی، تمہارے بابا کو بھی یقین نہیں آیا ہے۔''

گل پری بے توجہی سے ہوں کہہ کر خاموش ہوگئی۔

''ظاہر ہے کوئی نہ کوئی تو اس سے ملا ہوا تھا ورنہ اکیلی وہ ایسا کیسے کرسکتی ہے' وہ تو زخمی بھی تھی۔ آخر وہ کون ہوسکتا ہے۔''

''میں کیا جانوں اماں، مجھے تو اِس قصے سے دور ہی رکھو' بابا جانے اور اُس کی چہیتی۔'' گل پری نے کورا سا جواب دے دیا۔

''یوں بھی میں تو بخار کی دوا کھا کر جو سوئی ہوں تو نماز کے لیے بھی نہیں اٹھی، بابا کے چلانے پر ہی آنکھ کھلی تھی۔ گئی تو گئی خس کم جہاں پاک۔''

''ارے ایسے کیسے...... میں تو سوچ رہی ہوں کہ کہیں فلک شیر نے ہی تو......'' ہاجرہ خیالی گھوڑے دوڑا رہی تھی کیا پتہ غصہ اُترنے پر فلک

شیر کے دل میں دوبارہ نیلماں کی محبت جاگ گئی ہو آخر عشق اندھا ہوتا ہے۔''

''یا پھر نیلماں نے لطیفاں کو موٹی رقم کا جھانسا دیا ہو۔ وہ لالچ میں آ گئی ہو......اب ڈراما کر رہی ہو۔''

''کیوں پریشان ہوتی ہو اماں، بس خاموش رہو اور تماشا دیکھو۔'' گل پری زچ ہو کر بولی۔

''تماشہ لگانے والوں کا بھی کبھی تماشہ لگنا چاہیے۔'' ہاجرہ افسوس بھری نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ گھر میں ایسا سوگ طاری تھا جیسے مرگ ہوگئی ہو ایک گل پری جو چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت لیے یوں روزمرہ کے معمولات میں لگی تھی جیسے کسی سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

یہ تو سب جانتے تھے کہ گل پری اور نیلماں کی آپس میں نہیں بنتی تھی اس لیے اِس اطمینان پر کسی کو حیرت نہیں تھی مگر ہاجرہ کو کچھ بناوٹ کا گمان ہوتا تھا۔ اُس نے جب بھی پوچھنا چاہا گل پری طرح دے گئی۔ ہاجرہ گھما پھرا کر سوال کرتی تو وہ چڑ جاتی تھی۔ اُس روز بھی کہنے لگی۔

''ہمیں کیا کہ وہ کیوں اور کیسے چلی گئی؟ چلی گئی اچھا ہوا...... مجھے تو اتنے دنوں بعد ایسے مزے کی نیند آئی ہے تجھے پتہ نہیں کیا بے چینی ہے۔''

ہاجرہ بے چین اس لیے تھی کہ اگر جو اِس سارے معاملے میں گل پری کا ہاتھ ہوا تو نور شیر نے اُسے معاف نہیں کرنا تھا۔

''جو بھی ہوا ہے بہت غلط ہوا ہے، کچھ پتہ بھی ہے وہ اپنے ساتھ کیا کیا لے گئی ہے، کنگال کر گئی ہے۔ اور تو اور اپنے ساتھ زمین کے کاغذ بھی لے گئی ہے۔ تیرا بابا بہت پریشان ہے، کہتا ہے کبھی بھی دعوا کر سکتی ہے۔''

دونوں بھائی آج کل سر جوڑے اِسی موضوع پر بات کرتے رہتے ہیں۔

''ہاں تو اپنے کیے کو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔'' گل پری بولی۔

''ویسے تو انسانوں کی بڑی پرکھ تھی بابا کو، شاہ در ایک نمبر کا نکما اور لفنگا تھا، اب وہ پرکھ کیا ہوئی، ایک عورت کے حسن نے سب کے ہوش خطا کر دیے۔''

''باپ ہے وہ تمہارا۔'' ہاجرہ نے برا مان کر ٹوکا گل پری نے سر جھٹک ڈالا۔

''وہ عورت نہیں تھی فتنہ تھی فتنہ، چھل پیری، چڑیل، حرافہ، بدکردار۔'' ہاجرہ کو جتنی گالیاں آتی تھیں سنا ڈالیں۔ گل پری بیٹھی ہنستی رہی۔ ڈوبنے والے کا ساحل پر سے نظارہ کرنے کا لطف ہی کچھ اور تھا اونٹ پہاڑ کے نیچے آ چکا تھا نور شیر اور فلک شیر کی حالت اِن دنوں اُس شکاری جیسی ہو رہی تھی عین وقت پر جس کے ہاتھوں سے شکار نکل گیا ہو۔ وہ کہتے تھے کہ اِس سے بہتر ہوتا وہ نیلماں کو اُسی وقت مار ڈالتے۔ غیرت کے نام پر قتل کی تو رعایت مل ہی جاتی ہے۔

''میری بھولی ماں عورت کو زبردستی قید نہیں کیا جا سکتا، ابھی بھی وقت ہے بابا کو سمجھا دے اُس کا پیچھا نہ پکڑے۔ اور خواری ہوگی، وہ کسی اور سے عشق کرتی ہے اماں، یہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔'' ہاجرہ بری طرح چونک گئی۔

''یہ سب تجھے کس نے کہا؟''

''خود اُسی نے۔'' گل پری نے بڑی سہولت سے انکشاف کیا۔ ہاجرہ پوچھ نہ سکی یہ راز و نیاز کب ہوئے ٹکر ٹکر اُس کی صورت دیکھتی رہ گئی تو اُس کا بدترین اندیشہ درست ثابت ہوا تھا گل پری کچھ نہ کچھ ضرور چھپا رہی تھی۔

''شاید ایک روز میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوگا۔'' گل پری بولی۔

''چپ کر جا تیرے بابا نے سن لیا تو جان سے مار ڈالے گا۔'' ہاجرہ اُس کے ارادوں سے بری طرح ڈر گئی۔

''تو مار دے، ویسے بھی اب جینا کون چاہتا ہے، اچھا ہے حرام موت سے بچ جاؤں گی۔'' گل پری مطلق خوف زدہ نہ ہوئی ہاجرہ کے ذہن میں پہلے ہی کچھ کم اُلجھنیں نہیں تھیں گل پری اُسے اور پاگل بنا رہی تھی اُس نے گھبرا کر اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا گل پری، گل پری خدا کے لیے چپ کر جا، کیوں اپنے ساتھ میری بھی شامت لاتی ہے۔ تیرا بابا باؤلا ہوا پھر رہا ہے کچھ تو خوف کر۔''

گل پری اُس کا ہاتھ ہٹا کر کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

''اماں یوں ڈر ڈر کر جینا بھی کوئی جینا ہے، نیلماں کو دیکھ، وہ یہاں خوش نہیں تھی جانا چاہتی تھی چلی گئی۔'' ہاجرہ اُس سے یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا اُس نے نیلماں کی مدد کی تھی مگر اس خیال سے زبان روک لی کہ کہیں گل پری سچ مچ اقرار ہی نہ کر ڈالے۔

''خوش نہیں تھی۔'' اُس نے جل بھن کر کہا۔

''اور وہ جو تیرے باپ اور چچا کے ساتھ چھلیں کرتی تھی وہ کیا تھا؟''

''وہ اُس کا اُن سے انتقام تھا۔'' گل پری نے اپنا چہرہ اُس کے قریب لاتے ہوئے پُراسرار سے انداز میں سرگوشی کی۔ ہاجرہ نے اُس کی بات پر غور کیا تو سُن ہوگئی۔ نیلماں دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کرنا چاہتی تھی۔

برداشت کی حد ختم ہوگئی اُس نے صاف سیدھا سوال کر ڈالا۔

''اور تُو نے اُس کا ساتھ کیوں دیا؟'' شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہی تھی۔ گل پری اتنا کچھ جانتی تھی۔ اتنی حمایت کر رہی تھی تو یقیناً اُس رات وہ نیلماں سے ملی تھی اور ہوسکتا تھا کہ فلک شیر کی الماری سے سارا سامان بھی وہی نکال لائی ہو۔ ایسے کاموں میں اُسے بڑا مزہ آتا تھا۔

گل پری کو اِس سوال پر کوئی حیرت نہ ہوئی جیسے وہ جانتی تھی کہ ایک نہ ایک روز اُس کی ماں ضرور بات کی تہہ تک پہنچ جائے گی اُس کی آنکھیں اُس شرارتی بچے کی طرح چمکنے لگیں جس نے اپنا پسندیدہ کھلونا چُرالیا ہو۔

''یہ میرا انتقام ہے۔''

☆......☆......☆

یہ اطلاع تو مل ہی چکی تھی کہ لڑکی اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔ دونوں بھائی ابھی نیلماں کے گھر جا کر انہیں ڈرانے دھمکانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ایک اور خبر بم کی طرح پھٹی۔

نیلماں اور اُس کے گھر والوں کی طرف سے اُن کے خلاف علاقے کے تھانے میں پرچہ کٹوایا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ دونوں بھائیوں نے لڑکی کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ اُس کی جان لینا چاہتے تھے۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح اُن کی قید سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگئی۔

سب سے شرمناک الزام یہ لگایا گیا کہ اُس کا جیٹھ اُس پر بری نگاہ رکھتا تھا۔ وقوعہ کے روز بھی اُس نے لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور جب اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکا تو اُلٹا اُس پر گھناؤنا الزام لگا کر اُس کے شوہر کو ساتھ ملا کر مار پیٹ کی۔ یہی نہیں وہ لوگ حق مہر میں دی گئی زمین بھی واپس چھین لینا

چاہتے ہیں۔ اُسے جان و مال کا تحفظ فراہم کی جائے اور شوہر اور جیٹھ کے خلاف کارروائی کی جائے۔

تھانے دار نے پرانے مراسم کی وجہ سے باقاعدہ کوئی کارروائی ڈالنے کی بجائے نورشیر کو تھانے میں بلوالیا۔ نورشیر یہ پولیس رپورٹ پڑھ کر شرم کے مارے زمین میں گڑ کر رہ گیا۔ وہ لوگ تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ نیلماں اور اُس کے گھر والے اپنی عزت کے خیال سے چپ سادھ لیں گے اور معاملہ آپس میں ہی طے پاجائے گا۔ دھونس دھمکی سے نہ صرف زمین واپس لے لیں گے بلکہ تین لفظ بول کر جان خلاصی بھی کر لی جائے گی اب ایسی عورت کو گھر میں کیا رکھنا تھا مگر یہاں تو اُلٹی آنتیں گلے پڑ رہی تھیں۔

طبی رپورٹ میں بھی لڑکی پر تشدد اور دست درازی کی ہوئی تھی۔ اب تو دونوں بھائی صحیح معنوں میں پریشان ہوگئے۔ ابھی پکا پرچہ نہیں کٹا تھا۔ تھانیدار صلح صفائی کا مخلصانہ مشورہ دے رہا تھا۔ جس پر وہ لوگ تیار نہیں تھے۔

لاکھ چھپانے کی کوشش کے باوجود یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ پہلے بھی دبی دبی زبان میں سوال کر رہے تھے اب تو جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔

نورشیر کی بہنوں کو اطلاع پہنچی تو وہ میکے دوڑی چلی آئیں۔ نورحسن کی بیوی شاکرہ بھی بن ٹھن کر بڑے طمطراق سے آئی اور بظاہر دُکھ اور پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے سینہ کوبی کرتے ہاجرہ کو زبردستی گلے لگا کر ٹسوے بہانے لگی۔

''ہائے ہائے ربا یہ کیا ہوگیا، بھائی جی کی برسوں کی عزت خاک میں مل گئی۔ ارے جوانی کی بات اور تھی مگر اب اِس عمر میں بھائی جی ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ اور وہ بھی...... توبہ توبہ...... سارے میں تھو تھو ہو رہی ہے...... دشمنوں کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا ہے۔ ہم تو لوگوں سے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔'' ہاجرہ نے جواباً رونا چاہا مگر باوجود کوشش کے آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکال سکی۔ جذبات مردہ ہوچکے تھے وہ کچھ بھی محسوس نہ کر رہی تھی نہ حیرت، نہ صدمہ، نہ دکھ نہ افسوس۔ اُس کی نندیں اُس کی دلجوئی میں لگی تھیں۔ انہوں نے شاکرہ کو سمجھایا بھی تھا مگر وہ جب تک بیٹھی رہی ہمدردی کے پردے میں زخموں پر نمک ہی چھڑکتی رہی۔

گل پری ہاجرہ کے پہلو میں چپ چاپ بیٹھی اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر خاموش دلاسا دیتی تھی۔

نورشیر کسی سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ چند ہی دنوں میں اُس کے سارے کس بل نکل گئے تھے۔ کندھے جھک گئے تھے وہ کبھی بھائی کو وضاحت کرتا کبھی بیوی کے آگے صفائی پیش کرتا تھا۔ شاید اُس کے ضمیر نے اُسے احساس دلایا تھا کہ اُسے ہاجرہ کی آہ لگی ہے۔ وہ سر جھکائے ہاجرہ کے پاس آتا، دبے دبے الفاظ میں اُس سے معافی مانگتا۔ یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ وہ برا آدمی ضرور ہے مگر اتنا بھی بُرا نہیں ہے۔ اُس نے کبھی نیلماں کو بری نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے جیسی ذلیل حرکت کی ہے۔ ہاں اُس نے بے تکلف ہونے کی غلطی ضرور ہوئی تھی اور اُس پر وہ شرمندہ ہے۔

وہ گڑگڑاتا تھا کہ اب وہی اُس کے حق میں گواہی دے سکتی ہے کہ اُس کا دامن بے داغ ہے، بیوی کی گواہی بڑی معتبر ہوتی ہے۔

''تم کہو گی تو سب یقین کرلیں گے، سب

جانتے ہیں کہ تم کتنی سچی اور صابر عورت ہو۔''
ہاجرہ کی خوبیاں جیسے اُس پر اب کھلی تھیں۔
''میری عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔
کہہ دو کہ وہ جھوٹی کمینی عورت ہے۔''
ہاجرہ بس خاموشی سے اُسے دیکھتی اور سنتی تھی۔ وہ کیسے گواہی دیتی اور کس کے حق میں دیتی۔ وہ کیسے بتاتی کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا، نیلماں کے الزام میں کتنی حقیقت ہے اور نور شیر کے جھٹلانے میں کتنی صداقت۔

نیلماں کا واویلا سچا ہے یا نور شیر کی منت سماجت جو کچھ اُس کی آنکھوں نے دیکھا تھا اُس کے لحاظ سے تو کوئی بھی معصوم نہیں تھا جانے کس پردے میں کون چھپا تھا۔

گل پری کو تو اب بھی یہی لگتا تھا کہ اُس کا باپ اپنی جان بچانے کے لیے اچھا ہونے کا ڈھونگ کر رہا ہے۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اُس کی ہمدردیاں اب بھی نیلماں کے ساتھ تھیں۔ اُسے نیلماں کو آزاد کرانے پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ بقول اس کے یہ سب اُس نے اپنے ضمیر کی آواز پر کیا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ نیلماں سچ کہہ رہی ہے۔ یہ سن کر ہاجرہ کا دل ڈوب جاتا تھا۔

گاؤں میں ہر طرف یہی چرچا تھا۔ نور شیر کا گھر سے نکلنا دوبھر ہو گیا تھا۔ لوگ اُسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے تھے۔ اُس کے منہ پر تو یہی ظاہر کرتے جیسے اُس پر یقین ہو مگر پیٹھ پیچھے اُس کے خلاف بولتے تھے۔

بھلا کوئی عورت اپنی عزت و ناموس کی پروا کیے بغیر اپنے باپ جیسے جیٹھ پر اتنا بڑا الزام کیسے لگا سکتی ہے۔ کوئی تو بات ضرور ہو گی اور پھر نور شیر کا اپنا ماضی بھی کوئی ایسا قابل ذکر نہیں تھا۔ پرانی عادتیں بھلا کیسے بدلی جا سکتی ہیں۔ یہ باتیں نور شیر کے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں اور فلک شیر کے بھی۔

دونوں بھائیوں نے ضمانت قبل از گرفتاری کروالی تھی پھر بھی تھانے کے چکر پہ چکر لگ رہے تھے۔ تھانے دار پر اوپر سے بڑا دباؤ تھا۔ نیلماں کے گھر والے اپنی فریاد لیے ہر جگہ پہنچ رہے تھے۔ پھر سُنا کہ وہ لوگ معاملہ اخبار اور ٹیلی ویژن تک لے جانے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ یہ سن کر نور شیر کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔

نیلماں کے گھر والوں کی ثابت قدمی دیکھ کر اب تو فلک شیر کے دل میں بھی شک سر اٹھانے لگا تھا کہ کہیں نیلماں ہی مظلوم نہ ہو۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے تو کچھ نہیں دیکھا تھا۔ بھائی کے کہے پر ہی یقین کیا تھا کیا پتہ وہی!

اُس کی آنکھوں کا یہ سوال پڑھ کر نور شیر کٹ کر رہ جاتا۔ وہ دن بدن تنہا ہوتا جا رہا تھا۔ زمین ہاتھ سے گئی سو گئی عزت بھی جاتی دکھائی دیتی تھی۔ چھوٹا بھائی اُکھڑا اُکھڑا رہنے لگا تھا تو منجھلے کے تیور بھی بدلتے دکھائی دے رہے تھے۔ اُس روز نالاں سے انداز میں کہہ بھی بیٹھا۔
''آپ نے ہمیں برادری میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ کچھ تو سوچا ہوتا کہ گھر میں جوان بچے ہیں۔''
نور شیر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔
''مگر یار میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی نور حسن ساری عمر اس سے دبتا رہا تھا اُس کے منہ سے ایسی بات سُننے کی اُسے امید یں تھی۔
''کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، بدنامی تو ہو رہی ہے...... بد سے بدنام بُرا، کیا ضرورت تھی لڑکی پر

ہاتھ اٹھانے کی؟ کچھ طریقے سے بات سنبھالی ہوتی، بڑوں کو بیچ میں ڈالا ہوتا، ہر جگہ یہ دادا گیری نہیں چلتی، پتہ تو ہے کیسے کمینے شودے لوگ ہیں۔ میں تو پہلے ہی بھانپ گیا تھا مگر آپ کی عقل پر پردہ پڑا تھا۔ پہلے کبھی کسی کی سنی ہے جو تب سنتے۔''

نور حسن کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔ نور شیر کے آگے آنکھ نہ اٹھانے والا بھائی آج اُسے تقریباً جھڑک رہا تھا۔

''سر پر چڑھ کر ناچ رہے ہیں وہ لوگ، بیچ بازار میں پگڑی اچھل رہی ہے۔ ہم تو تین میں نہ تیرہ میں، مفت میں گھر بیٹھے بدنام ہو رہے ہیں۔'' نور شیر کا سر جھک گیا اُس کے پاس جواب میں کہنے کو کچھ نہ تھا۔

''اور آپ کی عادتیں! معاف کرنا بھائی جی لوگوں کو قائل کرنا بڑا مشکل ہو رہا ہے۔ خاص کر میں تو اپنے گھر میں بہت مشکل میں ہوں۔''

اُس کی پریشانی سمجھ میں آتی تھی۔ اُس کی ہونے والی بہو کا باپ اور زیادتی! شرم سے ڈوب مرنے والی بات تھی۔ شاکرہ یوں بھی اپنی خاندانی شرافت ونجابت کے گُن گاتی رہتی تھی۔ اُس کے میکے والوں میں بڑے بڑے سرکاری عہدے دار تھے جن کی پہنچ کافی دور تک تھی۔ مگر اس معاملے میں کوئی مدد کرنے کی بجائے اُس نے ہری جھنڈی دکھا دی تھی کہ وہ تو ایسی شرمناک بات کسی کے سامنے منہ سے نکالنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ میکے میں خواری ہی ہوگی۔

آخر نور شیر کے کچھ خیر خواہوں نے نیلماں کے گھر والوں کو سمجھا بجھا کر معاملہ پنچائیت میں لانے پر رضا مند کرلیا تاکہ بات آپس میں ہی رفع دفع ہو جائے۔ نور شیر کو بھی چارو ناچار راضی ہونا پڑا۔

فلک شیر اکھڑا اکھڑا رہتا تھا اُس نے نور شیر سے بات کرنا چھوڑ رکھی تھی۔ اُسے دیکھ کر کنی کترا کر گزر جاتا تھا۔ نور شیر کے دل کو ایک چوٹ لگتی تھی۔ فلک شیر کو اُس نے اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھا تھا۔ یہ بیگانگی اُس کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ سب سے زیادہ اِسی بات پر پریشان تھا۔

اور اُس روز تو جیسے اُس پر پہاڑ ٹوٹ پڑا جب بھری پنچائیت میں فلک شیر نے یہ کہہ ڈالا کہ وہ اِس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نیلماں پر ہاتھ اُس نے اپنے بھائی کے اشتعال دلانے پر اٹھایا تھا ورنہ اپنی بیوی کے کردار میں اُس نے کبھی کوئی خامی نہیں دیکھی۔

پنچائیت میں یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ جس لڑکے کے ساتھ نیلماں کا نام جوڑا جا رہا تھا۔ وہ اُس کی شادی کے فوراً بعد سے نوکری کے سلسلے میں ملک سے باہر جا چکا ہے۔ اور اِن دنوں وہی ہے۔ نور شیر اپنے کم زور دلائل کے ساتھ تنہا رہ گیا اور نیلماں نے رو رو کر اپنی بے گناہی کی دہائی دی، اپنے زخم دکھائے اور خود پر ڈھائے جانے والے مظالم کی تفصیل سنائی۔

پنچوں کی ہمدردی واضح طور پر نیلماں کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی اور لوگ بھی اُس کے طرفدار تھے اُن کی ملامت بھری نگاہیں نور شیر کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ اُس کا واحد گواہ بھی مُکر چکا تھا کہ شاید اُسے کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ فیصلہ سنانے کے لیے دو دنوں کی مہلت دی گئی نور شیر کو اس بیچ خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لینے کا کہا گیا۔

نور شیر کے آگے کنواں تھا اور پیچھے کھائی۔ ایک نہایت معتبر ذریعے سے اُسے خبر ملی تھی کہ

فیصلہ اُس کے خلاف ہونے جارہا ہے۔ نیلماں کے گھر والوں کی طرف سے زمین کی فوری منتقلی، زرتلافی کے لیے ایک معقول رقم اور عزت کے بدلے عزت کے طور پر نیلماں کے ماموں کے لیے رشتہ طلب کیا گیا تھا۔ وہی اِس سارے معاملے میں پیش پیش تھا۔

گل پری کے علاوہ نور شیر کی اور کوئی بیٹی نہیں تھی۔ خاندان میں اور کوئی کنواری لڑکی نہیں تھی نہ ہی بیاہی حاملہ تھی کہ بدلے میں اُس کے پیٹ کی اولاد کا رشتہ لکھ دیا جاتا۔ گاؤں میں یہ عام چلن تھا۔ نیلماں کا ماموں گل پری سے عمر میں دُگنا تھا مگر خون خرابہ روکنے یا صلح صفائی کرنے کے لیے پنچایت ایسے بے جوڑ رشتے طے کرتی ہی تھی اور فریق ثانی کو یہ فیصلہ قبول کرنا پڑتا تھا۔ ماضی میں ایسے ہی کئی فیصلوں کی نور شیر نے بڑھ چڑھ کر تائید کی تھی۔ انہیں سراہا تھا اور انصاف کے عین مطابق قرار دیا تھا۔ اب یہ انصاف اُس کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

نور شیر یوں چلتا ہوا گھر پہنچا جیسے کوئی کانٹوں میں گھسیٹ رہا ہو۔ ہاجرہ کو بتائے بغیر چارہ نہ تھا اُس نے سنا تو غش کھا کر گر پڑی۔ پھر ذرا سنبھلی تو گل پری کو گلے لگا کر رونے لگی۔

اُن کے ساتھ کوئی انہونی ہونے نہیں جارہی تھی۔ گاؤں کے عام رواجوں میں یونہی بھیڑ بکریوں کی طرح عورت کے نصیب کے فیصلے کئے جاتے تھے۔ مردوں کے جرم کی سزا اُس کے گھر کی عورتوں کو بھگتنی پڑتی تھی۔

نور شیر لمبی مسافت طے کرکے آنے والے مسافر کی طرح جا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔

ہاجرہ جان گئی کہ اپنے تئیں وہ فیصلہ قبول کرچکا ہے تبھی اتنے سکون سے پڑا ہے۔ اُس

نے روتے روتے تڑپ کر کہا۔
''میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی' ارے اس سے تو وہ میر حسن ہزار گنا اچھا تھا، مجھے تو وہ ہی اپنی بیٹی کے قابل نہیں لگا تو یہ کیسے، شرابی جواری بڈھا، یہ تو کبھی بھی نہیں ہوگا۔''
گل پری ستے ہوئے چہرے کے ساتھ اُس کے آنسو پونچھ رہی تھی۔
''میں تیرے باپ سے صاف کہہ دوں گی کہ میں اپنی بیٹی کا سودا نہیں ہونے دوں گی، یہ کوئی انصاف نہیں ہے۔'' بڑے دنوں بعد ہاجرہ کی چپ ٹوٹی تھی وہ اونچا اونچا بول رہی تھی۔
''تم نے کہا اور وہ مان گیا۔'' گل پری بہتے آنسوؤں کے ساتھ آہستگی سے بولی۔
''اماں بابا نے تجھے یونہی خبر نہیں دی، اپنا فیصلہ سنایا ہے۔ اُس کے لیے تو یہ بہت سستا سودا ہے۔ اُس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اُترا ہوگا۔''
''وہ کون ہوتا ہے فیصلہ کرنے والا، میری بیٹی کوئی ڈھور ڈنگر نہیں ہے۔ جس کھونٹے سے چاہا باندھ لیا، جو چاہے بولی لگالی۔'' آج پہلی بار ہاجرہ بیٹی کے حق کے لیے آواز اُٹھا رہی تھی اور پہلی بار گل پری اُسے چپ کروا رہی تھی۔
''یہ پنچایت کا فیصلہ ہے، پنچایت کو انکار کرے گا تو جیل کاٹے گا...... کوڑوں کی سزا ملے گی۔ بابا کو اپنے نرم بستر کے بغیر ایک رات نیند نہیں آتی۔ جیل میں کیسے رہے گا اور کوڑے لگیں تو سنا ہے بہت درد ہوتا ہے۔'' گل پری بولی تو ہاجرہ کو سوچ کر جھرجھری آگئی۔ پھر اُس نے اپنا منہ پیٹ لیا۔
''سب تیری ناشکری کی سزا ہے۔ سب تیرا قصور ہے۔'' وہ بھینچی بھینچی آواز میں اپنا غم و غصہ گل پری پر اُتارنے لگی۔
''سیاپا ڈالا ہوا تھا۔ کیا خرابی تھی میر حسن میں۔ مگر نہیں تجھے تو من مانی کی عادت ہے۔ باپ دشمن لگتا تھا اور وہ کلموہی جیسے سجن تھی تیری، نہ تو نے اُسے بھگایا ہوتا نہ یہ دن دیکھنا پڑتا۔ اسی لیے تو کہتی تھی مردوں کے کاموں میں دخل نہ دیا کر...... تو نے اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی برباد کر ڈالا۔'' نور شیر کے سن لینے کا ڈر نہ ہوتا تو شاید وہ پھٹ پڑتی۔
گل پری نے اسے بولنے دیا اتنے دنوں کی چپ تھی اندر کا غبار نکل جانا تو اچھا تھا وہ خود کو قصور وار مان رہی تھی۔ نیلماں سے ہمدردی اُسے واقعی مہنگی پڑی تھی۔ اپنی بنا سوچے سمجھے کچھ کر گزرنے کی عادت اُسے اکثر نقصان پہنچاتی تھی۔ وہ تو تب بس کسی بھی طرح اپنے باپ کو سبق سکھانا چاہتی تھی۔ بعد میں کیا ہوگا یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ پھر معاملہ سنگین سے سنگین تر ہوتا چلا گیا۔ اُسے کسی ہمدرد کی سخت ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکے مگر ایسا کوئی نہ تھا۔ شاہ در ایک دو بار آیا ضرور تھا مگر ڈھنگ سے بات ہی نہ ہوسکی تھی۔ اُس وقت گھر میں مہمانوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا اُس کی پھوپیاں اپنے بال بچوں کے ساتھ گھر میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ہاجرہ تو اِن دنوں خود اُس کے سہارے کی محتاج تھی۔
اپنے کمرے میں لیٹا نور شیر ماں بیٹی کی دبی دبی آہ و زاریاں سنتا رہا۔ آواز نیچی ہوجانے کی وجہ سے اُسے کچھ ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر بیوی کا احتجاج اور بیٹی کی تسلیاں سمجھ میں آرہی تھیں۔
ہمیشہ گل پری ہی اُس کے کسی ناپسندیدہ فیصلے

پر احتجاج کرتی تھی۔ اُسے سنانے کے لیے اونچا اونچا بڑبڑاتی تھی اور ہاجرہ اُسے صبر کی تلقین کرتی تھی مگر آج معاملہ اُلٹا ہو رہا تھا۔ نور شیر گل پری کی طرف سے بے خبر نہیں تھا مگر جان بوجھ کر انجان بنتا تھا۔ ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال لیتا تھا۔ وہ بیٹی ذات کو زیادہ سر چڑھانے کا قائل نہیں تھا۔ اُس کی توجہ کا تمام تر مرکز فلک شیر تھا۔ پھر اُس کے بعد اُس کی بیوی وہ خوبصورت چڑیل......

☆......☆......☆

شام رات میں ڈھل گئی نور شیر چت پڑا جانے کون کون سی گتھیاں سلجھاتا رہا۔ آج گھر میں چولہا تک نہ جلا تھا۔ ہاجرہ کمرے سے باہر نہ نکلی تھی۔ گل پری بھی وہیں پڑی تھی لطیفاں جھانک کر واپس پلٹ گئی۔ گھر کے ماحول کی وجہ سے وہ بھی سہمی سہمی رہنے لگی تھی۔

اندر کمرے سے آتی آوازیں اب تھم چکی تھیں اور موت کا سا سکوت طاری ہو گیا تھا۔ نور شیر کے اندر اچانک ایک ہول سا اٹھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا پھر پاؤں میں جوتی پھنسا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے نکل گیا۔

اُس کی منزل نور حسن کا گھر تھا۔ یوں بے وقت اپنے دروازے پر اُسے کھڑا دیکھ کر نور حسن نے پریشان ہونا ہی تھا۔

''خیر تو ہے بھائی جی، گھر میں تو سب خیریت ہے۔'' نور شیر وحشت زدہ سا اندر چلا آیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

''پنچایت اپنا فیصلہ سنانے لگی ہے۔'' اُس نے بھائی کو خبر دی۔

''اللہ خیر کرے گا۔'' نور حسن نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے حقے کی نے اپنے منہ میں لگالی۔

اُس کے گھر کی فضا مکمل طور پر پُرسکون تھی۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ روزمرہ کے معمول کے مطابق دالان میں بچھی منقش پایوں والی چارپائی پر اپنے کھیس پر نیم دراز حقے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سامنے ٹیلی ویژن پر خبرنامہ چل رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بیوی سے دلداری بھی ہو رہی تھی، جو ابھی ابھی سامنے والی کرسی سے اُٹھ کر نور شیر کو سلام کرتی اندر کمرے میں جا چکی تھی۔

وہ آج کل نور شیر سے یوں پردہ کرنے لگی تھی جیسے وہ کوئی گلی کا غنڈہ بدمعاش ہو نور شیر کو یوں آتا دیکھ کر شاکرہ کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اُس نے معنی خیز نظروں سے نور حسن کو دیکھا پھر پیشانی پر شکنیں لیے اندر جا کر آڑ میں کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ دونوں بھائیوں کو زیادہ تنہائی کا موقع نہیں دیتی تھی اُس کا خیال تھا کہ نور شیر اُس کے شوہر کو اُس کے خلاف بھڑکاتا ہے۔

نور حسن کے سرہانے کی طرف رکھی لکڑی کی قدیمی گول ٹیبل پر پلیٹ میں کٹے ہوئے مختلف پھل رکھے تھے۔ اُس نے پلیٹ اُٹھا کر نور شیر کی طرف بڑھائی مگر اُس نے بے دلی سے نفی میں گردن ہلادی۔ ایک نگاہ میں اطراف کا جائزہ لے کر وہ عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوا تھا۔ اِس وقت جب اُن لوگوں پر ایک ایک لمحہ قیامت بن کر گزر رہا تھا اُس کا سگا بھائی کس قدر بے نیازی سے اپنی زندگی میں مست و مگن تھا۔ اندر کہیں سے اُس کی بیاہی بیٹیوں کے ہنسنے کھلکھلانے اور اُس کے بچوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ وہی بھائی تھا جس کے لیے محنت کرتے اُس نے دن رات ایک کر ڈالے۔ اپنی بیوی بیٹی سے زیادہ اُس کے بال بچوں کے آرام و آسائش

کا خیال رکھا تھا۔

اُسی وقت قریبی مسجد سے عشا کی آواز بلند ہونے لگی۔ نور حسن نے ریموٹ اُٹھا کر ٹیلی ویژن کی آواز اذان کے احترام میں نیچی کر ڈالی۔ نور شیر خاموشی سے اذان ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ نور حسن اُس کی طرف متوجہ تھا جیسے اُس کی آمد کا مقصد جاننا چاہتا ہو۔

''وہ لوگ بدلے میں گل پری کا ہاتھ مانگ رہے ہیں۔'' نور شیر نے انکشاف کیا۔

''اُس نکھٹو ناکارہ کمال دین کے لیے۔''

☆......☆......☆

گل پری ہاجرہ کو دلاسا دینے کے لیے اپنے ساتھ لگائے ہولے ہولے تھپکتی رہی تھی۔ ہاجرہ کو یونہی اُس کے بازو پر سر رکھے اونگھ سی آ گئی۔ بوجھ کی وجہ سے گل پری کا بازو شل ہونے لگا تو اُس نے آہستگی سے ہاجرہ کو ہٹا کر اُس کا سر تکیے پر ڈال دیا ہاجرہ ذرا سا کسمسائی پھر دوبارہ غافل ہو گئی۔

گل پری آہٹ کیے بغیر پلنگ سے اُتر آئی۔ اپنے بالوں کو بل دے کر باندھتے ہوئے اُس نے رحم بھری نگاہ ماں پر ڈالی پھر کمرے سے نکل آئی۔ پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا کسی کو بتی جلانا یاد ہی نہ رہا تھا۔ لطیفاں موقع غنیمت جان کر اپنے کوارٹر میں کھسک چکی تھی۔ گھر کی وہ پرانی چہل پہل اب ختم ہو چکی تھی۔ ملازمائیں خاموشی سے اپنا کام نپٹا کر چلی جایا کرتی تھیں۔

گل پری نے ایک ایک کر کے تمام بٹن جلا دیے۔ اندھیرا چھٹا تو اندر کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی۔ کمرے کی لائٹ جلا کر وہ نور شیر کے کمرے کے دروازے کے قریب سے گزری تو قدم سُست پڑ گئے۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ سامنے پلنگ پر بچھی چادر شکنوں سے پُر تھی۔ گل پری کا دل بوجھل ہو گیا۔

تو مطمئن ہو کر بابا دوبارہ اپنی پرانی روش پر لوٹ آیا، ایک دن بھی صبر نہ ہو سکا۔ وہی دوستوں کی رات گئے کی بے فکری محفلیں، آج تو شاید جشن کی رات تھی۔ اُس نے سوچا۔

عشاء کا وقت ہونے لگا تھا۔ غسل خانے کے آئینے میں اپنی متورم آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اُس نے کسی معمول کی طرح وضو کیا۔ کمرے میں آئی تو عشاء کی اذان ہونے لگی تھی۔ وہ قالین پر جائے نماز بچھانے لگی کہ یک لخت دل بھر آیا۔ بڑے دنوں کے بعد یوں لگا تھا جیسے سناٹے کو چیرتی ہوئی یہ پُرسوز، پُرتاثیر پکار اُس کے اندر تک اُترتی چلی گئی ہے۔ اِس بلاوے میں آج کیسا جلال تھا کہ دل جھنجوڑ گیا تھا۔ اُس پر ہیبت سی طاری ہونے لگی۔ ایک ایک لفظ سینے میں دھمک پیدا کر رہا تھا۔ اُسے ایک کے بعد ایک اپنی ساری کوتاہیاں یاد آنے لگیں۔ عرصہ ہوا تھا اُس نے دعا مانگنی چھوڑ دی تھی۔ اپنی دعاؤں پر سے اعتبار اُٹھ ہی گیا تھا۔ دل پر جیسے کوئی زنگ لگ گیا تھا۔ شیطان اُس کے دل میں وسوسے ڈالتا گیا، اُسے ورغلاتا رہا اور وہ اپنے اللہ سے دور ہوتی چلی گئی۔ اُس کا ایمان متزلزل ہوتا گیا وہ اپنی تقدیر سے نالاں، اپنے رب سے خفا خفا رہنے لگی۔ ایسا تب سے ہوا تھا جب نور شیر نے میر حسن سے اُس کا رشتہ طے کرنے کا اعلان کیا تھا۔

گل پری کو اندر سے زوردار جھٹکا لگا تھا۔

اُسے یقین نہ آتا تھا کہ اُس کا رب اُس کے ساتھ ایسا بھی کر سکتا ہے۔ وہ بے خبر تو نہیں تھا، سب جانتا تھا، جانتا تھا کہ اُس نے صرف شاہ در کو چاہا ہے، راتوں کو اُٹھ کر دعاؤں میں صرف

اُسی کو مانگا ہے۔ اُس کی دعائیں رائیگاں کیسے جاسکتی ہیں۔ اُس کی عبادتوں، ریاضتوں کا یہ صلہ!

اُس نے اِسے آزمائش نہیں سزا جانا، بھول گئی کہ ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ اُس نے ضد باندھ لی، اپنے نفس کی اصلاح کرنے کی بجائے ناشکرے بندوں میں شامل ہوگئی۔ نہ ماں سے بدتمیزی چھوڑی، نہ باپ کی بے ادبی اور من چاہے انعام کی خواہش مند رہی۔ وہ یوں بے دلی سے نماز پڑھتی جیسے فرض کا بوجھ سر سے ٹال رہی ہو۔ بے روح قیام، بے کیف سجدے اور ڈھیروں گلے......

اُسے یاد تک نہ رہا تھا کہ اُس نے آخری بار دل کی گہرائیوں سے کب دعا مانگی تھی کب اپنے رب کو پکارا تھا۔

اُسے آنسو بہانے کے لیے ایک کندھے کی تلاش تھی اُسے بھول گئی جو رگِ جاں سے قریب ہے۔

آج یاد آیا تو بدن پر لرزہ سا طاری ہونے لگا۔ اُسے اپنا آپ اندھیرے میں بھٹکتے اُس مسافر کی طرح محسوس ہو رہا تھا جس کے سارے راستے مسدود ہو چکے ہوں۔ بس ایک راستہ باقی تھا۔

بارش

تمہیں یاد ہے جاناں!
میرا بارش میں بھیگنا
تمہیں کتنا ناپسند ہوا کرتا تھا
اور میں ضد میں آکر
ہمیشہ بھیگا کرتی تھی
میں اب بھی برستی بارش میں
گھنٹوں بھیگتی رہتی ہوں
اب بھی تنہا بارش کے
قطروں کو ہتھیلی پہ اکٹھا کرتی ہوں
تیری آواز کو ترستی ہوں
سوچتی ہوں!!
کوئی آواز بھی
میری سماعتوں سے نہیں ٹکراتی
اور......
تمہیں ڈھونڈتی مری آنکھیں
دہلیز کی چوکھٹ سے ٹکرا کر
مایوس سی لوٹ آتی ہیں!!
مگر!! تم نہیں آتے

شاعرہ: نوشین اقبال نوشی

سے ہیں۔

☆......☆......☆

نورحسن کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رُکے پھر اُس نے ایک گہرا کش چھوڑا۔ نورشیر کے نقش اُس دھوئیں کے پیچھے معدوم ہوگئے تو وہ ٹھہری ٹھہری آواز میں بولا۔

بندگی کا، سپردگی کا، پناہ کا، فنا کا وہ نیت باندھنے سے پہلے استغفار پڑھتے ہوئے سیدھا سجدے میں گرگئی۔ منہ سے بے اختیار بس ایک ہی جملہ نکل رہا تھا۔ یارب میرے لیے اِس شر سے خیر نکال، شر سے خیر نکال، دل کا سارا درد آنکھوں کے راستے پگھل کر باہر نکلنے لگا۔ ہچکیوں کے درمیان وہ خود فراموشی کے عالم میں اِسی جملے کو دہرائے چلی گئی۔ بے شک ہم ہی ظالموں میں

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، پھر تو معاملہ ہی ختم سمجھو۔'' نورشیر کو جیسے کسی نے گہرائیوں میں دھکا دے دیا۔ اُسے یقین نہ آیا کہ یہ نورحسن کہہ رہا ہے۔

''مگر گل پری میرحسن کی منگ ہے۔'' اُس کے منہ سے بمشکل نکلا، کمال دین کی خامیوں کو وہ کیا گنواتا جب سے اُس خاندان سے رشتہ جوڑا تھا ساری خامیاں خوبیاں سامنے آ گئی تھیں۔ مگر وہ تب انہیں نظرانداز کرتا تھا۔ نورحسن اب کہہ رہا تھا۔

''ہم لوگ یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔'' نورحسن بڑے پن سے بولا۔

''اگر اِس طرح کرنے سے تمہاری بخشش ہوجاتی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے.....اور یوں بھی یہ بات ابھی ہم دو گھرانوں کے بیچ ہی تھی۔ ابھی تو ہم نے خاندان میں مٹھائی بھی نہیں بانٹی تھی۔'' نورحسن کو کوئی حیرت یا افسوس نہ ہوا تھا۔ بلکہ شاید اُس نے اطمینان کی سانس ہی لی تھی۔

''مگر میں ایسا نہیں چاہتا، میں چاہتا ہوں کہ گل پری کا نکاح میرحسن سے پڑھایا جائے۔ تم اُسے رخصت کرکے یہاں لے آؤ، آج اور ابھی۔'' اس دلدل سے نکلنے کا نورشیر کو یہی طریقہ سوجھائی دیا تھا۔ نورحسن اُسے یوں دیکھنے لگا جیسے اُس کا دماغ چل گیا ہو۔

''یہ کیسے ممکن ہے بھائی جی، میں پنچائیت کے فیصلے کے خلاف کیسے جاسکتا ہوں۔ ساری برادری میرے خلاف ہوجائے گی؟''

''تم سمجھ نہیں رہے نورحسن ابھی پنچائیت نے اپنا فیصلہ نہیں سنایا، مجھے دو دنوں کی مہلت ملی ہے، یہ بات تو مجھے اندر کے ایک بندے نے بتائی ہے۔''

''جیسے یہ ایک اندر کے بندے نے پہلے بھی آپ کو خبر دی تھی۔'' نورحسن اُس کی بات کاٹ کر طنزیہ ہنسا۔ نورشیر یہ طنز پی گیا۔ وہ یہاں نورحسن سے اُلجھنے نہیں آیا تھا۔

نورحسن چھوٹے چھوٹے کش لگاتے ہوئے سوچ رہا تھا یہ بلا کیسے ٹالی جائے۔ پچھلے کئی دنوں سے اُن کے گھر میں یہی بحث چل رہی تھی۔ اندر کمرے میں کھڑی اُس کی بیوی تلملاتے ہوئے کبھی اپنا وزن ایک پیر پر ڈالتی کبھی دوسرے پر، اگر نورحسن نے آنکھ کے اشارے سے منع نہ کیا ہوتا تو شاید وہ دوبدو نورشیر کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔

''سوچ کیا رہے ہو نورحسن...... میں بہت مجبور ہوکر یہاں آیا ہوں، میں نے بہت ظلم کمائے ہیں مگر اب اپنی معصوم بیٹی پر اور ظلم نہیں کرسکتا۔ بس تم اٹھو اور میرحسن کو لے کر میرے ساتھ چلو، یہ کام آج کی رات ہوجانا چاہیے دو گواہوں کا انتظام میں کرتا ہوں تم قاضی کو پکڑو۔ ایک بار نکاح ہوجائے تو پھر پنچائیت یہ فیصلہ نہیں کرسکے گی۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ اس وقت میں اپنی بیٹی کے لیے جو فیصلہ چاہے کرسکتا ہوں، یہ میرا حق ہے۔''

''بھائی جی آپ شاید مذاق کررہے ہیں۔'' نورحسن اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔

''یوں بھی کوئی نکاح ہوتا ہے میرا ایک ہی ایک بیٹا ہے سو ارمان ہیں اُس کی ماں بہنوں کے۔'' نورشیر کے پاس وقت کم تھا اور نورحسن کے پاس حجتیں زیادہ......

''ارمان بعد میں پورے ہوجائیں گے، یہ میری بیٹی کی زندگی اور میری عزت کا سوال

ہے۔" نورشیر اپنا مقام و مرتبہ بھلا کر منت پر اُتر آیا۔

حقے کی نے ایک طرف رکھ کر نورحسن سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"تو بھائی جی ہماری بھی کچھ عزت ہے یا نہیں...... اتنا اونچا خاندان ہے شاکرہ کا، وہ لوگ کیا سوچیں گے کہ چوروں کی طرح بہو بیاہ لائے، یوں بھی وہ بھی اِس رشتے پر کوئی خاص راضی نہیں تھی اس طرح تو کبھی نہیں مانے گی۔"

نورشیر کو یاد آنے لگا کہ شاکرہ نے کس قدر چاؤ سے گل پری کے لیے جھولی پھیلائی تھی اور اثبات میں جواب ملنے پر کس قدر خوش ہوئی تھی مگر اِس وقت یہ سب نورحسن کو یاد دلانا بے کار تھا۔

"اور یہ سب تو بھائی جی آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا، سونے جیسی زمین آپ اُس لڑکی کے نام کر چکے، جو بچا ہے وہ فلک شیر سمیٹ لے گا۔ وارث جو بنا پھرتا ہے، ہمیں تو آپ نے کبھی کسی کھاتے میں ہی نہیں رکھا، غلطیاں آپ کریں بھگتے ہم پھریں...... اب چاہ رہے ہیں کہ ہم رات کے اندھیرے میں خالی خولی لڑکی بیاہ لائیں، یہ اچھا انصاف ہے۔" نورحسن کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔

نورشیر بڑی امیدیں لے کر یہاں آیا تھا اُسے نورحسن سے اِس کورے جواب کی توقع نہیں تھی۔

"میں گل پری کے نام دوسری زمین لکھ دوں گا۔ میرے بعد میرا سارا حصہ اُسی کا ہوگا۔" وہ تقریباً گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

"چھوڑو بھائی جی، اُس بنجر زمین کو ہمیں کیا کرنا ہے، عمر گزر جائے گی اُس پر محنت کرتے۔"

نورحسن بے زار ہو رہا تھا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اِسی برادری میں جینا مرنا ہے میں پنچوں کے فیصلے کے خلاف نہیں جا سکتا، نہ ابھی، نہ کبھی آپ بھی میری مانو تو کوئی ہوشیاری نہ دکھاؤ، ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔"

اِس مفت کے مشورے پر نورشیر بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو رکھ پایا۔ مزید کچھ کہنا پتھر سے سر پھوڑنے کے برابر تھا۔ پھر بھی اُس نے آخری کوشش اور کی۔

"یہ تو کر سکتے ہو، میرحسن کو بلاؤ، میں خود اُس سے بات کرتا ہوں، دیکھوں وہ کیا کہتا ہے یہ اُس کی غیرت کا معاملہ ہے۔ آخر گل پری کا نام اُس کے نام کے ساتھ جڑا ہے۔"

"غیرت کی بات تو رہنے ہی دیں بھائی جی، میرحسن تو کب کا گاؤں چھوڑ کر شہر میں رہ رہا ہے۔ دوست یار سب اُس کا مذاق اڑاتے تھے کہ تیرا تایا ٹھرکی ہے۔ مجھ پہ خفا ہوتا تھا کہ مجھے رشتہ جوڑتے وقت سوچنا چاہیے تھا۔ اُس نے اور کیا کہنا ہے۔" نورحسن نے بے مروتی کی انتہا کر ڈالی تھی۔

نورشیر کا چہرہ سرخ ہو گیا وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اگر مزید وہاں رُکتا تو جانے کیا کر بیٹھتا۔

"کہاں چلے بھائی جی کوئی چائے شائے، لسی پانی۔" نورحسن کو اب جا کر مہمانداری کے تقاضے یاد آئے۔ نورشیر حلق تک بھر چکا تھا قہر آلود نگاہوں سے اُسے گھورتا باہر نکل گیا۔ نورحسن نے پیچھے شانے اُچکا دیے۔

نورشیر کے اندر غصے اور نفرت کا بگولا سا اٹھا تھا اور اُس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے

لیا۔ اُس نے نورحسن کو اس قدر بے حس اور خود غرض نہیں سمجھا تھا۔ وہ خود کو بے بسی اور مایوسی کی انتہا پر پا رہا تھا۔ کوئی راہ سوجھائی نہیں دے رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا پوری دنیا تہس نہس کر ڈالے۔

وہ اس وقت کسی کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے واپسی کے لیے اُس نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ ایک پگڈنڈی کی صورت گاؤں سے قدرے ہٹ کر تھا۔ یہ جگہ عموماً رات کو سُنسان پڑی رہتی تھی۔ اِس سے کئی عجیب و غریب داستانیں منسوب تھیں اس لیے لوگ یہاں سے آنے سے گریز کرتے تھے۔ راستے کے ایک طرف درختوں کا جھنڈ تھا اور دوسری طرف جھاڑ جھنکار سی جھاڑیاں۔ رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا ہر طرف خاموشی اور تاریکی کا راج تھا اس سناٹے میں اُس کے قدموں کی گونج نمایاں تھی۔ وہ راستے میں آتے پتھر اور کنکر ٹھوکروں سے اڑاتے خشک پتوں کو بے دردی سے کچلتا اپنے خیالوں میں غلطاں آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اندھیرے میں کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر شے سایہ سا محسوس ہورہی تھی۔ بے خیالی میں اُس کا پاؤں راستے میں سوئے کسی آوارہ کتے پر پڑا تو وہ بلبلاتا ہوا ایک طرف بھاگ گیا۔ اس بے جا مداخلت پر کچھ پرندے پھڑ پھڑائے ایک الو کہیں دور سے بولا پھر خاموشی چھاگئی۔

نورشیر چند لمحوں کے لیے رُکا تھا پھر آگے بڑھنے لگا۔ راستہ طویل اور دشوار تھا مگر اِس وقت گھر جانے کو بھی دل نہیں کررہا تھا۔

دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے۔ کانوں میں ہاجرہ کی آہیں اور گل پری کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنی انہی سوچوں میں اِس قدر گم تھا کہ اچانک سامنے آجانے والے شخص سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ آنے والا بھی اُسے دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا۔ پھر اس کے منہ سے بے اختیار حیرت بھری آواز میں نکلا۔

''نورشیر چاچا تم......!'' ملگجے اندھیرے میں خالی ذہن کے ساتھ اُسے دیکھتے ہوئے نورشیر جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ دماغ کچھ سمجھنے سے عاری ہورہا تھا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ وہ شاہ در ہے۔ ہاجرہ کے بھائی کا بیٹا۔

شاہ در اُسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح گھبرا گیا تھا الفاظ اُس کے منہ میں اٹکنے لگے۔

''سب...... ٹھیک...... ٹھیک تو ہے چاچا، یہاں اس وقت کیسے؟'' تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔''

اُس کے چہرے پر نظریں جمائے نورشیر کے اندر ایک جھما کا سا ہوا۔

''آں ہاں...... تم شاہ در...... ہاں...... تم کیسے ہو۔ گھر کیوں نہیں آرہے؟''

شاہ در کو اِس سوال کی امید نہیں تھی وہ شرمندہ سا تھا۔

''میں آیا تھا پر...... شاید تمہاری طبیعت خراب تھی۔''

نورشیر بھی شرمندہ ہوگیا۔ وہ ان دنوں کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتا تھا خاص کر ہاجرہ کے گھر والوں سے تو بالکل بھی نہیں۔ شاہ در کے آنے کی اُسے اطلاع ملی تھی مگر وہ اپنے کمرے سے باہر تک نہ نکلا تھا۔ اُسے لگتا تھا ساری دنیا اُس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اُس پر ہنس رہی ہے۔

لیکن اِس وقت شادر کو اپنے سامنے پا کر

اُسے یوں لگا تھا جیسے خدا نے اُس کی مدد کے لیے غیبی فرشتہ بھیج دیا ہو۔ وہ دوبارہ سے جی اٹھا تھا۔

''گل پری سے شادی کرو گے۔'' اُس نے اچانک پوچھا۔

''کیا......!'' شاہ در کو یوں لگا جیسے اُس نے سننے میں غلطی کی ہو۔ نور شیر کے منہ سے ایسی پیشکش کا تو وہ خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا۔

''کیا کہا تم نے چاچا......؟'' شاہ در نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''گل پری سے شادی کر لو، جتنا جلدی ہو سکے۔'' نور شیر نے اپنا سوال دوسرے انداز میں دہرایا۔ اُس نے یہیں کھڑے کھڑے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کچھ بھی سہی اپنے کردہ ناکردہ جرم کی سزا وہ خود بھگتے گا، اُس کی بیٹی نہیں، اگر اُس کے نصیب میں ہوا تو اُس کی بے گناہی پنچائیت کے سامنے ثابت ہو ہی جائے گی۔

''میں بہت مشکل میں ہوں۔ اس وقت تمہارے سوا اور کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔'' اُس نے جذباتی سے انداز میں کہا۔

شاہ در کو شادی مرگ ہونے لگا۔ وہ ایک جھٹکے سے نور شیر کے گلے لگ گیا۔ نور شیر نے اُس کا جواب جان کر پوری قوت سے اُسے خود سے بھینچ ڈالا۔ اُس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔

شاہ در کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ وہ رات کے اِس وقت نور شیر کو دیوانہ سا گھومتا دیکھ کر بری طرح ڈر گیا تھا۔ اُسے لگا کہ نور شیر بالآخر ساری حقیقت جان چکا ہے اور اُس کی تلاش میں نکلا ہے۔

☆☆......☆☆......☆☆

نیلماں اُن عورتوں میں سے تھی جو ہر مرد کی نگاہ سے اپنے حسن کی ستائش چاہتی ہیں۔ کوئی انہیں نظر انداز کرے تو اُن کی نسوانی اَنا کو سخت ٹھیس پہنچتی ہے۔ شاہ در کی بے نیازی اُس کے لیے چیلنج بن گئی تھی۔

وہ حسن و جوانی کے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں آ گئی۔ شاہ در نے بچنے کی کوشش تو بہت کی مگر آخر وہ ایک عام سا مرد ہی تو تھا اور نیلماں اِس میدان کی پرانی کھلاڑی محبت چاہے اُس نے کسی ایک سے کی ہو مگر دل لگی اُس کی عادت تھی۔

چاہے اور سراہے جانے کی خواہش میں وہ رشتوں کا تقدس بھی بھلا بیٹھتی تھی۔ شاہ در اُس کے پھینکے ہوئے جال میں پھنس ہی گیا۔ نیلماں واقعی اپنے عاشق کے چھٹیوں میں گاؤں آنے پر اُس سے چھپ چھپ کر ملا کرتی تھی مگر اُس روز جب وہ پکڑی گئی اُس خالی مکان میں اُس کے ساتھ کوئی اور نہیں شاہ در تھا۔

وہ تو شاید خدا اُس پر مہربان تھا۔ جو وہ کسی بڑے گناہ سے بچ گیا۔ مگر اُس کے بعد سے جان جیسے سولی پر ٹنگی تھی۔ ضمیر کا بوجھ برداشت نہ کر پایا تو دو ایک بار گل پری کے سامنے اپنی بے وفائی کا اعتراف کرنے بھی گیا مگر نہ کر سکا۔ اُسے لگا کہ گل پری کی نظروں میں گرنے سے مرجانا زیادہ بہتر ہے۔

اِس وقت نور شیر کو دیکھ کر اُس کی جان حلق میں آ گئی تھی۔ اگر نور شیر اُسے قتل کر کے لاش جھاڑیوں میں پھینک دیتا تو کسی کو اُس کا سراغ تک نہ ملتا۔

مگر لگتا تھا کہ شاید رب اب بھی اُس پر مہربان ہے۔ اُس کی توبہ قبول کر لی گئی ہے۔

☆☆......☆☆......☆☆

تم میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے ہو...... میں کہہ رہی ہوں آپا کو کوئی نہ کوئی دماغی مسئلہ ضرور ہے، کل تو سونیا بھی یہی کہہ رہی تھی کہ اُسے بھی یہی لگتا ہے۔ ثوبیہ کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ سجو آپا کے کانوں میں آسانی سے پہنچ جاتی، یا شاید اس کی......

سجو آپا کا بس نہ چلے دوسروں کی سیج میں آگ لگا دیں۔

''توبہ......'' ثوبیہ کی بھنائی ہوئی آواز پر بے ساختہ سونیا کے منہ سے نکلا۔

''کیا توبہ......؟ ہاں...... بولو...... غلط کہہ رہی ہوں کیا؟ اگر قدرت نے انہیں سہاگ کا سُکھ نہ دیا تو اس کا مطلب وہ کسی کو بھی...... اِدھر ہم کمرے میں گئے نہیں اُدھر وہ دھاڑ دھاڑ دروازہ پیٹنا شروع کر دیتی ہیں۔ اوپر سے تم کہہ رہی ہو توبہ......'' ثوبیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سونیا کا گلا دبا دے۔

''بات تو پوری سن لیا کرو، توبۃ النصوح کی بات کر رہی تھی وہ ہی مراۃ العروس والے ڈپٹی صاحب کے ناول کی۔ ثوبیہ کو اپنے سر پر چڑھتا دیکھ کر سونیا نے جلدی سے بات بنائی۔

''خوب سمجھتی ہوں تمہارے بہانوں کو...... نیک بی بی، تمہیں تو سجو آپا کے یہ ڈرامے نظر ہی نہیں آتے اندھی بنی ہوئی ہو بالکل...... ثوبیہ پاکھنڈ مچانے کے بعد قہر برساتی نظر سونیا پر ڈال یہ جا وہ جا اور سونیا اپنی سینے میں رُکی سانس بحال کرتی دھم سے پلنگ پر جا پڑی۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی تو ثوبیہ، شہزاد سے شادی کے بعد اُن کے پڑوس میں آئی تھی اور اِن دو مہینوں میں وہ دو سو مرتبہ اُسے بتا چکی تھی کہ جب بھی وہ اور شہزاد دل کی باتیں کرنے کمرے میں جاتے ہیں۔ سجو آپا گھبرا کر دروازہ پیٹ دیتی ہیں۔

''کبھی انہیں لگتا ہے گھر میں کوئی چور گھس آیا ہے، کبھی اُن کے پیروں پر سانپ رینگتا محسوس ہوتا ہے تو کبھی سالن کے جلنے کی بُو آنے لگتی ہے۔''

بیچاری سجو آپا بھی کیا کرتیں کہ انہیں اپنی آنکھوں سے نہ ہونے کے برابر نظر آتا تھا اور اس 'نہ ہونے کے برابر' کو ثوبیہ نرا ڈھکوسلا قرار دیتی تھی۔

''مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے یہ نری مکاری ہے، ورنہ گلابی سوٹ کے ساتھ کبھی نیلا دوپٹہ تو اُوڑھ کر دکھائیں۔ ناں جی توبہ کرو۔ کپڑوں کی میچنگ اور کھانے پینے کے وقت تو لگتا

ہے انہیں خوب نظر آتا ہے۔"

ویسے بعض اوقات سونیا کو بھی لگتا کہ واقعی ثوبیہ ٹھیک کہتی ہے وہ جب بھی ثوبیہ کے گھر جاتی اسی بات پر غور کرتی تھی کہ سجو آپا کمرے سے غسل خانے جانے تک کبھی راستے میں کسی چیز سے نہیں ٹکراتی تھیں۔ نہ کھانے کے دوران بھی لقمہ سالن کی بجائے پانی کے کٹورے میں ڈالا اور تو اور اکثر جب بھی سونیا ان کے گھر آتی اور ثوبیہ چھت پر کپڑے ڈالنے یا صفائی کرنے گئی ہوتی سجو آپا اُس کی آواز سنے بغیر ہی ثوبیہ کو بلانے لگتیں۔ اور وہ حیرت زدہ سی سوچتی کہ سجو آپا کو کیسے پتہ چلا کہ وہ آئی ہے......؟"

"خیر کچھ بھی تھا...... یہ بات تو حقیقت تھی کہ سجو آپا قطعی بے ضرر تھیں۔ اب جہاں تک شہزاد اور ثوبیہ کی خلوت کا معاملہ تھا۔ ثوبیہ شادی کے چوتھے، پانچویں روز سے یہی باتیں کررہی تھی کہ سجو آپا اُن دونوں میاں بیوی کے اچھے خاصے رومانوی موڈ کو غارت کرنے پر تلی رہتی ہیں۔

رات کو بھی سجو آپا کی نادیدگی کے باعث شہزاد اپنے کمرے کا دروازہ بند نہیں کرتا تھا اور اُس نے یہ بات پہلے دن سے ثوبیہ کو بتادی تھی۔ شروع میں تو ثوبیہ کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا کہ وہ کوئی ایسی ظالم یا جابر لڑکی نہیں تھی کہ سجو آپا کی بے بسی اور شوہر کی مجبوری کو نہ سمجھ پاتی مگر اصل جھگڑا تب شروع ہوا جب ثوبیہ کو اس بات کا احساس ہوا کہ وہ اور شہزاد آج تک تکلف کے فاصلے نہ پاٹ سکے اس کے اور شہزاد کے مابین میاں بیوی والا وہ ہی رسمی سا تعلق تھا جو شادی کے دس پندرہ سالوں بعد جا کے نظر آتا ہے وہ ابھی سے نظر آرہا تھا۔ شہزاد نے کبھی اس کے حسن کو نہ سراہا تھا نہ وارفتگی لٹاتی نظروں کے حصار میں جکڑا، اسی فاصلے کو پاٹنے کی خاطر جب بھی ثوبیہ نے اپنے اور شہزاد کے لیے تنہائی چاہی سجو آپا جھٹ کسی فرشتے کی طرح نازل ہوکر کراماً کاتبین کے فرائض انجام دینے لگتیں اور شہزاد بھی انہیں یوں حساب کتاب دینے بیٹھ جاتا

جیسے سارے گناہ آج ہی بخشوا کر دم لے گا۔
اب تو ثوبیہ کو پکا یقین ہو چلا تھا کہ سجو آپا اُس کے اور شہزاد کے درمیان دیوار بنی ہوئی ہیں اور یہ صرف اس لیے تھا کہ وہ خود اپنے شوہر کی محبت نہ پا سکیں تھیں۔

☆......☆......☆

تم میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے ہو...... میں کہہ رہی ہوں آپا کو کوئی نہ کوئی دماغی مسئلہ ضرور ہے، کل تو سونیا بھی یہی کہہ رہی تھی کہ اُسے بھی یہی لگتا ہے۔
ثوبیہ کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ سجو آپا کے کانوں میں آسانی سے پہنچ جاتی، یا شاید اس کی آواز اتنی بلند تھی ہی اس لیے...... افوہ...... ایک تو تم ...... یہ اپنے گھر کی باتیں دوسروں سے کیوں کرتی ہو؟ شہزاد نے تپ کر دانت کچکچائے۔
''لو...... دوسرے کون......؟''
''سونیا میری سہیلی ہے اُسے سب پتہ ہے۔'' ثوبیہ نے لاپرواہی جتائی۔
''اچھا ٹھیک ہے...... اب جلدی کرو تمہیں میکے چھوڑ کر مجھے واپس بھی آنا ہے۔'' شہزاد نے بالوں میں کنگا پھیرتے ہوئے گویا بات ختم کی۔
''لینے کب آؤ گے......؟'' شوہر کی آنکھوں میں جدائی کی کسک تلاشنے کی خاطر اُس نے ادا سے آنکھوں میں جھانکا۔
''آ جاؤں گا کل...... زیادہ دن کے لیے نہیں چھوڑ سکتا آپا اکیلی ہوتی ہیں۔'' موٹر سائیکل کی چابی جیب سے نکالتے ہوئے وہ خود بھی باہر کی طرف بڑھ گیا۔
ثوبیہ کے تن بدن میں چنگاریاں بھڑک اٹھیں اُس نے تنک کر کہا۔
''میں نہیں آؤں گی کل...... پرسوں لینے آنا۔''
شہزاد ایک لمحے کے لیے رُکا اُسے دیکھا اور بولا۔
''ٹھیک ہے آ جاؤں گا۔'' برآمدے میں تسبیح کے دانے گراتی سجو آپا کی انگلیاں دانوں پر جم گئیں۔
''ثوبی بیٹا...... تیرے بغیر میرا جی نہیں لگتا۔ جلدی آ جانا۔'' دونوں کے قریب آنے کی آہٹ پر انہوں نے محبت سے کہا تھا۔
''جی نہیں لگتا یا گزارہ نہیں ہوتا میرے بغیر......'' ثوبیہ کے لہجے میں واضح چڑ تھی۔
''ایک ہی بات ہے بیٹا......'' سجو آپا کے لہجے کی نرماہٹ میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔ اُن دونوں کے جانے کے بعد گھر کے سناٹے میں پرانے خوف کی آوازیں انہیں بے سکون کرنے لگیں تو انہوں نے آنکھیں موند لیں۔
وہ سمٹی سمٹائی دلہن کے سراپے میں ملبوس مسہری پر بیٹھی تھی جب اچانک اوپر سے پنکھا گرا اور اس کے دماغ کو گویا ٹکڑے کر گیا جب اُسے ہوش آیا تو وہ اسپتال کے بستر پر تھی۔
اردگرد سسرالی رشتے دار تھے جن کی فکر مند آوازیں اُس کے کانوں میں سنائی دے رہی تھیں مگر وہ کسی کو بھی دیکھنے سے قاصر تھی۔ تب ہی اُس کے کانوں میں ڈاکٹر کی بھاری آواز ٹکرائی۔
''دماغ پر زور دار چوٹ لگنے کی وجہ سے بینائی پر اثر پڑا ہے ہوسکتا ہے چند روز میں نظر آنے لگے لیکن فی الحال ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' شادی کی پہلی رات اسپتال کے بستر پر اپنی دنیا اندھیر ہو جانے پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔
چند روز اسپتال میں رکھنے کے بعد اُسے یہ کہہ کر فارغ کر دیا گیا کہ جب تک بینائی ٹھیک نہ ہو علاج اور چیک اپ کرواتے رہنا۔
پھر وہ دل میں شوہر کی طرف سے دلی ہمدردی

کے جذبات کے اظہار کے انتظار میں واپس سسرال آ گئی۔ مگر اس وقت اس کا صبر بالکل جواب دے گیا جب اس کے شوہر سالار نے حقارت سے کہا۔

''ایک تو پہلے ہی شکل سے گئی گزری تھی اوپر سے اندھی بھی ہوگئی۔ ابا کو بھی یہی ملی تھی میرے لیے......'' پیچھے سے کسی زنانے قہقہے کی آواز نے ساجدہ کے سینے میں برچھیاں سی اتار دیں۔

دوسرے روز اُس کی ماں سُسر کی اجازت سے اُسے میکے لے آئی ماں کی دعائیں اور کھلائی پلائی کام آ گئی اور ساجدہ کو دھندلا سا نظر آنے لگا۔ ماں نے جھٹ ہفتے بعد سسر کو کہلا بھیجا کہ ساجدہ کو لے جاؤ''

سسر آئے اور بڑی محبت سے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اُسے رخصت کرنے سے پہلے ماں نے پلو میں نصیحت باندھی کہ ''تیری ساس کم عمر اور اچھے مزاج کی عورت ہے اس سے دوستی کر لینا، سگے سوتیلے کا سیاپا نہ ڈالنا، سالار کے باپ اپنی دوسری بیوی سے بڑی لگاوٹ رکھتے ہیں۔ سالار بھی اپنی سگی ماں کی موت کو بھول کر سوتیلی کے ساتھ لگا پھرتا ہے اُس کی، ہم عمر ہے تو کیا ہوا...... ہے تو ماں......''

ساجدہ نے بڑے خلوص سے ماں کی نصیحت کو سنا اور سرِ تسلیم خم کر کے رخصت ہوگئی۔

مگر گھر پہنچنے پر شوہر کا سرد رویہ ساجدہ کو اچھی طرح اپنی اوقات سمجھا گیا۔ اپنی سوتیلی ماں نادرہ کے ساتھ مل کر وہ ساجدہ کا مذاق اڑاتا۔ بار بار اسے جتاتا کہ یہ شادی اس کے باپ نے اپنے دوست سے کیا وعدہ پورا کرنے کے لیے کروائی ہے مگر سالار کی اس میں ذرا بھی خوشی شامل نہیں ہے۔

ساجدہ نے صبر سے یہ ساری باتیں سنیں اور دل میں عہد کر لیا کہ اپنی محبت سے سالار کو فتح کر لے گی مگر اُسے اس بات کا اندازہ ذرا دیر سے ہوا کہ سالار کی ہوس اور اس کی سوتیلی ماں نادرہ کی بے حیائی نے دونوں کو اندھا کر رکھا تھا۔ اس لیے ساجدہ کے بینا ہونے یا نہ ہونے سے اس کے گھر کا بسنا مشروط نہیں تھا۔

وہ معمول کا ایک دن تھا جب ساجدہ آنکھوں کے دھندلکے کو زبردستی چھانٹنے کی کوشش کرتی اپنے کمرے کی بجائے نادرہ کے کمرے میں گھس گئی۔

وہ تقریباً اندھی تھی مگر پوری اندھی نہیں تھی۔ دوسرے بصارت کی کمی کو دیگر حواس بھی پورا کر رہے تھے۔ لہٰذا اپنے لباس یعنی اپنے شوہر کی خوشبو محسوس کرنے میں اسے وقت نہیں لگا۔

نادرہ اور سالار کو ایک دوسرے میں غروب ہوتا دیکھ کر وہ لڑکھڑائی اور گر کر بے ہوش ہوگئی۔ رشتے کا تقدس پامال ہوتے دیکھنا اس کی غیرت نے گوارہ نہیں کیا تھا۔ ہوش میں آئی تو وہ دونوں اس کے اردگرد کھڑے تھے۔

''اگر کسی کے سامنے زبان کھولی تو سر پر ڈنڈا مار کر بالکل اندھا کر دوں گا سمجھی......؟'' سالار کی دھمکی پر ساجدہ نے لرز کر اُسے دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں چھائی سفاکیت جو بیانگ دہل کہہ رہی تھی کہ وہ ایسا کر بھی دے گا۔ یہ دیکھ کر ساجدہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور حیرت سے بولی۔

''کس کے سامنے...... کیا بات......؟'' نادرہ اور سالار نے اچھنبے سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''تو کمرے میں کیوں آئی تھی؟'' نادرہ نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

''ہماری جاسوسی کر رہی تھی؟'' ساجدہ نے بے بسی سے نہیں میں گردن ہلائی۔

''مم...... مجھے بہت کم نظر آتا ہے...... اس لیے......''

''کیوں اس بے چاری کو تنگ کر رہی ہو......؟ دھوکے میں تمہارے کمرے میں آ گئی تھی اب جانے دو۔'' سالار نے خباثت سے بھرے لہجے میں آنکھ کا کونا دبا کر کہا۔

سالار ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی دھوکا کھا گئی تھی۔ مگر اب اور نہیں...... وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس غلاظت بھرے ماحول میں مزید نہیں رُکے گی وہ اپنی رہی سہی بینائی کھونا نہیں چاہتی تھی اس لیے میکے آ کر ماں کو ساری حقیقت بتا دی۔

''ہاہ...... ایسی بے غیرتی...... اللہ میری توبہ...... ماں نے دو ہتھڑ سینے پر مار کر رونا شروع کر دیا اور ماں کا حوصلہ ٹوٹتا دیکھ کر وہ بھی ضبط کھو بیٹھی اور زار زار رونے لگی۔

''چپ ہو جا میری بچی...... مت رو...... ابھی میں زندہ ہوں۔'' ماں نے اس کے آنسو اپنے پلو میں چنتے ہوئے کہا۔

''اماں...... میں اب وہاں نہیں جاؤں گی۔'' ساجدہ منت بھرے لہجے میں گڑگڑائی تھی۔

''وہاں اب تیرے لیے بچا ہی کیا ہے......؟ یہ گھر تیرے باپ کا ہے۔ باپ نہیں ہے تو کیا ہوا اللہ تیرے بھائی کو سلامت رکھے وہ تیرا سرپرست بنے گا۔ تو کیوں فکر کرتی ہے۔ تو اب کہیں نہیں جائے گی۔ اس ظالم کا کیا بھروسہ سچ مچ ڈنڈا مار کر بالکل اندھا نہ کر دے۔''

ماں کے دلاسے نے اسے مطمئن تو کر دیا تھا مگر اس کی نہ ہونے کے برابر رہ جانے والی بینائی اس کے لیے زندگی بھر کا روگ بن چکی تھی۔ اور پھر ایک سال کے اندر اندر ہو جانے والی ماں کی موت کے غم نے اس کی بینائی پر مزید اثر ڈالا اور وہ تقریباً اندھی ہو گئی۔

مگر ابھی اسے اپنے سے بارہ سال چھوٹے بھائی کے سر پر سہرا سجانا تھا اور یہ ذمہ داری اس کی ماں اس کے کاندھوں پر ڈال کر گئی تھی۔ لہٰذا شہزاد کی شادی میں محتاجوں کی طرح دوسروں سے مدد لیتی ساجدہ روز جیتی اور روز مرتی رہی۔ پڑوس میں رہنے والی سونیا اور اس کی ماں نے شادی میں بڑا ساتھ دیا تھا اس بات کے لیے ساجدہ ان کی احسان مند تھی۔

ثوبیہ اُن کے رشتہ داروں میں سے تھی۔ شہزاد کی ماں نے یہ رشتہ اپنی زندگی ہی میں طے کر دیا تھا اور یوں ثوبیہ دلہن بن کر ان کے آنگن میں آ گئی، ساجدہ بہت خوش تھی کہ اب اس کی تنہائی اور محتاجی دور ہو جائے گی مگر......'' ثوبیہ کی باتوں نے جیسے پرانے زخموں کو اُدھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور اب وہ اکیلی لیٹی سوچ رہی تھی کہ واقعی اس کے دل کے زخموں کا رِسنا ثوبیہ کی باتوں کی وجہ سے تھا یا......؟''

☆......☆......☆

ثوبیہ نے رکشے والے کو کرایہ دیا اور چادر سنبھالتی ہوئی اپنی گلی میں داخل ہوئی۔ اپنے مکان کی طرف بڑھنے سے پہلے اس نے سوچا سونیا کی خیریت معلوم کرتی جائے ورنہ گھر جا کر تو بجو آپا کے نام کا دم چھلا اُسے ملنے بھی نہیں دے گا اوپر سے شہزاد الگ باتیں سنائے گا کہ دوسروں کی وجہ سے آپا کو نظر انداز مت کیا کرو۔'' حالانکہ ثوبیہ جانتی تھی شہزاد کے دل میں سونیا کے خلاف بغض بھی بجو آپا نے ہی بھرا ہے۔ اُسے صاف محسوس ہوتا تھا کہ بجو آپا کو سونیا پسند نہیں ہے یا شاید اُن کی دوستی پسند نہیں تھی۔ مگر اُسے اب بجو آپا کی پسند نا پسند یا مرضی سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان ہی خیالوں سے دل کو پراگندہ کیے وہ سونیا کا دروازہ

بجا بیٹھی تھی۔

''ارے دلہن......؟ تم آ گئیں......؟'' سونیا کی ماں نے محبت سے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا تھا۔

''جی خالہ...... آنا تو مجھے کل تھا، مگر شہزاد چاہتے تھے کہ میں میکے میں ایک دن سے زیادہ نہ رُکوں اس لیے میں نے سوچا شہزاد خوش ہو جائیں گے کہ میں نے اُن کی بات رکھ لی۔'' اپنے شنگرفی ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکان لیے وہ خالہ کو بتا رہی تھی۔

''بہت اچھا کیا بیٹا...... اچھی بیویاں ایسا ہی سوچتی ہیں۔''

''اچھا خالہ سونیا کہاں ہے......؟'' ثوبیہ نے گھر کے اندر جھانکا۔

''کسی سہیلی کے گئی ہے۔ واپس آتی ہے تو میں بھیج دوں گی تمہاری طرف۔'' خالہ کی بات پر مسکرا کر سر ہلاتی وہ اپنے مکان کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

ابھی سجو آپا کی آنکھ لگے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ریشمی کپڑے کی سرسراہٹ نے ان کی سماعتوں کو بیدار کر دیا، اور ایک شناسا سا اضطراب نے انہیں پلنگ سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ گن گن کر قدم اٹھاتی آہٹوں کی سمت بڑھنے لگیں۔ پھر ان کا دل سینے میں جیسے رُک سا گیا۔

شہزاد کے کمرے تک پہنچنے کی گنتی پوری ہو چکی تھی۔ اپنے کمرے سے شہزاد کے کمرے تک بغیر ٹھوکر کھائے پہنچنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ قدم گن کر اندازہ کر لیتی تھیں ورنہ ٹھوکر کھانے والے تو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی ٹھوکر کھا ہی لیتے ہیں۔

☆......☆......☆

بیرونی دروازے پر کنڈی نہیں لگی تھی، ثوبیہ دروازہ دھکیل کر اندر آ گئی۔ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھی تھی تو دیکھا کہ سجو آپا دبے قدموں کے ساتھ اس کے اور شہزاد کے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ مارے غصے کے اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''ذرا جو خوف ہو سجو آپا کو اپنی آخرت کا...... ہر وقت دوسروں کی ٹوہ لینا۔'' ثوبیہ نے کلس کر سوچا اس سے پہلے کہ وہ پیچھے سے آواز دے کر سجو آپا کو روکتی وہ دروازہ پیٹ چکی تھیں۔

''کچھ تو خیال کیا کرو آپا...... آخر ایسی کیا آفت آ گئی جو دروازہ ہلا کر رکھ دیا تم نے......؟'' ٹھیک کہتی ہے ثوبیہ لمحے بھر کو سکون نہیں لینے دیتیں تم۔'' شہزاد آگ بگولہ ہو کر چیخ رہا تھا۔ شہزاد کو آپا پر اُس نے پہلی مرتبہ اس طرح غصہ ہوتا دیکھا تھا۔ ثوبیہ کو خوشی سی محسوس ہوئی۔ اور وہ مزید تماشا دیکھنے کو وہیں ٹھہر گئی۔

''بولو اب کیا کام ہے......؟'' شہزاد نے دھاڑ کر پوچھا۔

''سکون تو کچھ دنوں سے تو نے میرا اُڑا رکھا ہے، میں اگر ثوبیہ کی وجہ سے خاموش رہتی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کچھ نہیں جانتی...... تُو بتا...... کون ہے تیرے ساتھ اندر......؟'' سجو آپا کا روپ بھی ثوبیہ کے لیے نیا تھا۔ وہ غصے سے تنی کھڑی تھیں۔

''کک...... کیا مطلب کون ہے......؟'' شہزاد گڑبڑا گیا۔

''مجھے تو لگتا ہے آپا آنکھوں کے ساتھ تمہاری عقل بھی چلی گئی ہے۔''

''غلط......'' آپا دھاڑیں۔

''بالکل غلط کہہ رہا ہے تُو...... بصارت سے محروم ہوئی ہوں مگر بصیرت سلامت ہے میری۔ کافی دنوں سے محسوس کر رہی ہوں کہ تُو کون سا کھیل، کھیل رہا

ہے۔ مانتی ہوں کہ بعض دفعہ اندھے پن نے شک میں مبتلا کر کے غلط وقت پر مجھ سے غلط کام بھی کروایا۔ مگر اس گناہ کو روکنے کے لیے جو تُو کر رہا ہے۔ میں اس غلط کام کو بھی درست سمجھتی ہوں۔'' سجو آپا کی آواز جذبات میں کپکپا رہی تھی۔

''جس گناہ کو برداشت کرنے کی تاب شوہر کے گھر میں نہ تھی وہ میں یہاں کیسے برداشت کرلوں۔ وہاں سوال میری زندگی کا تھا، سو اپنی زندگی کو اس جہنم سے میں نے بچالیا۔ مگر اب سوال ثوبی کی زندگی کا ہے جسے ہمیشہ میں نے اپنی بیٹی کی جگہ سمجھا ہے اور بیٹیوں کی زندگیاں بچانے کے لیے مائیں آگ میں بھی کود جاتی ہیں۔ میں بھی تیری اور اُس کی جلائی ہوئی آگ میں کودنے کو تیار ہوں۔''

دور کھڑی ثوبیہ حق ودق سب سن اور دیکھ رہی تھی، مگر پلے اب تک اس کے خاک بھی نہیں پڑا تھا کہ آخر ہو کیا رہا ہے؟'' مگر جب سجو آپا نے آخری بات کرتے ہوئے شہزاد کے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو اُن کی انگلی کے اشارے کے تعاقب میں نظر بڑھاتی ثوبیہ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

کمرے میں دروازے کی اوٹ سے سونیا جھانک رہی تھی۔

''سجو آپا ابھی بھی غم و غصے سے بول رہیں تھیں مگر شہزاد کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ ساکت کھڑا آپا کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ جیسے ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں تھا کہ آپا بصارت نہ رکھنے کے باوجود اس کی حرکتوں سے کیسے واقف ہوسکتی ہیں۔ اور سجو آپا جیسے اس کے دل کے اندر جھانک رہی تھیں۔

''میں اندھی ہوں...... اور تیری حرکتوں پہ شک میں مبتلا ہو کر میں نے کئی بار ثوبیہ کو بھی پریشان کیا جانتی ہوں...... مگر کیا کرتی میرا اپنا بیٹے جیسا بھائی آنکھوں پر گناہ اور غفلت کا پردہ ڈالے اندھا بنا ہوا تھا اُسے روکنا بھی تو ضروری تھا۔ یہ لڑکی......

اُن کا اشارہ کمرے کی طرف تھا جہاں سونیا کھڑی تھی اور اُن کے اشارے پر بے ساختہ پیچھے ہوئی تھی۔

''یہ لڑکی...... بھی اندھی ہو چکی ہے۔ اس کی حیا کا پانی اس کی آنکھوں میں مرگیا ہے۔ اور وہ ثوبیہ...... وہ بھی اندھی ہے اس لڑکی کے اعتبار کی پٹی آنکھوں پر چڑھائے تیری محبت میں اندھی ہوگئی ہے وہ...... جسے اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ اُس کی ناک کے نیچے کیا کھیل کھیلا جارہا ہے۔'' اب کے جذبات کی شدت میں سجو آپا لڑکھڑائیں تھیں۔

''میں تو اندھی ہو کر بھی کبھی دورنگ کے کپڑے نہیں پہنتی کہ اللہ نے میری بینائی لی ہے عقل نہیں...... مجھے معلوم ہے کہ کس طرح مجھے ایک ہی رنگ میں رہنا ہے اسی لیے میں اپنی عقل کی آنکھ سے تینوں کپڑوں کو ایک جگہ رکھتی ہوں تاکہ دھوکا نہ کھاجاؤں۔

''مگر تُو...... تُو تو آنکھوں والا ہو کر بھی دھوکہ کھا گیا۔ کیا جواب دوں گی میں اپنی ماں کو...... جو تجھے میرے حوالے کر کے گئی تھی کہ اُن کا اکلوتا بیٹا جہنم کی آگ اپنے دامن تک لے آیا...... اندھا ہو گیا ہوس کے پردے کی وجہ سے......'' سجو آپا روتی ہوئی واپس پلٹیں اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

اُن کے جانے کے بعد سونیا باہر آئی تو اُس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا جیسے کسی نے خون نچوڑ لیا ہو۔ شہزاد سر جھکائے جیسے خجالت کے کنوئیں میں پڑا تھا۔ پھر اُس نے سونیا کو اشارے سے جانے کو کہا مگر سونیا کی نظریں تو راستے کے بیچوں بیچ کھڑی ثوبیہ پر تھیں۔ جس کی آنکھوں سے پٹی اُتر چکی تھی۔ اب وہ بینا ہو چکی تھی اور بے اعتبار بھی۔

☆☆......☆☆

افسانہ

''بس بیسن اور چاٹ مصالحہ لے لیجیے گا باقی سب تو ہے سحری کے لیے جو بھی سبزی پکانی ہو وہ بھی دیکھ لیجیے گا۔'' وہ اکتاہٹ سے بولی تھی۔ ساجدہ نے چونک کر بیٹی کی جانب دیکھا۔ ''تم ساتھ چلتیں تو اپنی مرضی سے سامان لے لیتیں آج افطار میں......

"اماں اس بار میں رمضان میں خوب اہتمام کروں گی اور مجھے عید پر شیفون کا جوڑا چاہیے۔" شازیہ نے نروٹھے پن سے سبزی کاٹتی ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں شیفون کا ایک جوڑا کیوں دو چار لے لینا ابا تمہارے کمشنر ہیں نا؟" ساجدہ نے جل کر بیٹی سے کہا۔

"اماں آخر ہم لوگ اتنی نپی تلی زندگی آخر کب تک گزارتے رہیں گے۔ ہر وقت حساب کتاب ہر چیز بجٹ کے مطابق بھلا یہ بھی کوئی جینا ہے۔" آج شازیہ بہت ہی مایوس تھی۔ بلکہ پچھلے کئی دنوں سے ساجدہ بھی محسوس کر رہی تھیں کہ شازیہ بہت گم صم ہے ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی فرمائشی پروگرام رکھنے والی لڑکی تھی ہر حال میں مگن ہی رہتی تھی مگر اب تبدیلی نمایاں تھی جو ساجدہ کو پریشان کر رہی تھی۔

ساجدہ سرکاری اسکول میں اردو کی ٹیچر تھیں اور ان کے شوہر ایک پرائیویٹ ادارے میں کام کرتے تھے۔ شازیہ کے علاوہ رابعہ، بصیر اور شبیر تین بچے اور تھے جو سرکاری اسکول میں ہی پڑھتے تھے۔ شازیہ نے پچھلے سال میٹرک کیا تھا اور اب قریب ہی واقع کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ دونوں میاں بیوی خوب محنت کرتے تھے تبھی عزت سے گھر کی گاڑی چل رہی تھی۔ وہ تو اللہ کا کرم تھا کہ گھر اپنا تھا ورنہ ہر مہینے کرایہ دینا بہت مشکل ہو جاتا۔

ساجدہ اور رضوان دونوں اپنے بچوں کے ساتھ مطمئن زندگی گزار رہے تھے ظاہر ہے جہاں ضروریات کو محدود کر لیا جائے وہاں زندگی سہل ہو جاتی ہے اور یہی نسخہ ساجدہ نے اپنے بچوں کو بھی ازبر کروا دیا تھا۔ اس لیے ان کے بچے کسی قسم کی بھی کوئی فرمائش نہیں کرتے تھے جو مل جاتا اس میں خوش رہتے مگر اب کچھ دنوں سے شازیہ کے رویے میں واضح تبدیلی نے ساجدہ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"اماں آج پانچواں روزہ بھی گزر گیا اب تو کچھ مزے دار پکا لینے دیں روز وہی پکوڑے، اور دال چاول کھا کھا کر منہ کا مزہ خراب ہو گیا ہے۔" شازیہ نے افطار کے بعد برتن سمیٹتے ہوئے ماں سے کہا تب رضوان صاحب بھی چونک پڑے۔

"بیٹی خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ہمیں رزق عطا کیا ناشکرا پن کرنے سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔"

"ابا میں ناشکرا پن تو نہیں کر رہی۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"بس دل چاہتا ہے کہ روز نئے نئے پکوان ہوں سبزیاں اور دالیں تو پورا سال ہی کھاتے ہیں۔ رمضان میں تو اہتمام ہونا چاہیے وہ چائے کا کپ باپ کو دیتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"بیٹی سادہ غذا ہمیشہ انسان کو صحت مند رکھتی ہے اور افطار میں بہت مرغن چیزیں کھانے سے طبیعت میں بھاری پن آ جاتا ہے۔" باپ کے سمجھانے پر وہ چپ تو ہو گئی مگر دل پر بوجھ تھا۔

اگلے دن کالج سے واپسی پر وہ نماز پڑھ کر لیٹ گئی۔

"کیا بات ہے آپا آج قرآن نہیں پڑھیں گی۔" رابعہ نے سپارہ پڑھتے پڑھتے چونک کر بڑی بہن سے پوچھا۔ وہ لوگ روزانہ ظہر کی نماز کے بعد سپارہ پڑھتے پھر کچھ دیر آرام اس کے بعد عصر کی نماز پڑھ کر ماں کے ساتھ مل کر افطاری کی تیاری کی جاتی مگر آج شازیہ نے قرآن کو ہاتھ

تک نہ لگایا۔

''آں ہاں...... وہ آج سر میں درد ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کروٹ لے کر لیٹ گئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد شازیہ نے درمیان والے کمرے میں جا کر ٹی وی کھولا اور کاپی پنسل لے کر بیٹھ گئی۔ تبھی بصیر کمرے میں چلا آیا۔

''آپا مجھے رمضان کے فوائد پر مضمون لکھوا دو کل اسکول میں دکھانا ہے۔'' تو وہ چڑ ہی گئی۔

''توبہ ہے تم لوگوں کو چین نہیں ہے بھاگ جاؤ میں ابھی مصروف ہوں۔'' بصیر منہ بناتا ہوا چلا گیا۔

ٹی وی پر خوبصورت شیف اپنی مخروطی انگلیوں سے چکن کو مصالحہ اور میٹھے میں لاوا کیک بنانا سکھا رہی تھیں۔ یہ خاص رمضان ٹرانسمیشن تھی۔ وقفے کے بعد لیچی کے شربت کی ترکیب بتانی تھی۔ شازیہ کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ روزانہ نت نئی افطار ڈشز سیکھتی تھی مگر افسوس کہ ایک بھی ڈش بنانے کا موقعہ نہیں ملا۔ عصر کی اذان جیسے ہی ختم ہوئی اماں نے اُس کو آواز دی اور وہ دل مسوس کر اٹھ گئی۔

''شازیہ میں نے رات ماش کی دال بھگو دی تھی تم اچھی طرح پیس کر دہی بڑوں کے لیے پکوڑے تل لو میں بصیر کو بھیج کر آج سموسے اور جلیبیاں منگوالوں گی۔''

''اماں کوئی پھل بھی منگوالیں۔'' رابعہ نے بہن کو منہ بسورتے دیکھ کر ماں سے کہا۔

''اچھا چلو بصیر کے ساتھ شبیر کو بھی بھیج دو۔'' وہ دونوں کیلے اور خربوزے لے لیں گے۔'' اماں نے نرمی سے جواب دیا۔

افطار کے بعد رضوان صاحب دونوں بیٹوں کو لے کر مسجد چلے گئے اور اماں اور رابعہ جائے نماز بچھا کر کھڑی ہو گئیں مگر شازیہ غائب تھی۔ سلام پھیر کر اماں نے شازیہ کو آواز دی۔

''شازیہ تم نے نماز پڑھی۔''

''جی اماں پڑھ لی۔'' وہ وہیں کمرے سے بولی اور خود ہی اپنے جھوٹ پر شرمندہ ہوگئی۔

اماں نے رابعہ سے کہا۔

''جاؤ بہن سے کہو چائے بنادے ابا بھی آنے والے ہوں گے۔'' جی اماں کہہ کر رابعہ نے جائے نماز تہہ کی اور کمرے کی جانب چل دی۔

''ہیں...... یہ کیا......؟'' وہ حیران رہ گئی۔

چائے کا تو دور دور تک پتہ نہیں تھا ہاں شازیہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔

آپا اماں چائے کا کہہ رہی ہیں وہ حیرت سے شازیہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''رابعہ دیکھو یہ جوڑا جو اس میزبان نے پہنا ہے نا میں نے کالج جاتے ہوئے ماڈل کو پہنے دیکھا تھا وہ حسرت سے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے بولی۔

''ہاں آپا میں نے بھی دیکھا تھا مگر یہ بہت مہنگا ہوگا نا؟''

''ہاں بھئی کم از کم پندرہ ہزار کا تو ہوگا۔ دیکھو نا اس کے ساتھ شیفون کا دوپٹہ ہے اور شیفون کی ہی آستینیں ہیں۔'' وہ رابعہ کے علم میں اضافہ کر رہی تھی۔ تبھی ساجدہ بھی کمرے میں چلی آئیں۔

''تم دونوں کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ہے۔ باپ تمہارے چائے کے انتظار میں بیٹھے ہیں اور تم دونوں یہاں بیٹھی ہو۔'' انہوں نے دونوں بیٹیوں کو گھر کا تو وہ تیزی سے اُٹھ کر باورچی خانے کی جانب چل دیں۔ مگر ماں کی بڑبڑاہٹ واضح طور پر سن سکتی تھیں۔

شازیہ ٹرے میں چائے کے کپ رکھ کر صحن میں بیٹھے ماں باپ کے پاس چلی آئی۔

''ابا چائے ......''اس نے کپ باپ کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

''جیتی رہو۔'' رضوان صاحب نے چائے کا کپ اٹھا کر بیٹی کو پیار سے دیکھا۔

''اماں......'' اس نے ٹرے ماں کے آگے کی۔ مگر ماں کی تنبیہی نگاہوں کی تاب نہ لا سکی اور تیزی سے پلٹ کر جانے لگی۔

''ٹھہرو......'' ساجدہ نے اس کے ارادے بھانپتے ہوئے کہا۔

''آج تم نے دن میں سپارہ بھی نہیں پڑھا اور مغرب کی نماز بھی چھوڑ دی۔'' ان کے اس طرح اچانک پوچھنے پر جہاں وہ بری طرح شرمندہ ہوگئی وہیں رضوان صاحب نے بھی حیرت سے بیٹی کی جانب دیکھا۔

''وہ اماں میں کالج سے آکر بہت تھک گئی تھی۔ افطار کے بعد تو بالکل ہی ہمت ختم ہوگئی تھی اس لیے نماز بھی رہ گئی۔'' وہ منمنائی۔

''شازیہ تم بڑی ہو جیسے تم کرو گی چھوٹے بہن بھائی بھی وہی کریں گے۔ میں مانتی ہوں کہ روزے میں تھکن زیادہ ہو جاتی ہے مگر اپنا روٹین نماز کے ساتھ بناؤ گی تو سب ٹھیک رہے گا اور پھر ایک ماہ کی ہی تو بات ہوتی ہے۔ ہم لوگ خوش نصیب ہیں کہ ہمیں یہ بابرکت مہینہ نصیب ہوا وہ رسان سے بولیں۔ رضوان صاحب نے خالی چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے ساجدہ بیگم سے کہا۔

''بچی ہے سمجھ جائے گی۔'' شازیہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنے کمرے کی جانب چلے گئے۔ شازیہ نے جلدی سے خالی کپ اٹھائے اور ماں کی نظروں سے بچنے کے لیے باورچی خانے میں گھس گئی۔

اگلے دن چھٹی تھی۔ ساجدہ نے صبح صبح ہی شازیہ کو اٹھا دیا۔ سحری کی نشریات دیکھنے کے بعد اس کا ارادہ دیر تک سونے کا تھا۔ مگر اماں نے اس کے پلان پر پانی پھیر دیا۔

''شازیہ افطار کے لیے اگر بازار سے کچھ منگوانا ہے تو بتا دو میں خود جا رہی ہوں صبح میں ذرا گرمی کم ہوتی ہے آرام سے خریداری ہو جائے گی۔'' انہوں نے سوفٹی پاؤں میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''بس بیسن اور چاٹ مصالحہ لے لیجیے گا باقی سب تو ہے سحری کے لیے جو بھی سبزی پکانی ہو وہ بھی دیکھ لیجیے گا۔'' وہ اکتاہٹ سے بولی تھی۔ ساجدہ نے چونک کر بیٹی کی جانب دیکھا۔

''تم ساتھ چلتیں تو اپنی مرضی سے سامان لے لیتیں آج افطار میں وہ بناؤ جن کھانوں کی ترکیبیں پچھلے کئی دنوں سے لکھ رہی ہو۔'' وہ مسکرا کر بولیں۔

شازیہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں وہ چھلانگ مار کر بستر سے اٹھی منہ پر پانی کے چھپاکے مارے اور آنا فاناً چادر سر پر لے کر تیار ہوگئی۔

آج شازیہ کی پھرتیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ خریداری سے واپسی پر اُس نے سامان باورچی خانے میں رکھا۔ جلدی جلدی وضو کر کے نماز پڑھی اور رابعہ کو ہوم ورک مکمل کروا کے اپنے ساتھ کام کرنے کا کہتی ہوئی صحن میں آگئی۔ جہاں رسی پر کپڑے لٹک رہے تھے اس نے کپڑے تہہ کر کے استری کے لیے کمرے میں رکھے۔ اور پائپ لگا کر صحن کی دھلائی شروع کر دی۔ ساجدہ نے منع بھی کیا کہ روزے میں اتنی مشقت مت کرو

مگر وہ نہ مانی۔

''اماں میں افطار کی تیاری میں لگ جاؤں گی پھر وقت نہیں ملے گا۔'' ساتھ ساتھ کیاری میں لگے پودوں کو بھی پانی دیا۔ وائپر رابعہ کو تھما کر غسل خانے میں گھس گئی۔ اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر تولیے سے خشک کیا۔ بکھرے بالوں کو لپیٹ کر کیچر میں قید کر کے باورچی خانے کا رخ کیا۔ سب سے پہلے مرغی دھو کر مصالحہ لگا کر اس کو فریج میں رکھا۔ پھر سلاد کے لیے بند گوبھی اور سیب کاٹے اُن پر لیموں کا رس چھڑک کر ماؤنیز ملایا اور کالی مرچ نمک مکس کر کے اس کو بھی فریج میں رکھ دیا۔ چولہے پر پانی چڑھا کر اس میں آلو ڈالے۔ اور ساتھ ساتھ تیزی سے شاہی بریانی کے دیگر لوازمات تیار کرنے شروع کیے۔ کل ہی تو ڈیزائنرز ڈریس میں ملبوس آنکھوں کو تیر کمان کیے شیف نے اُس کی ترکیب بتائی تھی۔ عصر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ مگر اس کے پاس باورچی خانے سے نکلنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ اُفوہ کیا مصیبت ہے کاش ہمارے پاس جدید اوون ہوتا ان چولہوں پر تو بس پکوڑے اور سبزیاں ہی بنائی جا سکتیں ہیں۔ وہ بڑبڑائی رابعہ نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ آرام سے کمرے میں بیٹھی نماز کے بعد صبح اسکول کے کپڑے پریس کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ ریڈیو سے نشر ہونے والا نعتیہ مشاعرہ سن رہی تھی۔ ابا شبیر اور بصیر کو حساب کے سوالات حل کروا رہے تھے۔ نماز کے بعد اماں بھی باورچی خانے میں آ گئیں۔

''شازیہ بیٹی نماز پڑھ لو پھر قضا ہو جائے گی۔'' انہوں نے اُس کو ہونق بنے دیکھا تو کہا۔

''جی اماں بس تھوڑا سا سمیٹ لوں کام پھر جاتی ہوں۔'' وہ بادام چھیلتے ہوئے بولی۔

''اچھا لاؤ مجھے کچھ کام بتا دو میں کیے دیتی ہوں۔'' ساجدہ نے چولہے پر سے دیگچی اتارتے ہوئے کہا۔

''نہیں اماں آپ جائیں آج ساری افطاری میں تیار کروں گی۔ بس زعفرانی شیک کے لیے پیسٹ بنا لوں پھر نماز پڑھتی ہوں۔'' وہ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے بولی۔

''مغرب کی اذان میں صرف بیس منٹ رہ گئے ہیں آپا اور کتنی دیر ہے۔'' رابعہ نے باورچی خانے میں آ کر شازیہ کو یاد دلایا۔

''تمہیں اب ہوش آیا ہے، میں دوپہر سے یہاں گھسی کام کر رہی ہوں اور مہارانی اب آئی ہیں۔'' شازیہ پھٹ پڑی۔

''اچھا لائیں میں دسترخوان لگا دیتی ہوں۔'' وہ جلدی سے دسترخوان اور برتن لے کر باہر نکل گئیں کہ کہیں بہن اسے کچا ہی نہ کھا جائے۔

''آج ہماری بیٹی نے بڑی محنت کی ہے۔'' رضوان صاحب نے شازیہ کو پسینے میں شرابور کمرے کی جانب جاتا دیکھا تو محبت سے بولے۔

''جی ابا بس منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔ آپ چل کر دسترخوان پر بیٹھیے۔ شبیر اور بصیر بھی بے چینی سے اذان کا انتظار کر رہے تھے۔ آج تو روزہ ہمیشہ سے زیادہ لگ رہا تھا۔ سارا دن کھانوں کی خوشبوؤں نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔ اور اب دسترخوان پر سجے دلربا چکن' شاہی بریانی' رشین سلاد اور عفرانی شیک کے لیے وہ بہت بے صبرے ہو رہے تھے۔ پڑوس سے آئے پکوڑے چھوٹی سی پیالی میں دہی بڑے اور فروٹ چاٹ دسترخوان کے کونے پر یوں دھرے تھے جیسے تکلفاً رکھے گئے ہوں۔ مغرب کی اذان کے ساتھ ہی سب نے کھجور سے روزہ کھولا۔ شازیہ کی بنائی ہوئی افطاری کی سب نے خوب تعریف کی۔ رابعہ اور اماں کو ملک شیک بہت اچھا لگا، ابا نے سلاد اور

دلربا چکن کی بہت تعریف کی بصیر اور شبیر تو شاہی بریانی کے دیوانے ہوئے جارہے تھے۔ سب تعریف کررہے تھے مگر شازیہ سے کچھ بھی کھایا نہ گیا۔ شاید تھکن کی وجہ سے بھوک مرگئی تھی۔ اماں نے اُس کی کیفیت محسوس کرلی تھی۔

شازیہ بیٹا تم نماز کے بعد آرام کرنا چائے میں بنادوں گی اور برتن یہ تینوں مل کر سمیٹ دیں گے۔ تم بہت تھک گئی ہو...... اس وقت شازیہ کو اماں پر بہت پیار آیا آخر ماں تھیں نا سب سمجھتی تھیں۔ وہ شربت کے دو گھونٹ لے کر اٹھ گئی۔ نہا کر نماز پڑھی تو کچھ سکون ملا۔ رابعہ چائے لے آئی تھی وہ چائے کا کپ لے کر صحن میں چلی آئی۔ ابا نماز کے بعد چائے پیئے بنا لیٹ گئے تھے۔ وہ آرام کرنا چاہ رہے تھے۔ شبیر اور بصیر اماں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ ٹی وی کے سامنے جا کر بیٹھ گئی جہاں میزبان پوری توانائی کے ساتھ مہمانوں کے ساتھ ہنسی ٹھٹھول میں مشغول تھے انعامات کی برسات ہورہی تھی۔ میزبان کبھی سیڑھیوں سے اوپر کبھی سیڑھیوں سے نیچے دوڑیں لگا رہے تھے اچانک اُسے اپنی ٹانگوں میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہوا۔ آخری آخری روزوں میں شائد کمزوری زیادہ ہوجاتی ہے اس نے خود کو سمجھایا۔ اور ایک حسرت بھری نگاہ چنچل میزبان پر ڈال کر برتن دھونے کے لیے اُٹھ گئی۔ برتن دھو کر باورچی خانہ سمیٹا اور دودھ کی دیگچی فریج میں رکھنے کے لیے فریج کھولا تو دل کو انجانی سی خوشی ہوئی بریانی، بروسٹ، شیک کافی مقدار میں بچا ہوا تھا اس نے سحری میں سب کچھ کھانے کا ارادہ کیا اور کمرے میں آ کر کالج بیگ ٹھیک کرنے لگی۔

کتابیں بیگ میں رکھنے کے بعد ٹانگیں سیدھی کرکے بستر پر لیٹ گئی بس تھوڑی دیر آرام کرلوں پھر نماز پڑھوں گی۔ اُس کی آنکھ کب لگی پتہ ہی نہ چلا۔ اماں نے سحری کے لیے جب اٹھایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

''اماں سحری کا وقت ہوگیا۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''سحری کا وقت ختم ہونے کو ہے پتہ نہیں کسی کی بھی آنکھ نہیں کھلی تمہارے ابا تو سحری کو منع کررہے ہیں۔ بچوں نے بھی بس دودھ پی لیا ہے۔ تم نے افطار بھی ٹھیک سے نہیں کیا تھا چلو میں پراٹھا ڈال دیتی ہوں تم کھالو۔'' ساجدہ نے تیزی سے روٹی بیلتے ہوئے کہا۔

''نہیں اماں میں پراٹھا نہیں کھاؤں گی رات کا کھانا رکھا ہے نا بس وہی کھالوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے فریج کھولا بریانی کی ڈش کے پیچھے رکھے چھوٹے پیالوں پر نظر پڑی جس میں پڑوس سے آئے دہی بڑے اور فروٹ چاٹ رکھے تھے۔ اس نے وہ دونوں پیالے نکالے لمحے بھر کو زعفرانی شیک کی جانب دیکھا اور مزے سے ٹھنڈی فروٹ چاٹ کھانے لگی۔ ہر نوالے کے ساتھ اُس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے پیٹ پر دھرا بوجھ ہٹ رہا ہو۔ دو چمچے دہی بڑے کے کھا کر اس نے اپنے لیے اور اماں کے لیے چائے بنائی۔ چائے پینے کے بعد برتن سینک میں رکھے وضو کررہی تھی جب ابا نے دروازہ بند کرنے کو کہا وہ مسجد جارہے تھے۔

''ابا بصیر اور شبیر نہیں جارہے۔'' شازیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں بیٹا رات بھر بصیر کے پیٹ میں درد رہا اس لیے میں نے اُس کو نہیں اٹھایا شبیر بھی آج کچھ ٹال مٹول کررہا ہے۔ خیر چھوڑو تم دروازہ اچھی طرح بند کرلو۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔

شازیہ نے نماز پڑھی اور ہاتھ میں تسبیح لے کر چھت پر چلی آئی محلے کے ہر گھر میں روشنی ہورہی

تھی۔ فضا میں ہر سو پاکیزگی پھیلی ہوئی تھی۔ گھروں سے لوگ نکل کر مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ وہ کچھ دیر خاموش سی کھڑی یہ منظر دیکھتی رہی اور پھر اچانک جیسے اُسے سب کچھ سمجھ آنے لگا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اُسے یہ احساس بے چین کر رہا تھا کہ صرف ایک دن کے افطار پر اس نے اماں کے اتنے سارے پیسے خرچ کروا دیے۔ دن بھر اتنی محنت کی مگر اتنی مرغن اور میٹھی چیزیں حلق سے اتری ہی نہیں کسی نے کہا تو نہیں مگر وہ جانتی تھی کہ سب کی طبیعت میں بہت بھاری پن آ گیا تھا۔ نمازیں بھی گئیں یہ شرمندگی الگ تھی۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے آئی اور آ کر تلاوت کرتی ماں سے لپٹ گئی۔

''اماں مجھے معاف کر دیں میں سمجھ ہی نہیں سکی کہ رمضان کے اہتمام کا درحقیقت کیا مطلب ہے۔ لیکن اب میں سب جان گئی ہوں ہمیں یہ مہینہ عبادت کے لیے ملتا ہے۔'' ساجدہ نے حیرت سے اپنی روتی ہوئی پیاری بیٹی کی جانب دیکھا اور پھر اس کے ماتھے کو چوم لیا۔

''بیٹی تم نے صحیح کہا رمضان کا اہتمام درحقیقت ہماری عبادت کا اہتمام ہے نا کہ روزمرہ سے زیادہ خرچے بجٹ کو بگاڑتی اور صحت کے لیے مضر ڈشز، ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر فضول کی میزبان پر وقت ضائع کرنا یہ سب ہمیں عبادت سے دور کرتا ہے اور عبادت سے دور کرنا صرف شیطان کا مشن ہے۔ ہمارے ہر عمل میں سادگی کو سب سے زیادہ اہمیت ہونی چاہیے۔ سمجھ گئیں نا؟'' ساجدہ نے محبت پاش نظروں سے بیٹی کی جانب دیکھا۔

''جی اماں اور اماں اس بار میں عید کا جوڑا بھی نہیں بناؤں گی پچھلے سال کے دونوں جوڑے نئے کے نئے پڑے ہیں۔'' دونوں ماں بیٹی نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور زور سے ہنس پڑیں۔ گھر میں داخل ہوتے رضوان صاحب نے حیرت سے بیوی اور بیٹی کی جانب دیکھا اور مطمئن ہو کر بیرونی دروازے پر قفل ڈال دیا۔

☆☆......☆☆

جگنو میری پلکوں پر

''آپی مجھے تو آپ کی لو اسٹوری بڑی عجیب و انٹرسٹنگ لگتی ہے واقعی میں آپ کو فیس بک فرینڈ سے پیار ہو گیا؟'' وہ کافی کم عمر تھا مگر کافی سمجھدار بھی تھا۔ سنی کا تجسس سے بھرپور میسج موصول ہوا تو وہ بھرپور انداز میں ہنسی تھی۔ ''ارے فرینڈ کہاں میں نے تو......

باہر اک نئی صبح کی آمد آمد تھی۔ ایسی ہی ایک روشن صبح چوہدری ہاؤس میں طلوع ہو رہی تھی نئی امید کی انگلی تھامے، پر جس کے لیے یہ نئی صبح نئی رجا کو ہمراہ لائی تھی وہ کچھ زیادہ رجائی نہیں لگ رہی تھی۔

وہیل چیئر کو ہاتھوں سے گھسیٹتی وہ جونہی کوریڈور عبور کر آئی روشن صبح نے نا صرف اس کا استقبال کیا تھا بلکہ اس کا دل بہلانے کا بھی پورا سامان ساتھ لائی تھی۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا فضا میں ہلکی سی نیلاہٹ اب بھی تھی۔

لان میں لگے دراز قد درختوں کے سروں پر نظریں ڈالو تو پتوں پر ہلکی سی سنہری تابانی دور کہیں سورج کے نکلنے کا پتا دیتی تھی۔ بادِ صبا اپنے اندر...... خوشبوؤں کو سمو کر نرمی سے اس کے بکھرے بالوں کو چھو کر اِدھر اُدھر رقصاں موسم اور اس منظر کو دلفریب بنا رہی تھی۔ لان میں کھلتے پھول جھوم جھوم اٹھے۔

مگر وہ اس سب سے یکسر بے نیاز، اداسی کی عملی تفسیر بنی خالی خالی آنکھوں سے ایک ایک چیز کو غیر دلچسپی سے تک رہی تھی۔ دفعتاً بادِ صبا کے کچھ شوخ جھونکے اس سے ٹکرائے تو اُس نے سرعت سے دونوں بازو سینے پر رکھ لیے۔ یوں جیسے اُسے کوئی تکلیف پہنچائیں گے بادِ صبا کے وہی شریر جھونکے تھوڑا آگے جا کر پلٹ کر اُسے دیکھتے خفیف سے ہو گئے۔

اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا یہاں تک نرم ہوا کے جھونکے جنہیں چھوا بھی نہیں جا سکتا اسے ڈر تھا کہ وہ اس کا سینہ چیرتے ہوئے اُس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپے زخموں سے چھیڑ خانی کر کے اسے نئے سرے سے اذیت میں مبتلا کر دیں گے۔

اس نے ایک اداس سی نظر لان میں جھولتے پودوں پر ڈالی تھی۔

اسے باغبانی کا بے حد شوق تھا اور اس بات کے گواہ وہ بڑی عمر کے درخت تھے جو بابا کے لگائے ہوئے تھے کہ کیسے وہ بڑی محبت سے پودا

لگاتی اور اس پودے کو کھلتا دیکھ کر اس کی مسرت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اب تو وہ اس قابل بھی نہ تھی کہ اُن کی دیکھ بھال کر سکے۔ اس کے چہرے پر رقم تحریر کو پڑھ کر سہانے منظر سے جھومتے پھول ٹھٹھک کر رک گئے تھے۔ فضا میں اب اداسی گھل مل گئی۔

اسی پل اس کا دھیان سنی کی طرف چلا گیا۔ اس نے ہاتھ میں تھامے موبائل کی اسکرین روشن کی سنی کا کوئی میسج نہیں تھا۔

''آپی مجھے تو آپ کی لواسٹوری بڑی عجیب و انٹرسٹنگ لگتی ہے واقعی میں آپ کو فیس بک فرینڈ سے پیار ہو گیا؟'' وہ کافی کم عمر تھا مگر کافی سمجھدار بھی تھا۔

سنی کا تجسس سے بھرپور میسج موصول ہوا تو وہ بھرپور انداز میں ہنسی تھی۔

''ارے فرینڈ کہاں میں نے تو صرف اس کے پیج پر کمنٹ کیا تھا۔ مجھے کہاں معلوم ہم ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔''

تیزی سے جواب ٹائپ کر کے اس نے سنی کو سینڈ کیا تھا پھر تصور کی آنکھ سے اس کا حیرت سے بھرا چہرہ دیکھ کر بہت محظوظ ہوتی رہی۔

''مجھے تو محبت پہ یقین نہیں۔ مجھے اپنی فیملی سے بے حد محبت ہے مگر آپ والی محبت پہ مجھے یقین نہیں۔'' اس کے الجھے ہوئے انداز میں لکھا جواب پڑھ کر وہ پھر سے ہنسی تھی۔

نئی نئی محبت کے خمار میں بات بات پر لب کھل اٹھتے تھے۔

''مجھے بھی یقین کہاں تھا خیر ابھی تم بچے ہو۔ یہ سب نہیں سمجھ سکتے۔'' وہ جانتی تھی سنی سب سمجھ لیتا ہے پھر بھی کہہ گئی۔

''وہ تو ٹھیک ہے ڈیئر۔ مگر آج کل یہ فیس بک فیک بک بن چکی ہے آپ سمجھ رہی ہیں نا؟''

وہ جسے چھوٹا اور ناسمجھ سمجھتی تھی۔ وہی سنی اسے ڈھکے لفظوں میں سمجھا رہا تھا وہ جھٹکے سے خیالوں کی دنیا سے باہر آئی تھی۔

آنکھوں میں تیزی سے پانی جمع ہوا تھا اور وہی اب پلکوں کی باڑ توڑ کر رخساروں پر پھیلنے لگا۔ سنی اتنا غلط بھی نہیں تھا پر اسے اپنے پیار پر بھی مکمل بھروسا تھا۔ چند گہرے سانس لینے کے بعد وہ موبائل پر پیغام ٹائپ کرنے لگی۔

''سنی تم بے کم و کاست تھے...... بے دست و پا ہونے پر یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہوئی۔'' ایک ہلکا سا اعتراف کرنے سے اس کے چہرے پر بے پناہ کرب اُمڈ آیا تھا۔

ایک لائن کا پیغام لکھ کر اس نے ہواؤں کے دوش پر یہ پیغام سنی کے نام کیا تھا اور اس سے کئی سو میل دور بیٹھے سنی کے موبائل پر اگلے تین چار سیکنڈ بعد اس کی آپی ڈیئر کا پیغام جگمگانے لگا۔

وہ آج خلافِ معمول اس وقت اس سے مخاطب ہو رہی تھی ورنہ وہ ہمیشہ شام میں بات کرتے تھے وہ جانتی تھی آج سنڈے تھا اور ان کے اسکول کا آف تھا سو وہ میسج بھیج کر جواب کا انتظار کرنے لگی جو اگلے ایک منٹ میں موصول ہونا تھا۔

اتنی دیر میں موسم پر کوئی خاص اثر نہ ہوا تھا۔ شاید سورج......

ابھی نکلنے کے موڈ میں نہیں تھا یا بادل اس کا راستہ روک رہے تھے۔ بہرحال فضا ویسی ہی پُرکیف تھی ہاں اب اس منظر میں رنگ بھرنے تتلیاں ضرور آ پہنچی تھیں۔

اس کا من ویسے ہی بے کل تھا۔ اصل موسم تو دل کی بستی کا ہوتا ہے دل میں اگر چاہت کے

دیپ بجھ جائیں تو باہر کے رنگین نظاروں و بادِ صبا سے بھی دل کو قرار نہیں آتا۔ اسی طرح اگر دل میں محبت کے پھول کھل اٹھیں تو بادِ سموم میں بھی عجیب سا سرور ملتا ہے۔''

بہت سے زخم ہیں
جو حاصل زندگی ہیں
کیونکہ اس دل کو......!
رنگِ غم کی
الفت بڑی بھاتی ہے

وہیل چیئر کے کنارے سر ٹکا کر اُس نے پلکیں موند لیں، یوں کہ گرم سیال کنپٹیوں پر بہہ نکلا۔

☆......☆......☆

چلو جی تیار ہو جانا شام میں بازار جانا ہے۔''بسمہ نے اپنے ہی خیال میں صوفہ پر بیٹھی بہن کو اطلاع دی۔

''کس خوشی میں؟''بسمہ نے جتنی خوشی سے بتایا انعم نے اتنی ہی تیوریاں چڑھا لیں۔ بسمہ کا منہ بن گیا۔

''کس خوشی میں جایا جاتا ہے؟ ضرورت کے وقت ہی شاپنگ کرتے ہیں نا...... آپ کو ہر بات پر 'کس خوشی میں' کہنا ضروری ہوتا ہے؟'' وہ خاصی بدمزہ ہوئی تھی جبھی تو چڑ کر بولی۔ بخلاف انعم نے مسکراتے ہوئے لیپ ٹاپ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔

''اُف بسمہ میرا دھیان کہیں اور تھا تم ناراض مت ہو بتاؤ کیا لینا ہے۔ ایک تو مجھے مارکیٹ جانا سخت ناپسند ہے۔''

''ارے لڑکیاں تو......''

''ہاں اب یہی کہو گی کہ لڑکیوں کو شاپنگ کرنا بڑا مزا دیتا ہے تم کیسی لڑکی ہو؟ بالکل لڑکوں کی طرح شاپنگ کا سن کر بدک جاتی ہو جیسے مردوں کو ایسے کام بورنگ لگتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بٹ مائی ڈیئر سوئٹ بسمہ مجھے یہ سب صرف وقت کا زیاں لگتا ہے بس، تم ایسا کرو امی کے ساتھ چلی جانا بے شک میرے لیے کچھ نہ لانا میں اُف نہیں کروں گی اب جاؤ مجھے ذرا کام ہے۔'' اس کی بات کاٹ کر لمبی تفصیل سنا کر بات مکمل کر کے وہ لیپ ٹاپ اٹھا چکی تھی۔ بسمہ کا منہ کھلا رہ گیا۔

''انعم کیا مذاق ہے یار...... جانتی بھی ہو آپ کہ امی کسی مہنگی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتیں پھر واپسی کی جلدی الگ...... مارکیٹ میں داخل ہوئے نہیں واپسی کے لیے پر تولنے لگتی ہیں۔'' وہ بے چارگی سے مسکین سا منہ بنا کر استفسار کرنے لگی۔

''اچھا بھئی چلوں گی ساتھ...... خوش ہو جاؤ۔''انعم کا انداز ایسا ہو گیا جیسے بے دلی سے کہہ رہی ہو۔

''چلو اگر نہیں چلنا تو نہ چلو...... میں تو سوچ رہی تھی کہ واپسی پر بسم اللہ والوں سے دہی بڑے کھانے چلیں گے خیر کوئی بات نہیں۔''انعم کا انداز دیکھ کر بسمہ نے بظاہر انتہائی خوبصورتی سے اپنا آخری داؤ کھیلتے ہوئے لالہ موسیٰ میں اپنی اور انعم کی پسندیدہ شاپ کا نام لیا تھا اور توقع کے عین مطابق رسپانس ملا۔

''آ...... نہیں میں کہہ رہی ہوں نا ضرور چلوں گی تم بتا دینا کب جانا ہے۔'' اس کے بے یوں بولنے پر بسمہ نے ہنسی ضبط کی پھر فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے لیے چلوں گی آپ کو بھی۔''

تھوڑی دیر قبل التجا کرتی بسمہ اب اترا رہی تھی۔ انعم نے گھور کر دیکھا تو وہ گڑبڑا کر اِدھر اُدھر

جھانکنے لگی۔

☆......☆......☆

صبح ہی صبح اتوار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سنی اس پل اوپر چھت پر روم میں پڑی نرم قالین پر کھلے ڈھلے کپڑوں میں ملبوس، سامنے کی سمت ٹانگیں پھیلائے، ناک سے سانس لے کر منہ سے خارج کرتا سر کو گھٹنوں سے لگا رہا تھا۔ قریب ہی سائیڈ پر 'یوگا کے ذریعے اسمارٹ بنیے' بک کا مطلوبہ پیج کھلا پڑا تھا جس پر وقتاً فوقتاً نظریں ڈال کر سطروں کو بغور پڑھتا وہ اپنی پوزیشن برقرار رکھنے میں ہلکان ہوئے جا رہا تھا۔

ہفتے کے باقی ایام میں تو اس کے پاس اپنی ان سرگرمیوں کے لیے ٹائم ہرگز نہیں ہوتا تھا کیونکہ ہر رات اگلی صبح جلد اٹھ جانے کا عہد کر کے وہ ہر صبح سات بجے ہی اٹھ پاتا پھر ادھم مچاتے ہوئے جلد ہی اسکول پہنچنا ہوتا۔ مبادا لیٹ ہونے پر کلاس انچارج کہیں ایک ٹانگ پر نہ کھڑا کر دے۔

اسی چکر میں اسے کتنی بار اپنے ناشتے سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا۔ جاتے وقت وہ کچن میں توے پر اُس کا منہ چڑاتے سنہری پراٹھوں کو بڑی حسرت سے تکنا نہ بھولتا۔

امی بیچاری کو تاسف گھیر لیتا بڑی یاسیت سے اپنے معصوم بچے کو ایسے شہد آگیں لہجے میں پکارتیں گویا سات ماہ کے بچے کو دودھ کا کہہ رہی ہوں۔

''ہائے میرا لخت جگر...... ٹھہر میں ڈبہ دیتی ہوں وین میں یا اسکول میں کھا لینا۔''

''ہائیں......؟ کلاس میں بریک ٹائم شرارتیں کرتے اسٹوڈنٹس میں لنچ کا تصور ہی اسے جھرجھری لینے پر مجبور کر دیتا۔ نہ جی کھانا اسکول میں کھانا ہم اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں چلو اگلی صبح ذرا جلدی جاگ لیں گے۔ اور اگلی صبح پچھلی صبح ہوتی...... پھر واپسی پر بقول سنی...... تھکے ہارے گھر آؤ تو امی اور نانو پیار کرنے کے لیے ایسے دبوچ لیتی ہیں جیسے سالوں کی پیاسی ہوں پھر ٹیوشن جانا، پیدل واپس آنا، ٹیوشن میں اسکول ڈائری ختم کر کے گھر میں سیلبس کرنا۔

امی کو تنہا کام کرتا دیکھ دل میں 'خیر سے ڈھیروں پیار ہلکورے لینے لگتا ہے نظریں چراؤ تو ضمیر کی ملامت سو مجبوراً کچن میں ان کی ہیلپ کرتے ہوئے اُن کی پیار بھری باتیں (آج ماں کے ساتھ کام کروا رہے ہو کل کو بیوی کی ہیلپ کرو گے وغیرہ وغیرہ) پر کان نہ دھرتے ہوئے کچن سمیٹو تو خیر سے انٹرنیٹ دہائیاں دیتا ہے کہ ہم کس کھاتے میں شمار ہوتے ہیں؟ اس کی سنو تو ٹی وی پر آتے اس کے فیورٹ ڈرامے کی آہیں اسے باہر تک سنائی دیتی ہیں کہ ہم پر بھی نظر کا شرف بخشو اور آخر میں سب کو کھینچ کھینچ کر اُن کے بستر پر لٹاتے ہوئے صحن کے دروازے پر بڑا سا تالا لگا کر وہیں صحن میں ہی بیٹھ کر بارہ مرتبہ آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے چاروں طرف پھونک مار کر ایک خاص حصار کھینچتا اپنے اور اپنی فیملی کے ساتھ گھر میں چوری چکاری سے بچاؤ کا حصار...... پھر باہر لاؤنج کی تمام لائٹس آف کر کے ایک ذمہ دار عورت کی طرح شب کے گیارہ بجے بستر پر لیٹ کر ناچتے تاروں کا تماشا دیکھتے وہ چند لمحوں بعد ایسا دوسرے جہاں کی سیر کو نکلتا کہ کوئی بیچ رات گلا پھاڑ کر چلاتے ہوئے اسے زبردستی جگاتا تو وہ ایک لمحے کو آنکھیں کھول کر دیکھتا پھر اسے اگلے جہاں کی کوئی بھیانک چیز سمجھ کر اُس کی طرف پشت کر کے ایسے جاتا کہ واپسی سورج کی تیز

کرنوں کے ہمراہ ہوتی۔

پھر وہی معمول شروع......

ایسے میں اتوار اس کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوتا۔ آج کل اسے یوگا کرنے کا دھن سوار تھا اب بھی وہ سر کو گھٹنوں سے لگانے کی جدوجہد میں تمام تکلیف ضبط کیے بڑی ہمت سے سر کو مزید جھکانے میں مصروف تھا۔

ہلکے سے جھٹکے سے سر گھٹنوں سے جا ٹکا۔ سنی کے چہرے پر بے یقینی کی ملی جلی کیفیت ابھری پھر 'یاہو' کے نعرے لگاتا اچھلنے کودنے لگا جیسے جوئے شیر لے آیا ہو۔

خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹنے لگی اسی لمحے موبائل پے ہلکی سی بپ بجی۔

اسکرین پر 'آپی ڈیئر' کا نام دیکھ کر وہ فوراً سیل فون کی طرف متوجہ ہوا۔ اگلے پل میسج اوپن تھا۔ سنی تم بے کم و کاست تھے۔ بے دست و پا ہونے پر مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی۔

دوسرے پل ہی اس نے نہ صرف وہ عبارت پڑھ لی تھی بلکہ نئے اور مشکل الفاظ پر مشتمل اس کا مفہوم و مطلب جان لیا تھا۔ بے شک سنی کم عمر تھا اس کی اتنی عمر نہیں تھی کہ وہ اس سطر میں بیان کرب کو پڑھ پاتا مگر وہ جان چکا تھا۔

اس کا آپی ڈیئر سے کوئی خونی رشتہ نہیں تھا مگر اس کے باوجود بہت کم مدت میں وہ اسے بے حد عزیز ہوگئی تھیں۔ دنیا میں صرف خونی رشتے ہی تو سب کچھ نہیں ہوتے ناں سنی اور اس کی آپی ڈیئر کا رشتہ بھی خون سے بڑھ کر تھا۔ اس کی بات پر سنی کے ننھے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ بے حد جینئس اور انوسنٹ تھا اور اس بات کو دل پر لے چکا تھا۔ اس بات کا گواہ بھی اس کا اپنا چہرہ تھا جو چند لمحوں پہلے خوشی سے دمکتا اب اُداس ہو چکا تھا۔ اس پل پہلی بار وہ چودہ سالہ پُر گوسنی اس کے اعتراف پر پُر ملال دل کے ساتھ اسے حوصلہ دینے کے لیے کوئی مناسب الفاظ ترتیب دینے کی کوشش میں تھا۔ اور اسے بہلانا سنی کو آتا تھا۔

☆......☆......☆

''اُف...... بہت تھکا دیا بسمہ تم نے تو۔ ٹانگیں درد کرنے لگی ہیں اب تو۔'' وہ شاپنگ سے واپسی آئیں تو لالہ موسیٰ میں سورج ڈوبنے کا وقت ہو رہا تھا۔

آتے ہی انعم نے شاپنگ بیگز صوفے پر ڈھیر کر دیے وہ واقعی بہت تھک چکی تھی۔ انعم کے خالہ زاد کی شادی طے ہوئی تھی اور بسمہ نے تیاریاں ابھی سے شروع کر دی تھیں۔

انعم کو بھی خاندانی شادیاں اٹینڈ کرنے میں مزہ آتا تھا مگر اس صورت میں جب ہر چیز یعنی ڈریس، سینڈل، جیولری وغیرہ اسے ہاتھ میں لا کر دیا جاتا تب وہ تیار ہو کر سب سے آگے ایسے ہوتی جیسے سب سے زیادہ انتظار تو اسے تھا اس شادی کا......!''

بسمہ کے کانوں تک اس کی دہائی گئی تو وہ بھاگ کر پانی کا گلاس بھر لائی ہمراہ ایک عدد گولی بھی لائی۔

''یہ لیں ٹیبلیٹ کھالیں میں تب تک دہی بڑے لاتی ہوں۔'' تھکن سے انہوں نے دہی بڑے پیک کروانے کو ترجیح دی تھی۔

''تھینکس یار...... انعم کو پیار آیا بہن پر۔''

کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کرتیں امی اُن کی آوازوں پر وہ باہر آ گئیں۔

''آ گئیں تم لوگ...... کتنی دیر لگادی کیا کیا خریدا؟'' امی صوفے پر بیٹھ گئیں دوسرے صوفے پر انعم نیم دراز تھی۔ بسمہ خوشی سے ماں کو اپنے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کپڑے جوتے دکھانے لگی۔

''تم نے کچھ نہیں لیا؟'' امی نے بسمہ کی چیزیں دیکھتے ہوئے انعم سے استفسار کیا تو اس نے محض نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''چلو بھئی اب باقی کا کام تم لوگ خود دیکھ لو تمہارے ابو آ چکے ہیں تو میں ذرا صوفیہ کی طرف چکر لگا آؤں۔ شادی کی تیاریاں عروج پر ہوں گی وہ بھی سوچتی ہوگی کیسی بہن ہے۔ ایک بار بھی نہ آئی۔ اپنے عمر سے بھی پوچھتی آؤں کہ اسے اپنی اکلوتی خالہ سے سلامی میں کیا گفٹ چاہیے اب ذرا وہ فارغ بھی ہوں گے۔ صوفیہ تو ناراض رہتی ہے کہ میں ہفتوں بعد اپنی شکل دکھاتی ہوں اب کیا کہوں کہ ازلی لاپروا لڑکیاں میرے بنا ایک پل گھر نہیں چلاسکتیں۔'' امی بسمہ کی چیزیں سمیٹتے ہوئے مصروف انداز میں کہہ رہی تھیں بسمہ انعم اور انعم بسمہ کو دیکھ کر رہ گئیں۔

امی آپ سراسر الزام لگا رہی ہیں ہم پر۔ بسمہ کا منہ بن گیا امی نے پیار سے چپت لگائی۔ انعم موبائل پر مصروف تھی۔

''چلو جاؤ سالن دیکھو...... اپنے لیے اور انعم کے لیے چپاتیاں ڈال لینا ہم شاید دیر سے آئیں صوفیہ ڈنر پر روک لیتی ہے۔''

''جی امی ٹھیک ہے۔'' انتہائی سعادت مندی سے کہہ کر بسمہ کچن میں چلی گئی تو امی چادر اوڑھ کر ابو کے ساتھ چل دیں۔

انعم اسی پوزیشن میں پلیٹ سے سپون کی مدد سے دہی بڑے منہ میں ڈالتی مگر بڑے انہماک سے موبائل کی اسکرین کو تکتے ہوئے اسکرین کے پیچھے سے نمودار ایک تصویر کو Zoom کرتے ہوئے ہر زاویے سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ ایک خوبرو شخص کی تصویر تھی جو سوشل میڈیا کے ایک پیج Our Pakistan پر چار منٹ قبل شاید اس Page کے ایڈمن نے اپنی پوسٹ کی تھی۔ انعم نے Pic کے اوپر لکھے اسٹیٹس کو پڑھتے ہوئے قیاس قائم کیا۔

''تمام ممبرز کو پرزور اصرار و خواہش پر مائی رئیل پک حاضر خدمت ہے پلیز نو کمنٹ۔'' ساتھ میں اسمائیلی فیس تھا۔ انعم نے کمنٹ چیک کیں جہاں سو بیوٹی فل، ماشاءاللہ، سپر، امیزنگ کے علاوہ بہت سے تعریفی و ستائشی کلمات تھے خود انعم بھی اس کی خوبصورتی و اس کے اسٹائل سے کافی متاثر نظر آ رہی تھی۔

دراز قامت میں وہ بلیک تھری پیس لباس میں ملبوس ٹائی لگائے اسٹیج پر مائیک کے سامنے کچھ کہنے کو تیار نظر آ رہا تھا جبکہ چند مزید لوگ اس کے سامنے اسی کے کلر میں ملبوس چیئرز سنبھالے اس کی طرف متوجہ تھے اس پل وہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔ اس سے قبل کہ انعم کوئی کمنٹ پاس کرتی ٹھیک اسی لمحے وہ چونک کر سیدھی ہوئی چند لمحے تصویر تسلی کے لیے بغور جانچی۔

پھر بے چین چہرے پر یکدم پرسکون رنگ بکھر گئے۔ اسے اس کی مطلوبہ چیز مل چکی تھی۔ اب وہ اطمینان سے کمنٹ کر رہی تھی۔ پانچ سیکنڈ قبل اور اس پل کی کمنٹ میں خاصا فرق تھا۔ اس نے لکھا۔

''ہر پرفیکٹ دکھتی چیز پرفیکٹ نہیں ہوتی۔'' اور سینڈ کر کے آف لائن ہوگئی۔ بلاشبہ اس کا کمنٹ پورے ساٹھ کمنٹس میں سب سے الگ منفرد اور معنی خیزی لیے ہوئے تھا۔

☆......☆......☆

آپ مجھے بے کم و کاست ثابت کر کے مجھے ہرا رہی ہیں اندازہ ہے آپ کو؟'' وہ ناشتے سے

فارغ ہوئی تو سنی کا میسج موبائل پر پہلے سے موجود تھا۔ سنی اس کا پیغام بوجھ گیا تھا وہ آزردہ نظر آنے لگی۔

''ہار تو میں گئی ہوں سنی تم ٹھیک کہتے تھے دنیا میں ہر کوئی مخلص نہیں ہوتا۔ عرصہ ہوا اس کا چہرہ بجھا بجھا رہنے لگا تھا۔

''ہاں میں نے کہا تھا مگر میں نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کا پیار آپ سے مخلص ہے۔ سنی کا دوسرا میسج ملا تھا وہ پھیکا سا مسکرائی۔

''وہ مخلص ہوتا ہے جو آس کے چند جگنو ہاتھوں میں تھما کر چند جگنو خوابوں کی صورت میں پلکوں پر ہمارا دل، چین قرار سب آبلہ پائی کے سفر کے لیے جو تنہا چھوڑ جائے وہ مخلص کہلاتا ہے؟'' وہ حد درجہ تلخ ہوئی تھی میسج میں بھی وہ اس کا جگر خراش دکھ محسوس کر سکتا تھا۔

ایسا مت بولو پگلی! محبت کو آفتِ جان مت بناؤ ورنہ جینا از حد دشوار ہو جائے گا۔''

''تم مجھے کوئی گر بتاؤ جس سے زندگی آسان ہو جائے۔ اس کا سوال سنی کو پُر امید نظروں سے تک رہا تھا وہ آہ بھر کر رہ گیا۔ ورنہ یہ پُر سوز انتظار محبت میری جان ضرور لے لے گا چلنے پھرنے لائق تو ویسے نہیں چھوڑا۔ سنی کا جواب نہ پا کر وہ بولی تھی۔

''میرا دل چاہتا ہے میں کہیں سے آپ کو آبِ حیات لا دوں جس سے کم از کم آپ مرنے کی باتیں تو نہ کریں۔ سنی خائف سا ہوا تھا جواب پڑھ کر وہ مسکرائی۔ زخمی مسکراہٹ، کھوکھلی سی......!''

میں جانتی ہوں تمہارے بس میں ہو تو تم یہ بھی کر ڈالو بس سب کی محبتیں ہی ہیں جو مجھے جینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اس نے گہری سانس لی تھی وہ جانتی تھی کہ سنی کو دکھ ہوا ہو گا۔ اس کی باتوں سے مگر وہ کیا کرتی۔ وہی تو تھا ایک اس کا ہم راز......

''شکر ہے آپ کو احساس ہوا اور جلد ہی آپ کو عقل بھی آ جائے تو آپ اپنا علاج جاری رکھیں۔'' سنی مسکرایا۔

''سنو سنی......! جو میں نے اس دن فرمائش کی تھی تم سے گانا سننے کی پلیز وہ ریکارڈ کر کے مجھے شام تک بھیج دینا ڈیئر۔'' وہ شہد آگئیں لہجے میں اس سے فرمائش کر رہی تھی اسے سنی کی آواز بہت پسند تھی۔ سنی حیرت انگیز طور پر سنگرز کی آواز سمیت اُن کے سونگز کاپی کر لیتا تھا انڈین سونگز میں وہ بیک وقت میں ہیرو اور ہیروئن کی آواز نکال لیتا تھا اپنی کچی سریلی آواز میں وہ ہیروئن کو زیادہ آسانی سے کاپی کر سکتا تھا۔ وہ سنی سے کافی سونگز سن چکی تھی ایک اور فرمائش داغ دی۔

''کوشش کروں گا صرف آپ کے لیے......''

سنی مسکرا کر جتا رہا تھا وہ بھی مسکرانے لگی سنی اسے صائم کی یاد سے نکال لایا تھا۔ اور واقعی وہ اگلا ڈیڑھ گھنٹہ سنی سے چیٹنگ میں گزار کر صائم کی یاد سے چھٹکارہ پا چکی تھی۔ مختصر سے کے لیے ہی سہی۔

☆......☆......☆

عتیق اس وقت فیس بک پہ اپنی پک کی کمنٹس کو لائک کر رہا تھا کہ ایک کمنٹ پر ٹھٹک کر رُک گیا۔

دو تین مرتبہ کمنٹ کو پڑھتے ہوئے اس کے چہرے ولبوں پر دھیمی سی مسکان آن ٹھہری۔ اس نے دلچسپی سے اس نام کو دیکھا جس آئی ڈی سے اسے کمنٹ کیا گیا تھا۔ وہاں کوئی نام نہیں تھا آئی ڈی 'سلگتے گلاب' کے نام سے تھی۔

اس نے وہاں جا کر اس کی وال چیک کی

جہاں اُس نے غالباً چند لمحوں قبل شاعری پوسٹ کی تھی۔

موسم کی طرح پگھلتے ہوئے دیکھا اس کو
رُت جو بدلی تو بدلتے ہوئے دیکھا اس کو
جانے کس غم کو چھپانے کی تمنا ہے اسے
آج ہر بات پہ ہنستے ہوئے دیکھا اس کو
وہ جو کانٹوں کو بھی نرمی سے چھوا کرتا تھا
ہم نے پھولوں کو مسلتے ہوئے دیکھا اس کو
نہ جانے وہ دعاؤں میں مانگتا ہے کسے
ہاتھ اٹھاتے ہی سسکتے ہوئے دیکھا اس کو
پھر ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے ہم نے
جب مقدر سے اُلجھتے ہوئے دیکھا اس کو

دھیمی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔ اسے اچھی شاعری بہت اٹریکٹ کرتی تھی سو پوسٹ لائک کر کے اس نے ان بوکس میں میسج کیا۔

''خوب...... آپ نے ایسی کمنٹ کیوں کی؟'' لبوں پر ہنوز دھیمی مسکان رینگ رہی تھی۔

''ہوں...... آپ کے میسج سے معلوم پڑتا ہے کہ آپ کی بات کا اشارہ کس طرف ہے سو مسٹر عتیق صاحب لوگ چاہے جو بھی دیکھیں سمجھیں مگر میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں اب بات کوئی اتنی بڑی بھی نہیں پھر بھی آپ کی تصویر ڈیزائن کی گئی تھی۔ آپ کی شکل کے علاوہ باقی سب ڈیزائن شدہ ہے۔ انعم سے بے دھڑک جواب دیا تھا۔

''آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہیں؟''
عتیق اس کی پروفائل سے اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ کوئی لڑکی ہی ہے۔ کیونکہ جو تصویر ڈیزائن کی گئی ہے وہ میرے پاس بھی محفوظ ہے۔ برملا اور برجستہ جواب دیتے ہوئے پک بھی سینڈ کر دی۔ تو وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے سر کھجانے لگا۔ مزید کچھ لمحے وہ گفتگو کرتے رہے پھر عتیق نے تعارف کی رسم بھی نبھالی۔

وہ لاہور سے تعلق رکھتا تھا اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا مگر فی الحال جاب نہیں کرتا تھا اس کی سب سے بڑی خواہش تھی آرمی میں جانے کی مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا تھا اسے اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔ وہ فیس بک کے پیج Our Pakistan پر دہشت گردوں کو بے نقاب بھی کرتا تھا انعم کو وہ اچھا لگا تھا دوسرے دن عتیق کی طرف سے فرینڈ ریکوسٹ موصول ہوئی جسے انعم نے قبول کر لیا۔ اس پل اسے ذرا بھی گمان نہیں تھا کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جائے گی اور یہ محبت یکطرفہ نہیں تھی عتیق بھی اسے ٹوٹ کر چاہنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

اس واقعے کے ٹھیک دو ماہ بعد عتیق انعم کی آواز سن رہا تھا۔ دل زور سے دھڑک اٹھا اک سکون بھی تھا کہ انعم کو اس پر اعتبار تھا جب ہی تو اپنا پرسنل نمبر دیا تھا۔ دوسری طرف انعم محبت کے نشے میں سرشار مگر دل میں ایک ڈر بھی کنڈلی مارے بیٹھا تھا کہ اگر کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو؟ بسمہ کو انعم نے باخبر کر دیا تھا وہ انعم کو سمجھاتی رہتی تھی۔ خود سندان نے بھی اپنے خدشات کا اظہار کر دیا مگر وہ اب خود کو بے بس پاتی تھی۔

''کبھی کبھی تو اُسے خود پر تعجب ہوتا کہ یہ وہ انعم تھی جس کی سہیلی اگر اپنے منگیتر کا کوئی احوال کالج میں سناتی تو وہ اس کی پھبتی اڑاتی جسے اس چار حروف پر یقین کرنا دو بھر لگتا وہ آج پہلی بار دل کے ہاتھوں مجبور عتیق سے بات کر رہی تھی۔ وہ بھی اس حال میں جب دل کو تفہیم بے تاثیر لگنے لگا تھا۔

وہ یوں دل کے ہاتھوں مات کھا کر گھٹنے ٹیکنے

پر مجبور ہوئی تھی رابطے سے قبل اس نے بسمہ سے مشورہ ضرور سمجھا تھا۔

''انعم آپ بڑی ہو مجھ سے اس کے باوجود میں آپ کو بے کم وکاست نہیں ٹھہرا سکتی میں کیا کہوں۔ آپ خود سمجھدار ہیں پھر بھی ڈیئر ذرا سنبھل کر...... ہم اپنے والدین پر اُن کی پرورش پر کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہیں دے سکتے۔

بسمہ کی آواز اسے خاک بسر کر گئی تھی۔ خندہ روسی انعم اس لمحے حزین سی بستر پر بیٹھتی چلی گئی۔ اس شب وہ ایک لمحے بھر کو نہ سو پائی تھی۔ رات بھر دل ودماغ میں چھڑی جنگ نے صبح کے منہ نکالتے ہی اسے نڈھال کر ڈالا تھا۔ باہر ایک گلابی صبح اپنے سنہری پر پھیلائے قدم جمانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ گزشتہ شب اس کے لیے خون آشام ثابت ہوئی تھی اس کے دل کا خون ہو چکا تھا اس نے غلط جگہ دل لگا لیا تھا۔ مگر اب بڑھتے قدم روکنا اس کے بس میں کہاں رہا تھا۔ ساری رات وہ دل ودماغ میں ہزاروں تاویلیں، استدلال گھڑ کر ایک فیصلہ کر بیٹھی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی دلی آرزو آرزوئے خام ہے وہ دل کو فیصلہ سنا بیٹھی، دل کے حق میں......!

☆......☆......☆

''السلام علیکم!'' عتیق نے مسکراتے ہوئے سلام میں پہل کی تھی۔ انعم کی دھڑکنیں تھم گئیں اس کی آواز پر۔

''وعلیکم اسلام!'' انعم کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگنے لگیں تھیں۔

''کیسی ہو انعم؟'' اپنائیت سے استفسار کرتے ہوئے اس نے دوستانہ لہجہ اپنایا تھا۔

''میں ٹھیک آپ؟''

''انعم ٹھیک تو عتیق خوش باش۔'' لو دیتا لہجہ انعم گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''او کے او کے......'' دوسری طرف خاموشی چھا گئی تو عتیق نے تیزی سے اپنے جذبے پہ بند باندھے۔

''انعم میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ تم مجھے جسٹ ٹائم پاس سمجھو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا تعلق زیادہ دیرینہ نہیں۔ اس کے باوجود انعم میں نہیں چاہوں گا تم میرے خلاف دل میں کوئی اُلجھن پالو میں نے تم سے تمہارا سیل نمبر بھی تمہیں یہی سمجھانے کے لیے مانگا تھا۔ اس سے قبل جو بھی میری زندگی میں گزرا میری فیملی میں نے سب تمہیں بتا دیا ہے مگر پھر بھی تم جانتی ہو میں جاب نہیں کرتا۔ یہاں پاکستان میں تعلیم کی قدر رہی نہیں اسے بدقسمتی سمجھو یا کچھ اور خیر تم بھی نہیں چاہو گی کہ تم کسی ایسے لڑکے کا ہاتھ تھامو جو تمہارے لیے کچھ نہ کر سکے اور تمہیں ذرا ذرا سی چیز کے لیے ترسنا پڑے میں ایسا کرنے سے قبل مرنا پسند کروں گا۔

دیکھو انعم میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا کی یہ تلخ حقیقتیں ہماری محبت سے کہیں زیادہ طاقت ور ہیں گو کہ میں نے اپنی فیملی سے تمہارے بارے میں بات کرلی ہے پھر بھی میں تمہیں اس وقت اپنے خواب نگر میں ہاتھ تھامے لے جاؤں گا جب تمہاری خواہشات پوری کرسکوں تا کہ تم کسی محفل میں شریک ہو تو اتنی مطمئن تو ہو کہ دوسروں کو دیکھ کر تمہیں پشیمان نہ ہونا پڑے۔ تم سن رہی ہو نا؟'' دوسری طرف طویل خاموشی پر عتیق چونک کر پوچھنے لگا۔ انعم نے بدوقت تمام خود کو کمپوز کیا تھا، تم آنکھوں کو بے دردی سے صاف کیا تھا۔

''جی سن رہی ہوں۔'' کوشش کے باوجود انعم

کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش عتیق جیسے مضبوط اعصاب مرد کو تڑپا گئی تھی۔

''اچھا ناراض مت ہو نہیں کرتا ایسی باتیں۔'' اس کا نروٹھا پن محسوس کرتے ہوئے وہ مسکرا کر ہلکا پھلکا انداز اپنا چکا تھا۔

''اتنی دور ہوتے ہوئے تم میری کمی محسوس کرتی ہو نا؟'' اس نے شرارت سے استفسار کیا آنکھوں میں دھنک بکھر گئی۔

''کیوں؟'' وہ چہکی۔

''بتاؤں کیوں؟ وہ اس لیے کہ ایک انعم نامی پری شمائل دوشیزہ ہے اگر عتیق بات نہ کرے تو دل کو کہیں چین نہیں آتا تو...... اس پری شمائل تک بھی دل کی آواز پہنچنی چاہیے نا؟'' خوبرو بھاری و گھمبیر لہجے میں کہتے ہوئے وہ انعم کی دل کی دنیا میں حشر برپا گیا تھا۔ دل کو جیسے کسی نے جکڑ لیا مگر دھڑکنیں پھر بھی ست رنگوں کی مانند اس کے دل کی رنگین بستی میں رقصاں پہلو میں شور کرنے لگیں۔

''کیا ہوا انعم چپ کیوں ہو؟'' آواز مدھم ہوگئی۔ انعم کے تو پسینے چھوٹ گئے۔

''نن...... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اس کی حواس باختہ آواز پر عتیق کا مردانہ بھرپور قہقہہ گونجا تھا انعم سن ہوئی۔ عتیق نے اس کی کیفیت سے خاصا لطف اٹھایا کانچ کی گڑیا ساوجود اتنی سی بات پر گھبرا اٹھا۔

''انعم میں ایسی باتوں سے تمہارا ذہن سوچیں منتشر نہیں کرنا چاہتا مگر سچ ہے کہ میں تمہاری محبت میں پور پور ڈوب چکا ہوں۔'' اور انعم کا دل پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کی سعی کرنے لگا۔ عجب رومانوی سا سحر انگیز طلسم دونوں پر طاری تھا۔ ایک دوجے سے کوسوں دور ہوتے ہوئے بھی دونوں پگھل رہے تھے۔ انعم کے دل سے بدگمانی کے بادل یکدم چھٹ گئے تھے۔ عتیق کی باتیں اسے ہلکا پھلکا کر گئیں۔

''مجھے کبھی کبھی ڈھیر سارے خدشات ستانے لگتے ہیں۔'' وہ ہلکا سا اُداس ہوئی۔

''کیوں؟'' عتیق جذب کے عالم میں بولا۔

''آپ مجھے چھوڑ کر تو نہیں جائیں گے؟'' آس میں ڈوبا سوال آیا۔

''عتیق پیمان شکن نہیں۔'' ہلکی سی خفگی۔

''پیمان شکن؟'' وہ حیران تھی۔

اب تم یہ سمجھو گی کہ میں نے کون سے عہد و پیماں کیے تو ملکہ عتیق میری ہر بات میرا عہد ہے ملکہ عتیق سے۔'' آنکھوں میں شرارت مچلی۔

''مجھے کوئی عہد نہیں چاہیے مجھے کامل یقین ہے اپنے عتیق پر...... پھر بھی میں دل وہمی ہو ہی جاتا ہے۔ اپنے عتیق پر توکل ہے۔''

پہلی بار انعم کے دہان سے یہ لفظ سن کر اُس کی خوشی دیدنی تھی۔

''ہوں......!'' بند پلکوں سے سرشاری کے عالم میں آواز نکلی۔

''انعم تمہیں مجھ سے...... محبت ہے؟'' لودیتا لہجہ۔

''بتانا ضروری ہے؟'' ہلکی سی چشم پوشی۔

''ہاں...... اشد ضروری......'' سرگوشی میں زور دیا۔

''آپ بوجھ نہیں سکتے؟''

''کب کا بوجھ لیا...... بس تم سے سننا ہے۔''

''کل بتاؤں؟'' بچاؤ کا کوئی راستہ نظر نہ آیا تو انعم نے گھبرا کر کل پر ڈال دیا اس کی معصومیت پر عتیق کی ہنسی میں کھنک وہ محسوس کر سکتی تھی۔

''منظور ہے۔'' لب دبا کر مسکرا کر بیڈ سے سیدھا ہوا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے ایستادہ

آئینے کے پار اپنا عکس دیکھتے ہوئے خوامخواہ بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ دراز قد وقامت' بھرا بھرا جسم' گندمی رنگت' کھڑی مغرور ناک' شہد رنگ آنکھوں سے چھلکتی ذہانت' گرے جینز اور گرے شرٹ میں ملبوس چہرے پر معمول سے ہٹ کر محبت کی انوکھی پھوٹتی تابانی اسے اس وقت دنیا بھر میں سب سے منفرد بنا رہی تھی۔

''انعم میں کچھ عرصے کے لیے انگلینڈ جاؤں گا۔'' عتیق کی بات پر انعم کے دل کی جھومتی کائنات ساکت ہوگئی۔

''کیوں؟'' بڑی دیر بعد اس کا سوال آیا تھا۔

''جاب کے سلسلے میں یار۔''

''جانا ضروری ہے؟''

''جاؤں گا نہیں تو انعم کو لاؤں گا کیسے؟''

''مجھے پردیسی ہمسفر کی چاہ کبھی نہیں رہی۔'' انعم نے کھڑی میں کھڑے ہوئے ذہن رسا سے اپنے تئیں اسے رمز میں منع کرنا چاہا تھا۔ لالہ موسیٰ میں ابھی سورج غروب نہ ہوا تھا مگر جانے کیوں اس کا دل ڈوبنے لگا۔

محبت کی پہلی ہی سیڑھی پر اس کے شفاف دل میں موجود آب جُو کے آب استادہ میں جدائی کا پتھر بھی پڑنے والا تھا وہ بھی تب جب اس نے محبت کو رگ و پے میں اترتا محسوس کیا تھا اور چشم زدن یہ موئی جدائی بھی آ گئی۔ یہ واقعی زیادتی تھی عتیق کی پری شمائل دوشیزہ کے ساتھ...... وہ تڑپ ہی تو گئی۔

''تمہیں چاہ نہیں مگر میں تمہیں دنیا کی تمام راحت دینا چاہتا ہوں۔'' اس نے غالباً کافی کا سپ لیا تھا انعم خاموش رہی۔

''کون ہے بھائی؟'' اس لمحے کسی کی آواز گونجی تھی انعم چونک گئی۔

''تمہاری بھابی......'' عتیق کے بے ساختہ جواب پر وہ جھینپ گئی۔

''اوہو...... دکھائیں موبائل ہم نے سلام دعا کرنی ہے۔'' وہ لڑکی جو غالباً اس کی بہن تھی چہک کر بولی تھی۔

''ہاں ہاں وائے ناٹ! سنو انعم عینا میری بہن تم سے بات کرنا چاہتی ہے میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ میں نے تمہارا بتایا ہے گھر میں...... سو آج تم سب سے بات کرلو میں ماما اور بھابی کو بھی بلاتا ہوں۔''

''نہیں نہیں سنو عتیق...... میں فی الحال عینا سے بات کرلیتی ہوں آپ کی باقی فیملی سے بعد میں......'' وہ پل بھر کو گھبرا اٹھی۔

''او کے یار منظور ہے۔'' وہ فراخ دلی سے بولا۔

''ماما سے بات اسکائپ پر کرلینا۔'' اگلی بات پر اسے نروس چھوڑ کر موبائل عینا کو تھما دیا۔ وہ عینا سے بات کرنے لگی محتاط ہو کر...... مگر عینا بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی انعم کو بہت اچھی لگی وہ جلد ہی اس سے فرینک ہوگئی۔ اس دن وہ کئی گھنٹے موبائل پر مصروف رہی تھی۔

جب سورج اپنی نارنجی کرنیں زمین پر بکھیرتا مارگلہ کی پہاڑیوں کی آغوش میں اترنے کو آتا ولا ہو رہا تھا تب اس نے عتیق سے اللہ حافظ کہہ کر فون کان سے ہٹایا تھا۔

وہ چند گھنٹوں میں کی گئی باتیں انعم کے لیے انمول تھیں وہ بڑی دیر تک نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں سیر کرتی رہی۔

عتیق کا ہاتھ تھامے، ایک سہانے مستقبل کی جانب رواں دواں، خواب بنتی آنکھیں پلکوں پر

جگنو بٹھائے۔

☆......☆......☆

تیری آنکھوں کے دریا کا اترنا بھی ضروری تھا
محبت بھی ضروری تھی بچھڑنا بھی ضروری تھا
ضروری تھا کہ ہم دونوں طواف آرزو کرتے
مگر پھر بھی آرزوؤں کا بکھرنا بھی ضروری تھا

ٹپ ٹپ ٹپ...... آنسو تھے کہ دودھیا گالوں پر بہتے چلے گئے۔ سنی اپنی سریلی آواز میں راحت فتح علی خان کے گانے کے بول بڑے سُر سے منہ سے نکالتا گٹار کے تاروں کو چھیڑتا ہوا ماحول میں فسوں پیدا کر رہا تھا۔ یہ گٹار بھی اسی نے سنی کو پچھلے سال زبردستی اس کی برتھ ڈے پر خرید کر بھیجا تھا۔ اور اس سمے وہ اس بات سے قطع انجام اُس کے دیے گٹار کو نہیں بلکہ اس کے دل کے گھاؤ کو چھیڑ رہا تھا۔

''تم میرے لیے ابن الوقت کیوں ثابت ہوئے مجھے رگ جاں سمجھتے نا تم؟ کئی بار متواتر یہی گانا سن کر خود کو اذیت دینے سے تھک ہار کر وہ تیرہ وتار آسماں کے دور کہیں سینے پر مدھم تاروں کے وسط میں اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے شکوہ کر گئی۔

ابھی چند لمحے ہی سرکے تھے کہ سنی کی ریکارڈنگ موصول ہوئی۔ وہ اس لمحے کچھ بھی سننے کی پوزیشن میں نہ تھی مگر سنی کو اگنور نہیں کر سکتی تھی اسی لیے وہ ریکارڈنگ سننے لگی جانتی تھی سنی اُسے پُرملال کیفیت سے نکالنا چاہ رہا تھا۔

''آپی غور سے سنیں...... ایک بار میرے جیسے ہونہار اسٹوڈنٹ کو...... 'دنیا گول ہے' کے عنوان پر چند لائنز تحریر کرنی تھیں۔ تو پتا ہے کہ اس نے کیا لکھا؟ اس نے لکھا چھٹی ٹائم چھٹی کی بیل بجی گھنٹی دیکھی تو وہ گول تھی۔ گھر جانے کے لیے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر نیچے دیکھا تو بائیک کے ویل گول تھے۔ گھر آیا والدہ نے کھانا دیا دیکھا تو روٹی بھی گول تھی۔ رات چودھویں کی شب تھی چاند دیکھا تو وہ بھی گول تھا دریں اثناء گھر کی چھت پر نظر پڑی تو وہاں پانی کی ٹینکی بھی گول تھی تو اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ دنیا گول ہے۔'' وہ پل بھر کو رکا۔

''پھر معلوم ہے استاد نے کیا کہا؟'' انہوں نے کہا بیٹا غور سے دیکھو نیچے دیے گئے نمبر بھی گول ہیں۔ ہاہاہا...... ''اور میرے خیال میں اس سے یہ ثابت ہوا کہ دنیا میں ہمارے علاوہ بھی بہت سے پاگل ہیں۔'' اپنی بات مکمل کر کے اس نے معصوم سا قہقہہ لگایا تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی۔ روتے روتے ہنس پڑی تھی سنی اسے ہمیشہ دکھوں سے نکال لیتا تھا چاہے جوک سنا کر ہی۔

اب کے وہ کال ملا کر سنی سے باتیں کر رہی تھی قدرے گھبرائے وشرمائے سنی کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے۔

''تم بہت سویٹ ہو سنی، میرا دل چاہتا ہے تم میرے پاس ہوتے یا میں آجاتی مگر تم بہت دور ہو پھر بھی پاس ہو۔''

بیک وقت وہ اپنی بات کو دو تین مرتبہ توڑ مروڑ گئی سنی قدرے ہلکا سا ہنسا۔

''میرے لیے دعا کیا کرو سنی...... وہ بہت مان سے کہہ رہی تھی سنی ہنوز مسکرا رہا تھا۔

''میری دعا ہے آپی کہ اللہ آپ کو جہاں بھی رکھے جس کے ساتھ بھی رکھے، ہمیشہ اپنی رحمتوں کے سائے تلے اپنی بے شمار رحمتوں کے پھول برساتا رہے آمین۔'' سنی نے معصوم سی دعا دی۔

''او کے سنی ڈنر کے بعد بات ہوگی۔'' سنجیدگی سے کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔ انجانے میں سنی اسے پھر اُداس کر گیا۔ اس نے

تیزی سے ایک میسج ٹائپ کیا۔

سنو!

مجھے تم دعا دیتے ہو نہ؟

کہ......

خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے

جہاں بھی رکھے

جس کے ساتھ رکھے......!

پر نہ جانے کیوں......

اس آخری جملے پر مجھے

بد دعا کا گمان ہوتا ہے

سپاٹ سے انداز میں اس نے چار سو نظریں دوڑائیں جہاں دسمبر کی طویل وحشت بھری راتوں کی افسردہ و پژمردہ تاریکی اسے اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی اس سنگ دل دسمبر کے مہینے کو جس نے کیا کیا نہیں چھین کر اسے بے دست و پا بنا دیا تھا۔ سردیوں کی شامیں اور بالخصوص دسمبر کی اُداس لمبی راتیں اُسے اَن دیکھی وحشت میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ تیزی نے اس نے وہیل چیئر موڑی اور لان عبور کر گئی۔

☆......☆......☆

''اُف کیا مصیبت ہے یار یہ خواتین یہاں تک کھنچی چلی آئیں؟'' انعم کے بے زار لہجے میں کہی بات پر بسمہ کے ہونٹوں پر بھرپور ہنسی آ پائی جبکہ اس پر بے پناہ جھنجلاہٹ سوار تھی۔

''مجھے کیوں سنا رہی ہو، تمہیں ہی اپنے قلو پطرہ جیسے حسن کی نمائش بڑی بھاتی ہے اب بھگتو۔'' بسمہ کا انداز بے اعتنائی لیے ہوئے تھا انعم نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ خوامخواہ بغلیں جھانکنے لگی۔

''شرم تو بیچ کھائی ہے تم نے کہ بڑی بہن کی مدد ہی کرلوں اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا چلو تو طنز بازی بند کرو۔'' اب وہ بسمہ پر چڑھ دوڑی۔ بسمہ نے گویا اس کا حکم بسر و چشم رکھ کر ایک طرف صوفہ پر بیٹھ گئی۔ ناک پھلا کر......

انعم نے تیز نگاہوں سے چھوٹی بہن کو دیکھا پھر خود بھی بے چارگی سے بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔ بات دراصل یہ تھی کہ انعم بسمہ اور امی ابو کے ہمراہ (بھائی صرف ایک تھا جن کا انگلینڈ میں اپنا بزنس تھا وہ وہیں شفٹ تھے) اپنے خالہ زاد عمر کی شادی میں گئی تو وہاں خالہ کی جاننے والیوں کی نظر انعم پر پڑ گئی۔ خالہ سے تھوڑی پوچھ گچھ کر کے وہ انعم پر ایسی فدا ہوئیں کہ شادی سے سیدھا انہی کے گھر چلی آئیں۔ امی ابو بھی وہیں تھے جبکہ وہ ان سے قبل ڈرائیور کے ہمراہ گھر آ گئیں تھیں اور اب خوب پچھتا رہی تھیں کہ وہ دونوں خواتین اس وقت اُن کے ڈرائنگ روم میں بڑی تمکنت سے براجمان تھیں۔

''بسمہ خدا کے لیے جاؤ اُن کو کولڈ ڈرنک سرو کرو اور چلتا کرو اس سے قبل کہ امی ابو آ جائیں وہ یہاں سے جا چکی ہوں۔ میں کیا کہوں وہ آپ کو طلب کر......''

''میں بندۂ بے دام ہوں اُن کی جو طلب فرما رہی ہیں جاؤ اُن کو کہو کہ میں نہیں ملنا چاہتی جاؤ۔ اب کی بار اُس نے قدرے درشتی سے حکم صادر کیا تو بسمہ بے چاری انگلیاں چٹختی کمرا عبور کر گئی تو انعم بے چینی سے کمرے میں چکر کاٹنے لگی۔

اگلے پندرہ منٹ میں خدا خدا کر کے وہ خواتین کسی طرح رخصت ہو چکیں تو بسمہ ہانپتی ہوئی روم میں داخل ہوئی۔

''اُف خدارا...... انعم کیسے ڈھیٹ لوگ ہیں بھئی تمہارے سسرال والے...... توبہ......'' بسمہ کے منہ سے لاشعوری طور پر یہ جملہ کیا نکلا انعم کے تو

تن بدن میں آگ لگ گئی۔
''سسرال والے ہوں گے تمہارے خبردار جو دوبارہ ایسی واہیات منہ سے نکالی تو۔'' انگلی اٹھا کر وارن کرتی وہ موبائل سے عتیق کو 'اسکائپ' پر آنے کا کہہ کر تن فن کرتی باہر نکل گئی۔ اور ابھی پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ عتیق کے سامنے بھڑاس نکال رہی تھی۔
''اچھا بابا چھوڑو...... تمہیں مجھ سے کوئی جدا نہیں کرسکتا آئی سمجھ؟''
''کیا خاک سمجھ آئی۔ یہ صرف باتیں ہی اچھی لگتی ہیں ایک ماہ بھی نہیں لگے گا دور ہونے میں۔'' وہ تڑخ کر بولی تو عتیق کھل کر مسکرایا۔
''اچھا تم ہو جاؤ گی دور؟'' وہ اس وقت کھلے گلے والی شرٹ میں ملبوس حد دلکش نظر آرہا تھا۔ بازو سے جھلکتے مسلز نمایاں تھے اس لمحے شاید اسے خود بھی ادارک نہ ہو کہ وہ مقابل بیٹھی موی پری شمائل کے ہوش اڑا رہا تھا۔
''مر کر بھی نہیں......!'' کھوئے ہوئے لہجے میں اُس کی بات پر وہ جی بھر کر بدمزہ ہوا۔
''یہ مرنے والی باتیں درمیان میں کہاں سے لے آتی ہو؟''
''واقعی میں مر جاؤں گی عتیق آپ کے بنا...... میں اپنے ماں باپ کے مان کو بھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی ہرگز نہیں۔ مجھے کبھی خود سے بھی غصہ آتا ہے کہ میں والدین سے خیانت کررہی ہوں ہاں اگر وہ میری شادی کہیں اور کرنا چاہیں تو میں انکار نہیں کرپاؤں گی۔ میں بہت بزدل ہوں۔''
اُس کی سنہری کانچ جیسی آنکھوں میں آنسو تیر کر سامنے کا منظر دھندلا گئے جہاں عتیق اس کے آنسو چننے کے لیے مچل رہا تھا۔ اسے بے پناہ تکلیف ہو رہی تھی ان آنکھوں میں آنسو دیکھنا جن میں وہ خواب کے جگنو رقصاں کرتے دیکھتا تھا۔
''ریلیکس انعم...... کچھ غلط نہیں ہوگا۔ میں ہوں نا۔ تمہارے والدین یقیناً بہت اچھے ہیں وہ تمہاری پسند کی قدر کریں گے تمہیں بس تھوڑی ہمت دکھانی ہوگی بس...... اب یہ آنسو پونچھ لو یہ مجھ میں بڑی اذیت دیتے ہیں یار......'' اس کی تسلی آمیز باتوں پر انعم کی آنکھیں خشک ہوئیں مگر وہ مسکرا نہ سکی۔
''سنو میرا ویزا آگیا ہے ماما چاہ رہی تھیں تمہاری انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی ڈال دوں مگر میں تب سوالی بن کر آؤں گا جب تمہارے والدین کے انکار کی کوئی گنجائش نہ بچے...... کوئی جواز نہ ہو ٹھکرانے کا، سمجھ رہی ہو؟'' لرزتی پلکوں کے ساتھ انعم نے سر ہلایا۔ عتیق اس کی معصوم ادا پر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔
''پتا نہیں تمہارے جانے کے بعد تقدیر کیسا پلٹا کھائے؟'' وہ اپنے بدترین خدشات کو زبان نہ دے سکی اور یہی ہوا تھا ان دونوں کے ساتھ...... زندگی بلاشک وشبہ شطرنج کی بازی جیسی ہے۔
عتیق صائم اپنے والدین کا لاڈلا تھا چونکہ باقی بہن بھائیوں سے چھوٹا تھا۔ والد کی رحلت ہوئی اس وقت جب بڑے دونوں بھائی گھر بار کے ہو چکے تھے اور بڑی بہن بھی۔ رہ گئے عتیق اور عینا جو دونوں حال ہی میں تعلیم مکمل کر چکے تھے۔
عموماً فیس بک پر پُرخلوص دوست ملنا اتنا ممکن نہیں مگر شاید تقدیر کو ہی ان دونوں کا ملنا منظور ٹھہرا تھا۔
عتیق کے دونوں بھائیوں کی بھی لو میرج تھی سو اس کے اپنے گھر سے کوئی رکاوٹ نہ بنتی مگر عتیق ابھی جاب لیس تھا وہ بھائیوں پر بوجھ نہیں ڈال سکتا تھا اور ابھی عینا کی ذمہ داری بہرحال تھی۔ ماما

(فاطمہ بیگم) تو اب کچھ نہ کر سکتی تھیں۔ عتیق کو پاکستان میں ایسی جاب کا ملنا ناممکن لگا جو اس کے خوابوں کو پورا کر سکے لہٰذا اس نے باہر جانے کو ترجیح دی۔ اس کا ویزا آ گیا تھا باقی معاملات بھی کلیئر تھے جو فی الحال تو انعم کی اُداسی کا خیال کر کے اس سے چھپا گیا۔

21 دسمبر کو اس کی فلائٹ تھی۔ اُس نے سوچا وہ انعم کو بعد میں بتا دے گا ابھی چند دن باقی تھے۔ انعم کے بدترین خدشات رنگ لائے۔ تقدیر نے پلٹا کھایا تھا۔ شطرنج کی بازی میں ایسا مہرہ کھیلا گیا جس سے، محبت کی نازک ڈوری ٹوٹ گئی۔

زندگی میں آبلہ پائی کے سفر کی شروعات ہو گئی۔ تعلق یکسر مسمار ہو گئے۔ اور وہ دونوں قسمت کے اس پھیر سے یکسر انجان ایک دوجے کو بے وفا گردانتے آبلہ پائی کے اس تنہا سفر میں ایک دوسرے سے نوحہ کناں تھے۔

☆......☆......☆

انیس دسمبر کی خاموش شام بکھر رہی تھی ہمراہ خنکی لیے، انعم کے گھر کے لاؤنج میں اس سے نئے دولہا عمر اپنی بیگم شرمائی سی رابعہ اور صوفیہ خالہ کے ہمراہ براجمان نظر آ رہے تھے۔ شادی کے بعد یہ انکی انعم لوگوں کی طرف پہلی دعوت تھی۔ امی نہال دکھائی دے رہی تھیں جبکہ بسمہ رابعہ کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول نظر آ رہی تھی۔

انعم کے سیل پر عتیق کے میسج آ رہے تھے جو اسے کوئی اہم بات بتانا چاہ رہا تھا مگر وہ اس وقت اسکائپ میں نہیں جا سکتی تھی۔ سو ویٹ کا میسج کر دیا۔ نجانے کیوں سسکتی بکھرتی شام کو کائنات کی ہر چیز ٹھٹک کر دیکھتی انہونی محسوس کر رہی تھی۔

دریں اثناء میں آئس کریم کھلانے کا عمر نے پروگرام سیٹ اپ دیا اور پُرجوش بسمہ امی سے اجازت یا کہیں بس اطلاع دیتی انعم کو بھی لے کر باہر آ گئی۔ یوں تین خواتین اور ایک مرد کا یہ قافلہ ٹہلتے سورج کے بعد روانہ ہوا۔

بظاہر سب اچھا جا رہا تھا گاڑی میں سکون کی لہریں تھیں۔ انعم کی سوچیں عتیق میں اٹکی تھیں جو نجانے اسے کیا بتانے والا تھا؟ انہی سوچوں کے گرداب میں زندگی بھی اُلجھتی چلی گئی۔ عمر کا دھیان پل بھر روڈ سے بھٹکا وہ رابعہ کو چھیڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔

سامنے کچھ آیا تھا یا وہ سامنے آ گئے تھے سنبھلتے سنبھلتے بھی دیر ہو گئی۔ اگلے پل گاڑی زلزلوں کی زد میں تھی۔

زندگی کی شاہراہ پر زندگی کی گاڑی خطرناک موڑ پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ ونڈ اسکرین چھنا کے سے ٹوٹ کر کرچیاں اس کے پری پیکر جسم کو چیرتے ہوئے اپنا کام کر گئی تھیں۔ عمر کے گاڑی کو بریک لگانے کی جدوجہد میں وہ جھٹکے سے ڈور سے ٹکرائی اور دوسرے ملے دوسرے جھٹکے سے آندھی طوفان کی طرح گاڑی کے دروازے سے نکل کر فٹبال کی ہٹ کی صورت گھومتی ہوئی سڑک پر جا گری تھی۔ آنکھوں میں خون آلودہ منظر جگر خراش تھا پل بھر میں جیسے پورا شہر اڈتا ہوا نظر آیا۔ دنیا و مافیہا سے غافل ہونے سے قبل جو منظر اُس کی آنکھوں میں تھا اس میں عتیق ہاتھ ہلا کر مسکراتا ہوا اسے 'بائے' کہہ رہا تھا اس نے کانپتا ہاتھ اٹھایا جیسے اُسے روکنا چاہتی ہو اسی پل کوئی زور آور وزنی چیز کے نیچے وہ آئی اور پل کے اختتام پر ذہن میں سورج ڈوب کر آنکھوں میں اندھیر اکر گیا۔

☆......☆......☆

دوسری طرف عتیق کی بے چینی و بے تابیاں

عروج پر تھیں۔ وہ انعم کو اپنے نام سے پابند کرنا چاہتا تھا اسے آخری پل جاتے ہوئے مسکراتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا وہ وہاں بھی انعم سے کانٹیکٹ میں رہے گا مگر وہ اب فیس بک پر نہیں آتی تھی اس کی آئی ڈی ڈی ایکٹویٹ ہو چکی تھی وہ موبائل یا اسکائپ پر بات کرتے تھے۔ وہ دن انتظار کرتے گزر گیا انعم کا سیل فون آف تھا وہ چکرا کر رہ گیا اور پھر اکیس دسمبر بھی آ گیا اس کی روانگی کا دن...... اپنے پیار سے دوری کا دن......! پورا دن وہ سخت اضطراب کا شکار اسے کال کرتا رہا مگر جواب ندارد...... بالآخر وہ دل پر منوں بوجھ لادے انگلینڈ کے لیے پرواز کر گیا۔ اور اسی دن اکیس دسمبر شام ساڑھے پانچ بجے وہ فاطمہ اور عینا کو ڈھیروں تسلیاں دیتا بمشکل اداس دل اور پرنم آنکھوں کے ساتھ جہاز میں بیٹھا ہمیشہ کے لیے اپنی محبت کی راہیں علیحدہ کر گیا تھا۔ اس بات سے قطعی نا آشنا کہ انکی منزلیں بس یہی تک تھیں۔ اور پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ غلط تھا۔ انعم سے پورے آٹھ ماہ تک بات نہ کر سکنے پر مایوس یوں ہوا کہ پورا ماہ بستر پر پڑا رہا۔ محبت میں شکست خوردہ کا کوئی پرسان حال بھی نہیں تھا۔ دریں اثناء میں اس کے باس نے اس کی بہت ہیلپ کی تھی وہ بہت نیک دل انسان پاکستان سے ہی تھے۔ جہاں عتیق جاب کرتا تھا۔ اور پھر انگلینڈ میں لحہ لحہ پل پل اداسیوں کی زد میں گزرنے لگا۔

☆......☆......☆

دن رات مہینے سال موسم بدلتے چلے گئے۔ وہ انعم کی زندگی کا بدترین و بھیانک ایکسیڈنٹ تھا۔ عمر کی ٹانگ میں فریکچر آیا تھا بسمہ اور رابعہ کو بھی شدید چوٹیں آئیں تھیں مگر اصل قیامت تو انعم پر ٹوٹی تھی۔ جس لمحے وہ روڈ پر گری تھی اسی لمحے وہ دوبارہ کار کے نیچے آئی تھی۔ ان چاروں کو ایمرجنسی میں قریبی اسپتال پہنچایا گیا تھا جہاں زخموں سے چور انعم کو بچانے کی تابڑ توڑ جدوجہد کے باوجود وہ چوبیس گھنٹے بعد کوما میں چلی گئی تھی۔ زندگی واقعی اب سہل نہیں رہی تھی۔ عمر ڈیڑھ ماہ مکمل بیڈ ریسٹ کے بعد چلنے پھرنے کے قابل تھا بسمہ رابعہ کے گھاؤ بھی بھرتے چلے گئے مگر انعم کو اس ایکسیڈنٹ سے زیادہ عتیق کی دوری و بے اعتنائی نے توڑ ڈالا تھا۔ وہ آٹھ ماہ بعد کوما سے واپس زیست کی طرف لوٹی تھی۔ اس کے علاوہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہی تھی اس کا علاج بیرون ملک ممکن تھا مگر اب وہ کس کے لیے علاج کرواتی؟

اس لیے تاکہ پھر سے اس کی شادی کا سوچا جائے؟ وہ آٹھ ماہ کے عرصے میں سب بھول چکی تھی اس کا موبائل آٹھ ماہ قبل ہی لالہ موسیٰ کی شاہراہ پر کہیں چوری ہو گیا تھا۔ عتیق کا نمبر اسے یاد نہیں تھا وہ بالکل ٹوٹ گئی تھی۔

عتیق بے وفا نکلا تھا اسے اس پر یقین کرنا مہنگا پڑا تھا وہ اسکائپ پر جاتی تو وہاں عتیق آف لائن ملتا۔ انعم کے تو وہم و گمان میں نہیں تھا کہ وہ سات سمندر پار جا بسا ہے زندگی صرف گھر تک محدود ہو کر رہ گئی ایسے میں سنی اس کا بے حد خیال رکھتا۔ سنی اس کا فیس بک فرینڈ تھا مگر عتیق سے تو اچھا ہی تھا کہ اس اذیت ناک وقت میں بھی اس کو مایوسیوں سے کھینچ لیتا تھا۔ تھا تو خیر بچہ ہی سہی...... اس کا کم سن دوست......

☆......☆......☆

'Happy New Year' - سنی کی طرف سے خوشیوں بھرا سال مبارک اور بیتا سال غموں سمیت آپ کی زیست سے گزر ہی گیا نیا

سال نئی امنگوں سمیت بانہیں پھیلائے کھڑا ہے آئیں نئی امیدوں کے ساتھ اسے ویلکم کریں۔''

☆......☆......☆

دسمبر کا اختتام ہوا جنوری شروع ہوا تو سنی کی طرف سے یہ پیغام پڑھ کر درد کی ایک لہر پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ عتیق صائم کو دور ہوئے پورے دو سال بیت گئے تھے نجانے کیوں اسے اس وقت کچھ ٹوٹ کر یاد آیا۔

سوچا تھا بچھڑیں گے تو مرجائیں گے
کمال کا وہم تھا، ہوا کچھ بھی نہیں

حد درجہ تلخی اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ خندہ رُو انعم یکسر بدل چکی تھی وہ کھوئی کھوئی خلاؤں کو تکتی رہتی اسے گلہ تھا اپنی تقدیر سے...... وہ علاج نہیں کرانا چاہتی تھی وہ جانتی تھی ایک اپاہج کو کون اپنائے گا مگر وہ غلطی پر تھی۔

''انعم تمہارا رشتہ آیا ہے میں چاہتی ہوں تم مل لو ایک بار لڑکے والوں سے، وہ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں انہیں معلوم ہے تمہارے بارے میں مگر انہوں نے اعتراض نہیں کیا۔ وہ تمہارا علاج کروالیں گے خود ہی۔'' امی نے دھیمے انداز میں بات شروع کی۔

''امی نہیں کرنی مجھے شادی کتنی بار کہوں آپ کو؟ خدارا معاف رکھیں مجھے۔ بسمہ بھی ہے آپ اسے دیکھیں۔'' درشتی سے کہہ کر اس نے آنسو چھپائے۔

''اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی انعم بہت من مانی کرلی تم نے، تمہارا بھائی بھی ہے پھر اس کے سر پر سہرا باندھنا ہے کہ نہیں؟''

''تو انہیں دیکھیں نا۔''

''اچھا دیکھ لوں گی اسے بھی پہلے تمہیں کیوں نہ دیکھوں۔'' امی کی بات اور پھر لہجہ ایسا تھا کہ انعم کو ہنسی آ گئی امی خفا ہو گئیں۔

''امی کیا آپ کو لگتا ہے میری شادی چل سکے گی؟'' اس نے شکوہ کناں نگاہوں سے امی کو دیکھا وہ چپ رہ گئیں۔

''اللہ بہتر کرنے والا ہے سب ٹھیک ہوگا۔ بسمہ کو آتا دیکھ کر امی نمی چھپاتیں وہاں سے ہٹ گئیں جبکہ انعم پر اوس پڑ گئی تھی۔ گویا موہوم سی امید بھی ٹوٹ جانے والی تھی۔ عتیق اب خواب ہی رہنا تھا۔

☆......☆......☆

''میری شادی ہو رہی ہے۔'' انعم نے تھکی سانس خارج کرتے ہوئے سنی کو اطلاع دی۔

''اچھی بات ہے۔'' سنی کی آواز میں کھنک تھی۔

''سنی......!'' اس نے شاکی انداز میں اسے پکارا۔

''میں نے کہا تھا نا نیا سال آپ کی جھولی میں خوشیاں ڈالنے آیا ہے آپ کے دکھوں کی مدت ختم ہوئی مجھے خوشی ہوئی آپی۔'' وہ پُرسکون تھا انعم نے مشکوک نظروں سے موبائل کی اسکرین کو گھورا۔

''کچھ چھپا تو نہیں رہے ہو؟'' کھوکھلا انداز تھا۔

''نہیں تو۔'' وہ گڑبڑا گیا۔

''اوکے...... تم دیکھ لینا سنی میری شادی کبھی کامیاب نہیں ہوگی میں تو عتیق نامی شخص کی امانت ہوں اسی سے منسوب، مجھے نہیں یقین کہ میری شادی چھ ماہ تک بھی چل سکے واپسی تو ہونی ہی ہے چلو ایک اذیت اور سہی، ایک غم اور سہی۔'' رنجیدہ سی سیل آف کر چکی تھی جبکہ پہلی بار سنی کو ملال نے نہیں گھیرا تھا۔

قسمت پھر بدلی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح موسم بدلا تقدیر نے پھر پلٹا کھایا مگر اس بار کی پلٹ میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔

☆......☆......☆

وہ جاتی سردیوں کے دن تھے شیشم کے عریاں بدن پر ہلکا سا سبزہ پھوٹتا نظر آتا تھا۔ سرما کا سرد ویران موسم مخصوص المعیاد آیا اور اب گرما کا راستہ چھوڑتا اسے ویلکم کرتا رخت سفر باندھ چکا تھا۔ چوہدری ہاؤس میں وہ ایک عام سی صبح تھی۔ گھر میں اس سمے ناشتے سے فراغت کے بعد چائے انجوائے کی جارہی تھی۔

زاویار کی آمد پر گھر کا ماحول خوشگواریت لیے ہوئے تھا۔ انعم کے ایکسیڈنٹ کے بعد وہ دوسری بار گھر کا چکر لگانے آئے تھے۔ کل رات کی فلائٹ سے وہ گھر پہنچے تھے اور دونوں بہنوں کے لیے ڈھیروں چیزیں لائے تھے انعم کی مرجھائی صورت پر بھی بھائی کی آمد پر تھوڑی بہت رونق ضرور بکھری ہوئی تھی۔ امی ابو مطمئن سے ہوئے تھے۔

اس دن وہ رشتے والوں کے ہاں لڑکا دیکھنے جارہے تھے بسمہ اور امی کی خوشی دیدنی تھی۔ جبکہ اس کے اندر چھنا کے سے کچھ ٹوٹا تھا۔ بسمہ ان کے ساتھ جانے کو بضد تھی مگر انعم کی تنہائی محسوس کرتے ہوئے وہ وہیں ٹھہر گئی۔ انعم اپنی شفاف سرمئی آنکھوں میں ویرانی سموئے انہیں دیکھتی رہی تقدیر نے ان دنوں جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا وہ اپنی قسمت سے ہی نالاں رہنے لگی تھی۔ عتیق اسے شدت سے یاد آتا اسے اندر سے کھوکھلا کررہا تھا۔ اپنا دیرینہ موبائل وہ اسی حادثے میں کھوچکی تھی عتیق کی فیملی سے بھی وہ رابطہ کرنے سے قاصر تھی اسے اس ان کے سیل نمبرز بھول چکے تھے۔ وہ

کئی گھنٹے لیپ ٹاپ گود میں رکھے پتھرائی آنکھوں سے اسکائپ پر مختلف لفظ ٹائپ کرتی اسکائپ پہ اپنا اکاؤنٹ اوپن کرنے کی ناکام کوشش میں خود کو بے بسی کی انتہا پر پاتی۔ آٹھ ماہ مردہ حالت نے اس سے یہ سب ذہن سے مٹا دیا تھا مگر کاش انسان کی یادیں بھی اتنی آسانی سے ذہن و دل سے مٹ جاتی جتنی آسانی سے اسکائپ کا پاسورڈ بھولا تھا۔ اس شام گھر والے لوٹے تو وہ کمرے میں بند ہوگئی باہر سے دیر تک باتوں کی آوازیں آتی رہیں۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی اگر اس وقت عتیق سے اس کی شادی ہورہی ہوتی تو حالات کچھ اور ہوتے مگر......

اس رات وہ نیند لانے کے لیے ایک کے بعد ایک سلیپنگ پلز پھانکتی چلی گئی اور اگلی صبح نتیجہ وہی ہوسکتا تھا۔ اگلی صبح بلکہ اگلے دن اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال کے بستر پر خود کو پڑا دیکھتی رہی اُلجھتی رہی کہ ہوا کیا؟''

☆......☆......☆

''بھائی بابا میں سچ کہہ رہی ہوں کہ میں خودکشی کی کوشش نہیں کی میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی، پتا نہیں یہ کیسے ہوگیا؟'' وہ پشیمان سی صفائی دیتی رہی۔

بسمہ اور زاویار اسے نرمی سے لیے ہوئے کمرے میں آئے اور بستر پر لٹاتے ہوئے بسمہ باہر چلی گئی جبکہ زاویار وہیں بیٹھ گیا۔

''جو بھی ہوا تمہارا ایسا ارادہ نہیں تھا مگر میری گڑیا تمہیں نیند کی گولیاں لینے کی کیا ضرورت پڑگئی۔'' لہجے میں نرمی وسنجیدگی تھی۔

''پتا نہیں بھائی مگر پرامس پھر نہیں لوں گی۔'' خفت زدہ لہجے میں وہ جھٹ سے وعدہ کرگئی زاویار نے موبائل سائیڈ پر رکھ کر اس کے ہاتھ تھام

''گڈگرل......! اور اس بار تم میرے ساتھ چل رہی ہو اپنی ٹانگوں کے علاج کے لیے یو نو امی ابو بہت تنہا لگتے ہیں مجھے، میں وہاں اور وہ یہاں تنہا دو جوان بیٹیوں کے ساتھ...... مجھے جانے پہلے عقل کیوں نہیں آئی خیر ہم آخری بار جارہے ہیں میں اپنا بزنس پاکستان منتقل کرنے کا سوچ رہا ہوں تم میرے ساتھ چلو پھر اکٹھے واپس آجائیں گے مبادا میری نیت نہ بدل جائے۔

سنجیدگی سے سمجھاتے ہوئے اُن کی حسِ ظرافت پھڑکی انعم ہلکا سا مسکرائی دفعتاً اُن کی سائیڈ سے رکھے موبائل کی گھنٹی بجی۔ خاموش ماحول میں ارتعاش پیدا ہوا۔ انعم نے موبائل پر نظر ڈالی جہاں اسکرین پر نام بھی نمودار تھا۔ بھائی نے موبائل کان سے لگایا اور کھڑے ہوکر ٹہلتے بات کرنے لگے ایک نظر انعم پر ڈالی وہ اسی طرح ساکت بیٹھی تھی چند لمحوں بعد وہ ان سے کہہ رہے تھے۔ مجھے تمہارا موجودہ رشتہ پسند نہیں آیا میں نے انکار کردیا ہے۔ انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا وہ سپاٹ نہیں تھا دھواں دھواں ہورہا تھا۔ رنگت فق تھی۔

''سوری میرے مینیجر کی کال تھی۔ ہاں تو ہم کیا بات کررہے تھے؟'' انہوں نے اطلاع دے کر بات وہیں سے جوڑنی چاہی۔

''تم کیا کہو گی، میں نے یہ رشتہ رد کر کے ٹھیک کیا ناں؟ وہ لڑکا میری بہن کے قابل نہیں تھا۔

''بھائی میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔ خشک آنکھوں میں اشکوں کا غبار امڈ آیا۔

''کیا؟'' وہ حیران ہوئے اچانک اس کا یا پلٹ کا سبب؟

''جی!'' لب بھینچے۔

''آپ بھی تو یہی چاہتے تھے۔'' اُن کی آنکھوں میں اُلجھن دیکھ کر وہ بولی تھی۔

زاویار کچھ سوچ کر زیرلب مسکراتا رہا۔ انعم کی ناں ناں اور اب اتنی بے چینی...... وہ جانے کیا سوچتا رہا۔

☆......☆......☆

تقدیر بدلی تھی اس کی ساتھ میں شکوہ شکایات بھی مٹ گئے۔ گھر والے بہت خوش تھے اس کے فیصلے سے...... مگر وہ بہت بے چین تھی۔ اپنے مقصد کو پانے کے لیے جس کی وجہ سے وہ وہاں گئی تھی اور اب وہ زاویار کے فلیٹ کے چھوٹے سے مگر اسٹائلش ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی بے تابی سے پہلو بدل رہی تھی۔ اگر وہ یہاں سے نامراد لوٹی تو پھر کبھی زمین پر کھڑی نہیں ہوسکے گی نہ ہی ہمت کرپائے گی یہاں آنے سے قبل سنی نے بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اسے مفت کی دعائیں بھی دے ڈالیں۔ اسے ہنسی آگئی تھی۔ سنی کے سالانہ ایگزام سر پر تھے بلکہ تقریباً اسٹارٹ ہونا ہی چاہتے تھے سنی بہت مصروف تھا پھر بھی دن میں تین مرتبہ اُس کی خیریت ضرور پوچھتا تھا چاہے ٹیکسٹ کر کے ہی۔

انعم نے نظریں اُٹھا کر گلاس وال کے پار دیکھا اور پھر...... ہوا کے ساتھ ساتھ اُس کی سانسیں بھی رُک گئیں۔ وہ سامنے والے کو حسرت سے دیکھتی رہی، اردگرد کے ہر شے ساکت ہوکر سائیں سائیں کرنے لگی ایسے میں چھائے سکوت پر وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کا شور بخوبی سن سکتی تھی۔ وہ چلانا چاہتی تھی مگر زبان گنگ تھی لب ہل رہے تھے زبان ساتھ نہ دیتی تھی۔ جسم و ہاتھ ایسے

ہل رہے تھے گویا وہ رعشہ کی مریضہ ہو۔

اس دن...... ہاں انعم کے کمرے میں جب زاویار بھائی کا موبائل بجا تھا اس کی نظر بھٹک کر موبائل تک گئی تھی اور تب ہی ہاں تب ہی تو وہ جامد بیٹھی رہ گئی تھی وہ کیسے بھول سکتی تھی اس نام کو جو اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔

اور پھر اس آواز کو جو بالکل مدھم سی اسکرین سے نکل رہی تھی مگر اس کا تو روم روم سماعت بن چکا تھا جب ہی وہ اڑی رنگت اور پیاسی نظروں سے پتھرائی بیٹھی رہی اور پھر اس کے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھی۔

''اور وہ...... ہاں ہاں اس کا عتیق اس کا صائم' وہ بکھرے بالوں والا اسی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ انعم دیکھ رہی تھی اسے بے بسی سے وہ بھاگ کر اس کے پاس جانا چاہ رہی تھی مگر ٹانگیں اجازت نہ دیتی تھیں وہ سکینڈ گننے لگی۔ عتیق ویسا ہی تھا انگلینڈ کی ہوا اسے خوب راس آئی تھی وہ نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا تھا۔

انعم رعشہ کی مریضہ بنی لرزتے ہاتھوں سے وہیل چیئر گھسیٹتی خود کو وہاں تک لائی تھی اور وہ جو نظریں جھکائے آنکھوں پر خوبصورت گلاسز لگائے اندر بڑھ رہا تھا نگاہیں اٹھیں تو...... وہ ٹھٹکا ہاتھ تیزی سے چشمے تک گئے اور پاؤں پابجولاں ہوگئے۔ ان دیکھی زنجیروں نے پاؤں کو جکڑ لیا تھا وہ شاکڈ تھا انعم کو دیکھ کر...... یا اس حالت میں دیکھ کر......!'' کھڑا ہونے کی خواہش میں انعم اٹھ رہی تھی وہ جھٹکے سے طلسم سے باہر آیا اور چشم زدن میں اسے گرنے سے بچانے کی آرزو میں وہ اسے باہوں میں بھر چکا تھا۔ نادیدہ ریگ رواں نے دونوں کی آنکھوں میں مرچیاں بھر دی تھیں۔

وہ پہلی بار مل رہے تھے ایک دوسرے کو محسوس کر رہے تھے ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ دونوں کی ہر حاس بیدار ہوچکی تھی۔ انعم اس کے مضبوط مردانہ حصار میں رقص بسمل کی مانند پھڑک رہی تھی۔ وہ نرمی سے اسے سمیٹ رہا تھا، بلکہ ہلکے ہاتھ سے مبادا وہ بکھر نہ جائے۔ دو سالوں کی دوری آنکھوں میں اشک کے ساگر کا سہارا لیتی ایک دوسرے پر یہ حقیقت آشکار کر رہی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے کیا ہیں؟

کتنے ہی لمحے یونہی بیت گئے، ساکت کائنات روتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

انعم کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔ عتیق نے نرمی سے اسے واپس وہیل چیئر پر بٹھایا تو اس کی اپنی بلیک شرٹ سینے سے بھیگ چکی تھی جبکہ انعم کی سرمئی آنکھوں پر سوجن در آئی تھی۔ شہد رنگ آنکھوں میں کرب اترا۔

''تم کیسی ہو انعم؟'' وہ فرش پر بیٹھا اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے پرسان حال تھا انعم پھر رونے لگی۔

''آپ عتیق ہیں ناں؟ مجھے یقین دلائیں کہ آپ میرے عتیق ہیں اور میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہی۔ اگر یہ خواب ہے تو میں اس خواب کا امر ہو جانا چاہوں گی۔ میں پھر نہیں کھو سکتی آپ کو ہرگز نہیں۔'' اس کا سوال نظر انداز کیے وہ بے یقین تھی۔

''نہیں انعم اب خوابوں کے ساگر میں ڈوب کر منزل تلاشنے میں ہلکان نہیں ہونا اب حقیقت کی دنیا میں جینا ہے جہاں جھٹکا لگنے سے حسین منظر غائب ہونے کا خدشہ نہیں ہوگا' اس دنیا میں نہیں بلکہ ہماری دنیا میں جو بے حد حسین ہے' دھنک کے ست رنگوں سے تشبیہ!''

وہ سحر آمیز لہجے میں بولتا ٹکٹکی باندھے بے حد

دلچسپی سے اس کا برسوں کا بے آب ورنگ چہرہ تک رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟'' وہ خائف ہوئی۔

''دیکھ رہا ہوں کہ تصور میں نظر آتی تمہاری چھوٹی ناک کیا واقعی اتنی چھوٹی اور نازک ہے۔''

''ہیں......!'' عتیق کے بے تکے جواب پر انعم کا ہاتھ حیرانی سے ناک کو چھو گیا تو عتیق کا قہقہہ فضا میں جلترنگ بجا گیا تھا۔ جبکہ ان دونوں سے چند قدم دور کچن کی دریچہ سے جھانکتی دو آنکھیں اپنے اس فیصلے پر مطمئن خود پر اطمینان برسا رہی تھیں۔ اور وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اُس روز اپنی کمپنی کے ورکر کا سرسری سا موبائل چیک کرتے ہوئے جو اس پر آشکار ہوا تھا اس نے اس کے اندر سے روایتی غیرت مند بھائی بننے کی بجائے ٹھیک وقت پر عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے درست فیصلہ لے کر اپنی معصوم دکھی بہن کے قدموں میں خوشیاں ڈھیر کر دیں تھیں۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ عتیق کے بارے میں وہ سب جانتے تھے۔ اس مختصر عرصے میں وہ جس طرح اپنے قدموں پر کھڑا ہوا وہ قابل ستائش تھا اور عتیق کی محبت سے وہ واقف تھے۔ سب کچھ انہی کے سامنے ہی تو ہوا تھا۔ وہ اپنی بہن کو بہت خوش قسمت تصور کر رہا تھا۔ اور کسی نے سچ ہی کہا ہے اپنی خوشی سے زیادہ دوسروں کی خوشی کا سوچو کیونکہ جو آپ دوسروں کو دو گے وہ پلٹ کر آپ کے پاس ضرور آئے گا اور یقیناً اسی کے بدلے ان کی زندگی میں نیک سیرت عینا آئی تھی۔

☆......☆......☆

موسم بہار لوٹ آیا تھا جب ہی تو درختوں پر شگوفے پھوٹتے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ ڈار جس میں خوبصورت بلبلیں بھی شامل ہوتیں اپنی سریلی آوازوں میں گیت سناتیں رقص کرنے لگتیں۔ عتیق اور انعم کیا ملے چار سو گلاب کھل اٹھے تین ماہ بعد عتیق اور زاویار کا ہلکا سا سہارا لے کر زمین پر قدم جما کر چلتی انعم بسمہ اور امی ابو کی آنکھوں میں آنسو لے آئی تھی۔ جس لان میں پودوں کے درمیان وہ اُداس بیٹھتی تھی وہ پودے اور اس پر جڑے پھول انعم کو بائیں طرف سے آسرا دیتے عتیق کو دیکھ کر بڑی معنی خیزیت سے جھوم رہے تھے۔ انعم چہک رہی تھی اور بسمہ کو آنکھوں سے رمز کر کے خود کو داد دے رہی تھی کہ دیکھو میں کیسے جیت آئی اپنے پیار کو۔ اور سدا کی رمز شناس بسمہ ہکا بکا ہی تو رہ گئی، انگشت بدنداں ہوگئی تھی۔

عتیق کی فیملی لالہ موسیٰ تو نہیں مگر لالہ موسیٰ کے قریب ہی ایک پوش علاقے میں شفٹ ہوگئی تھی۔ وہ پہلی بار انعم کو ملنے آئے تھے۔ عینا اور بسمہ تو خوشی سے تتلی بنی اڑی اڑی جا رہی تھیں۔ امی ابو کو زاویار بھائی نے جانے کیا سمجھایا وہ بھی خوش خوش نظر آتے باہر دیکھ رہے تھے جہاں عینا اور عتیق بسمہ کے ساتھ مل کر انعم کو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دس منٹ کی واک کروا رہے تھے۔ وہ اب چل سکتی تھی مگر بسمہ اس کے گرنے کے ڈر سے اس کے ساتھ ساتھ چلتی۔

اور اگلے پندرہ دنوں میں چوہدری ہاؤس مختلف ننھی مُنی لائٹوں سے جگمگا رہا تھا جہاں عینا اور انعم دلہن بنیں شرگیں مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتی عروسی لباس میں سب کے دلوں کے دریچے سے اندر اتر رہی تھیں۔

عینا کی رخصتی پہلے ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی بارات انعم کو بیاہنے چلی آئی رخصتی سے قبل

بسمہ انعم کے پاس آئی۔
''بڑی خوش ہو رہی ہو رخصتی پر رونا تمہیں ہی پڑے گا۔'' انعم نے اس کی حسِ ظرافت کو چیلنج کیا۔
''اور تم کیوں کھلکھلا رہی ہو؟'' دھیمی آواز میں استفسار کیا۔
''بھئی کیوں ناں خوش ہوں؟ آخر تمہارے جانے کے بعد تمہارے حصے کی شاپنگ و دوسری چیزیں میرے حصے میں جو آنی ہیں۔'' اور وہ دو پریاں اس کی شرارت پر مسکرائے بنا نہ رہ سکیں۔ پھر عمر بھائی رابطہ کے ہمراہ مل کر اُن کی تصویریں بنانے لگیں۔
سنہری شیروانی زاویار اور سرخ شیروانی میں ملبوس عتیق کے پہلوؤں میں چپکے سے دو پریاں بٹھا دی گئیں تو صوفے کی پشت پر جھک کر دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کانوں کو ٹچ کر کے باقی چاروں انگلیاں پھیلا کر لمبی سے زبان نکالے نٹ کھٹ سی بھالو لگتی بسمہ کی کھٹ کھٹ تصویریں اتارتے دونوں میاں بیوی قہقہے لگا رہے تھے۔ جھکی پلکوں سے بھی انعم بہن کی شرارت جان سکتی تھی۔

☆......☆......☆

محبت میں دوری کے سلگتے موسم کٹتے نہیں کٹتے ایسے میں پُرکیف لمحوں کی مدت کافی چھوٹی لگنے لگتی ہے۔ آج دو پیار کرنے والوں کی شب زفاف تھی۔ انعم پر بے یقینی کی کیفیت طاری تھی تو یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ اس وقت اپنے خوابوں کے محل میں بیٹھی وہ اپنی تقدیر پر نازاں تھی۔ اس کا کمرا خوبصورت پھول پتیوں اور موم بتیوں سے سجایا گیا تھا۔ جہازی سائز بیڈ پر خوشبودار گلابی پتیوں کو دل کی شکل دی گئی تھی جہاں احتیاط سے بیٹھتے ہوئے وہ عتیق کا انتظار کر رہی تھی۔ جگہ جگہ بکھرے پھولوں کلیوں کے بیچ موم بتیاں رکھی گئیں تھیں۔ عطر بیز روم کی سجاوٹ اس کی دھڑکنیں منتشر کر رہی تھی۔ معاً شب کے بارہ بجے کے قریب وہ کھٹاک سے اندر داخل ہو رہا تھا اور پلٹ کر اس کا ہاتھ دروازے کی کھڑکی تک گیا تھا۔ تبھی قدرے ایزی ہوتی انعم دوہری ہوئی تھی۔ کنڈی چڑھا کر اس نے لائٹ آف کی اور ماچس جلا کر وہ موم بتیاں روشن کر رہا تھا روم لمحوں میں گلابی و خوابناک لگ رہا تھا۔ تب ہی وہ قدم قدم اٹھاتا اُس تک پہنچا تھا اور چند پل سرکنے کے بعد اس کے ہاتھ تھام لیے۔
پھر انعم نے اسے کہتے سنا۔
''تم واقعی مجھ سے زیادہ خوبصورت ہو۔'' انعم نے ہنسی بمشکل ضبط کی اس کی بات پر۔
''مجھے فخر ہے خود پر کہ ایک رشک پری نے میرا ہاتھ تھاما۔'' اب کی بار چند آنسو اُس کی پلکوں میں اٹکے پلکیں اٹھیں تو روشنی میں جگنو کی طرح چمکتے شفاف اشک عتیق کو مبہوت کر گئے تھے۔ بے اختیاری کے عالم میں اس نے قریب ہو کر وہ جگنو لبوں سے چن لیے۔
''اور مجھے اس بات پر کہ اب ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا آپ کو نہیں پتا میں کتنا ترسی ہوں اس وقت کے لیے جب کوئی دنیا کی طاقت الگ نہ کر سکے ہمیں۔
عتیق کی بے قراری نے اسے خود میں سمٹنے پر مجبور کیا۔ عتیق بانہوں کے حلقے میں اسے لے چکا تھا۔
''سب بھول جاؤ انعم بس صرف اتنا یاد رکھو ہمیں اب جدا نہیں ہونا۔'' اس کے گھمبیر لہجے پر انعم کا دل پسلیاں توڑ کر نکلنے پر آمادہ تھا۔

''اچھا چلیں نوافل پڑھتے ہیں، میں نے منت مانگی تھی اپنے ملن پر پورے دو سو نوافل ادا کرنے کی، چلیں مل کر پڑھتے ہیں۔
وہ اٹھنے لگی۔
''ضروری ہے آج؟''
''بہت ضروری!'' انعم نے زور دیا تھا۔
''کل پڑھیں؟'' عتیق نے شرارت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
''ہوں...... منظور ہے۔'' کبھی کبھی اس کی بات انعم نے اسے لوٹائی تو وہ دلکشی سے مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔
کھڑکی کا پردہ برابر کرتے ہوئے اس نے چاند کو دیکھ کر آنکھ کا کونا دبایا اور مسکراتا ہوا پلٹ آیا جھینپی انعم کے پاس، اور باقی شب عتیق کی رفاقت میں قطرہ قطرہ بھیگتی رہی۔

☆☆......☆☆

''واہ اور یوں ہوئی فیس بک سے شروع ہونے والی لو اسٹوری کا ہیپی اینڈ...... واہ واہ ایسی اسٹوری جو دید نہ شنید۔''
اگلی صبح خاصی روشن تھی بلکہ ہر صبح ایسی ہی ہونی تھی اب تو...... انعم ناشتے کے لیے جانے لگی تھی تو سنی کا میسج آیا تھا۔ اس پل وہ خوش تھی از حد...... سنی پر ٹوٹ کر پیار آرہا تھا جو ہمیشہ اسے حوصلہ دلاتا تھا خرد سال ہوتے ہوئے بھی سند ان اس کی زندگی کا اہم حصہ تھا بہت سویٹ سا سنی اس کا بھائی...... انعم نے ری پلائی دیا۔
''ہاہاہا...... دیکھ لو سنی تمہاری آپی جیت گئی۔''
وہ بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔
''ویسے کل بہت پیارے لگ رہے تھے تم۔''
''اُف آپی بات کو گھما کیوں رہی ہیں یوں کہیں ناں کہ اپنی تعریف سننے کے موڈ میں ہیں۔'' سنی نے برجستہ جواب دیا تھا کہ کل رات رخصتی کے سمے بسمہ نے اسکائپ پر دونوں کی بات کرائی تھی جہاں تک سک سے تیار سنی شادی پر تو نہیں البتہ اسکائپ پر موجود تھا۔
انعم ہنسنے لگی۔
''اچھا سنی سنو میں اور عتیق تمہارے گھر ضرور آئیں گے اب تمہارے شہر۔''
اپنی بات مکمل کر کے وہ اب بالوں کو پشت پر ڈالے ساڑھی کے بل ہاتھوں سے ٹھیک کرتی ہنسی روک رہی تھی کہ جانتی تھی سنی حواس باختہ ہو گیا ہو گا۔
''ارے سچ میں...... اوہ واقعی آپ نے ارادہ کر لیا......؟'' سنی واقعی حواس باختہ ہو گیا انعم کی ہنسی چھوٹی تو بیڈ پر الٹے لیٹے بنیان میں تکیہ بانہوں میں دبوچے عتیق نے پٹ سے آنکھیں کھولتے ہوئے شرارت سے دیکھا تو وہ سٹ پٹا گئی پھر سرعت سے بالکونی میں جا کر ہنستے ہوئے سنی کو کال ملانے لگی۔ مسکراہٹ لبوں پر لوٹ آئی تھی کبھی نا پلٹنے کے لیے۔
دنیا میں جہاں کچھ لوگ ہماری زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے وہیں کچھ لوگ ہماری زندگی کو حسین بنانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ آج کل کے حالات میں جہاں کسی پر بھروسہ دوبھر ہے وہیں فیس بک جیسی فیک دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمارے مخلص ہوتے ہیں جیسے عتیق، اور ضروری نہیں ہر انعم کو اس کا عتیق مل بھی جائے۔ اور اسی طرح کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سنی اس کا سب کچھ تھا۔ محبتوں کے معاملے میں انعم ہمیشہ کامران رہی تھی۔

☆☆......☆☆

افسانہ

کوثر ناز

میسیجز

"اماں......" وہ تیزی سے بیگ سائیڈ پر رکھتے ہوئے اماں کو پکارتی اُن کی سمت بھاگی۔ "یہ کیا ہوا ہے آپ کو؟" وہ اب اماں کا ہاتھ تھامے موٹے موٹے آنسو آنکھوں میں سجائے رو دینے کو تھی اماں کے ماتھے پر شدید چوٹ آئی تھی ایک ہاتھ بھی......

اُس کا دماغ صبح ہی سے خراب تھا پہلے تو کلاس میں اسائمنٹ جمع نہ کروانے پر سر نے اچھی خاصی بے عزتی کر ڈالی تھی پھر اوپر سے پوائنٹ مس ہو گیا تھا وہ کیسے گھر پہنچی اس کی ایک الگ کہانی، گھر آتے آتے اکیڈمی کا وقت بھی ہو گیا۔ سو سیدھے اکیڈمی چلی گئی وہاں میتھ کی کلاس میں سر کے درد کا گراف قدرے بلند ہو گیا۔ شام کو اکتائی، کچھ چڑی ہوئی گھر لوٹی تو اماں کو ندارد پا کر سخت کوفت کا شکار ہو گئی۔ پتا چلا کہ اماں کی بہن صاحبہ کی طبیعت خراب ہے سو اماں کو بلا بھیجا اور پھر اماں بھی ایسی کہ خدمتِ خلق کا شوق لیے ہی پیدا ہوئی تھی۔ سو چل نکلیں۔

نہلے پہ دہلا تب ہوا جب کھانے میں گوبھی سامنے رکھی گئی وہ جی بھر کے بدمزہ ہوئی کہ بھابی کے رحم و کرم پر گھر جب بھی ہوتا تھا یوں ہی گھر کا کچن اور نظام سارا درہم برہم ہو جاتا تھا وہ آہستگی سے پلیٹ سرکا کر اٹھ گئی دودھ اُبالا اور لے کر کمرے میں آ گئی بیگ سے موبائل نکال کر چیک کیے تو کافی سارے میسجز تھے انہی میں سے ایک میسج اریبہ کا بھی تھا جو کہ اس کی چچا زاد تھی۔ چند اللہ کے صفاتی نام تھے اور پھر نیچے لکھا تھا کہ اگر خدا کو مانتے ہو اور مسلمان ہو تو اللہ کے یہ صفاتی نام 12 لوگوں کو فارورڈ کرو 24 گھنٹے میں خوشخبری ملے گی اگر اگنور کیا تو چوبیس گھنٹے میں بری خبر ملے گی۔

یہ پڑھنا تھا کہ اس کا دماغ گھوم گیا وہ ڈیلیٹ کرتی تو گناہ گار گردانی جاتی مگر وہ فارورڈ کر کے بھی اگلے بندے کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی مگر پھر بھی کر دیا، پھر شدید تھکن کے باعث گہری نیند سو گئی۔

☆......☆......☆

"اُف کیا ہوا ہے؟" وہ یونیورسٹی سے لوٹی تو اماں کے گرد سب کو کھڑے دیکھا تو وہ جلدی جلدی ہانپتی قدم اٹھانے لگی بڑی باجی، بھائی، بھابی کے بچے، باجی کے بچے سب ہی جمع تھے اور اماں بے طرح کراہ رہی تھیں۔ سدرہ نے اماں کو

یوں تخت پر لیٹے دیکھا تو اس کے دل کو کسی نے سختی سے مٹھی میں بھینچا آج کا دن قدرے پُرسکون تھا بمقابلہ کل کے مگر یہ افتاد کل سے بھی شدید تھی۔

''اماں......'' وہ تیزی سے بیگ سائیڈ پر رکھتے ہوئے اماں کو پکارتی اُن کی سمت بھاگی۔

''یہ کیا ہوا ہے آپ کو؟'' وہ اب اماں کا ہاتھ تھامے موٹے موٹے آنسو آنکھوں میں سجائے رو دینے کو تھی اماں کے ماتھے پر شدید چوٹ آئی تھی ایک ہاتھ بھی شدید زخمی تھا اور پاؤں کی حالت بھی قدرے خراب تھی۔ اندرونی چوٹ کتنی تھیں وہ اماں کے سسکنے سے معلوم ہو رہی تھی اور اماں کی یہ حالت دیکھ کر اُس کا دل کٹ رہا تھا۔ کچھ توقف کے بعد معلوم ہوا کہ آتے ہوئے ایک گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔ غالباً غلطی گاڑی والے ہی کی تھی جو وہ اماں کو اسپتال سے ٹریٹمنٹ دلوا کر گھر بھی چھوڑ گیا تھا۔

وہ اکیڈمی جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی کہ اب بالکل بھی وہ اس حالت میں نہیں تھی کہ بچوں پر دماغ صرف کرتی اور سر کا درد مزید بڑھاتی ایک تو یونیورسٹی کی ٹینشن

اوپر سے اماں کی اور پھر اب اکیڈمی وقطعی آج کے دن تو اپنے دماغ کی شریانوں کے پھٹنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ اس نے کتابوں کے ساتھ موبائل بھی ساتھ رکھا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد سوچا موبائل چیک کرے اور پھر چائے بنانے جائے گی آج اسماء کو بھی تو اسائنمنٹ کے ٹاپک سینڈ کرنے تھے پھرنیٹ سے مواد اُٹھا کر اس نے رات کو اسائنمنٹ پر کام کرنے کا پلان بناتے ہوئے باتھ روم کا رُخ کیا۔

☆......☆......☆

''تین بار محمد ﷺ کا نام آنکھیں بند کر کے پڑھیں پھر 9 لوگوں کو فارورڈ کریں اور رات تک کا انتظار کریں آپ کو محمدؐ کی قسم آگے ضرور بھیجیں خوشخبری ضرور ملے گی۔ اتنا پڑھنا تھا کہ سدرہ کے غصے کا گراف حدود پار کر گیا۔ دل نے شدت سے خواہش کی کہ کاش سینڈر ابھی اس وقت اس کے سامنے ہوتا تو وہ اس کا منہ توڑ دیتی کس قدر کچے ایمان کے لوگ ہیں اور پھر کل کیا ہوا تھا 24 گھنٹے میں اماں کی ٹانگ ہاتھ اور پیشانی پر کس قدر گہرے زخم آئے تھے اس نے فوراً کال کا بٹن پریس کیا مگر بیلنس ناکافی پا کر بھائی کو میسج کیا کہ لوڈ کروادے پھر چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔

شام تک وہ اسی ادھیڑ بن میں رہی کہ یہ سب تعصابات پھیلا کون رہا ہے کون ہے جو مسلمانوں کو خوشخبری کا لالچ دے کر اُن کے ایمان کو کچا کر رہا ہے۔ یقیناً یہ اسلام دشمنوں کی ہی سازشیں ہیں۔ مگر ہماری بے وقوف نوجوان نسل کن کن تعصابات میں گھر کر اپنے ایمان کو کمزور کر رہی ہے اوپر سے دوسروں کو تکلیف دے کر دہرا گناہ مزید کما رہے ہیں۔

☆......☆......☆

''کون سی خوشخبری ملی تمہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اریبہ نے اچانک فون اٹھانے پر یہ سوال سنا تو وہ چونک گئی۔ سدرہ نے پھر سے اپنا سوال دہرایا تو اریبہ نے کہا کہ ''کوئی نہیں'' سدرہ کا پارہ پھر چڑھ گیا۔

''کیا تم گارنٹی دیتی ہو کہ ان میسجز سے کوئی خوشخبری یا بری خبر ملتی ہے لازماً؟'' سدرہ نے جبڑوں کو سختی سے بھینچتے ہوئے ضبط کی آخری حدود کو چھوا تھا۔

''نہیں!'' اریبہ نے پھر نفی میں جواب دیا تو سدرہ کے ضبط کا پیمانہ چھلک ہی اٹھا۔

''تو تم ان میسجز کو فارورڈ کیوں کرتی ہو؟ تمہارا ایمان اس قدر کچا ہے کہ کوئی تمہیں قسمیں دے کر اللہ کے نام آگے بھیجنے کو کہے گا تو تم بھیج کر دوسروں کو بھی پریشان کرو گی بات سنو اللہ کے ناموں کو زور و زبردستی کسی تک پہنچانے کی ضرورت نہیں ہے او کے کیونکہ اگر خدا چاہے تو اپنا علم لوگوں کے دلوں میں، ذہنوں میں اپنے آپ ڈال دے تم جیسے بند ذہنوں کا استعمال کرنے سے نہ کوئی اسلام کو فروغ ملتا ہے نہ کوئی خوشخبری مقدر بنتی ہے۔ سو براہ کرم مجھے پھر سے ایسا کوئی میسج مت بھیجنا کیونکہ یہ سراسر گناہ ہے ایمان کے کمزور ہونے کی دلیلیں ہیں۔ سدرہ نے سخت لفظوں کا استعمال قدرے کم رکھتے ہوئے اسے سختی سے وارن کیا تو اریبہ بول اٹھی۔

''یہ اللہ کے نام ہیں اور ان کو لوگوں تک پہنچانا گناہ نہیں ہے البتہ ثواب کا کام ہے اور بھی تو فضول میسج کرتے ہیں ہم تو پھر اللہ کا نام لے کر اس کی باتوں کو آگے کیوں نہ پہنچائیں اور اللہ کے ناموں کے بدلے اگر کسی خوشی کی امید کرتے ہیں تو غلط نہیں کرتے۔''

"بالکل گناہ نہیں ہے اللہ کا نام پہنچانا مگر شرطیہ آگے پہنچانا گناہ ہے، مجبور کرنا آگے بھیجنے کے لیے گناہ ہے اور ثواب کمانے کا کہتی ہو تو تم نماز نہیں پڑھ سکتی کیا اللہ کی فرض عبادت کرتے تو تمہیں نہیں دیکھا۔ اوروں کو مجبور کر کے تم کون سی خوشخبری پانے کی امید کرتی ہو، کیا اللہ یہ کہتا ہے کہ دھمکی دے کر میرے نام لوگوں تک پہنچانے کا سلسلہ چلاؤ اس عرش و فرش کے مالک کو کیا ضرورت ہے لوگوں کو دھمکا کر اپنا ذکر عام کروانے کی، عبادت کرنے والوں کی اس کے پاس کمی نہیں ہے سو جتنی بھی عبادت کرنی ہے خود تک محدود رکھو۔ اچھی بات ضرور آگے پہنچاؤ مگر کسی کو مجبور نہ کرو نہ اتنی بڑی قسمیں دو کہ مسلمان ہو یا اللہ کو مانتے ہو تو ایسا کرو، ویسا کرو، کیونکہ یہ انسان نہیں خدا فیصلہ کرتا ہے کہ کون کیا ہے اور مجھے تو اس توہم پرستی سے دور ہی رکھو پلیز مہربانی ہوگی۔" سدرہ نے کہا تو کسی حد تک اریبہ پر اس کی باتوں کا اثر ضرور ہوا تھا۔

"مگر یار وہ قسمیں!" اریبہ نے تھوڑی نرمی سے کہا تو سدرہ کا پارہ بھی تھوڑا نیچے اترا۔

"دیکھو اریبہ...... ایک مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ پر پختہ ایمان رکھنا۔ یہ ابہام صرف اور صرف ہمارے ایمان کو ڈگمگانے کے لیے اسلام دشمن پھیلا رہے ہیں۔ دیکھو نماز فرض عبادت ہے جس کی چھوٹ کبھی کسی کو بھی نہیں اللہ تعالیٰ نے تو اس کی بھی کوئی قسم نہیں دی کہ تم نماز پڑھا کرو ورنہ مسلمان نہیں رہو گے بلکہ یہ تو اللہ نے انسانوں پر چھوڑا ہے ناں کہ جو جتنا عبادت گزار ہوگا اور آخرت کے لیے اپنی جگہ جنت میں مختص کروالے گا، چندا یہ تو کوئی عبادت نہ ہوئی نہ کہ مجبور کر کے اللہ کے ناموں کی تشہیر کروائی جائے بھیجنے والے کی ہزاروں مجبوریاں ہوسکتی ہیں۔ ہوسکتا ہے فی الوقت اس کے پاس بیلنس نہ ہو اور بعد میں بھول جائے تو مطلب اس کے لیے بری خبر لازمی مختص ہوگئی اور کل امی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا جبکہ میں نے بھی فارورڈ کیا ویسے میں کرتی نہیں پھر بھی کل کیا تو مجھے کیا ملا؟ سو یہ سب صرف فضول مفروضات وتعصبات ہیں جو اسلام دشمن پھیلا رہے ہیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں چاہیے کہ ایسی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دین کی راہوں پر اپنے قدم مضبوطی سے جمالیں کہ کوئی ایک میسج ہمارا ایمان نہ ڈگمگادے۔

سدرہ نے سمجھایا تو اریبہ کے ذہن میں کافی کچھ بیٹھ گیا خصوصاً یہ کہ اللہ کو ایسے رضا کاروں کی ضرورت نہیں جو مجبوراً اس کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کی تلقین کریں بلکہ اللہ تو کہتا ہے جو تمہارے دل کو بھلا لگے، جس پر تمہارا ایمان مضبوط ہے وہی کرو وار پھر ایک میسج کیا یہ فیصلہ کرے گا کہ ہم مسلمان کے عہدے پر فائز ہیں یا نہیں، بالکل بھی نہیں سو وہ یہ عہد کرتے ہوئے کہ وہ پھر سے ایسے کسی میسج کو آگے بھیج کر اگلے بندے کو پریشان کرنے کے بجائے بھیجنے والے کو سمجھائے گی تاکہ یہ غلط سلسلہ بند ہو اور ہمارے معاشرے سے ایسی چھوٹی مگر ایمان سوز چیزوں کا قلع قمع ہوسکے کہ تھوڑا بہت حصہ ہم بھی معاشرے کو صحت مند بنانے میں ڈال سکیں۔

وہ سدرہ سے معذرت طلب کرتے ہوئے آئندہ ایسے میسجز آگے نہ بھیجنے کا عہد کررہی تھی اور سدرہ کی ساری تھکن، سارا غصہ یکدم ٹھنڈا ہوگیا تھا وہ خود کو اب قدرے ہلکا پھلکا محسوس کررہی تھی۔

☆☆......☆☆

عالیہ حرا

فیصلہ

''ارے کیا بکواس کر رہی ہے ہونے والی بھاوج ہے گھر کی، بھائی کو سمجھاؤ ایسا حسن چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو نہیں ملے گا۔'' اندر آتے طاہر صاحب ان کی بات سُن کر مسکرائے اور کاؤچ پہ بیٹھ گئے۔ رخ پھیر کر فاطمہ، زہرہ سے بات کرنے لگیں۔ ''ہاں یہ تو ہے......

''نہیں ماما مجھے رابی سے شادی نہیں کرنی۔'' عارض نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا کر سنجیدگی سے ماں کو دیکھا۔ اور فاطمہ ہکا بکا عارض کو دیکھنے لگیں۔

''کیوں؟''

''آپ کا انتخاب غلط ہے یا میری سوچ...... یا ہماری قسمت کا ستارہ، میں سمجھ نہیں پا رہا بس مجھے رابی سے شادی نہیں کرنا۔'' کھانے کی پلیٹ کھسکاتے ہوئے اپنی بات دہرائی۔

''پوچھ تو رہی ہوں ...... کیوں؟'' فاطمہ کو غصہ آنے لگا۔

''ماما!'' تذبذب سے انہیں دیکھا۔

''شاید میں آپ کو سمجھا نہ سکوں۔'' گلاس نیچے رکھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم اتنی اچھی پیاری سُلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ کیا خامی ہے رابی میں۔''

''ماما...... میرے اُس کے مزاج نہیں ملتے، خیال نہیں ملتے، سوچ میں فرق ہے۔ آپ کی پسند میں نے اپنائی، آپ نے کہا بات کرو اپنی بات سمجھاؤ اُسے ہم خیال ہم مزاج بناؤ۔ میں نے کیا مگر......'' وہ لمحہ بھر کو رکا۔

''آئی ایم سوری ماما...... وہ ایک خود غرض لڑکی ہے۔ اپنے لیے جیتی اپنے لیے مرتی ہے۔ میری سوچ میرے خیال کی اُسے فکر نہیں۔ میں کیا چاہتا ہوں۔ میری مرضی کیا ہے۔ اُسے میری کیا کسی کی بھی فکر نہیں ہوتی۔'' فاطمہ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہیں۔

''آپ انکار کردیں۔'' صاف گوئی سے کہا۔ اٹھا اور وہ باہر نکل گیا۔

فاطمہ اُس کی خالی کرسی کو دیکھتی رہ گئیں۔ خیر النساء اور حامد بھائی کو کیا جواب دیں گی۔''

''دیکھ لیا اپنی ضد کا نتیجہ......'' طاہر صاحب نے فاطمہ کا فکر انگیز مکالمہ سن کر انہیں ہی موردِ الزام ٹھہرایا۔

''مجھے تو اُس کی منطق ہی سمجھ نہیں آرہی۔

لڑکی گھر آجاتی ہے تو اس کو سمجھا، پرکھا جاتا ہے۔ ہے یہ کیا...... تو اُدھر میں اِدھر اور...... اور ہم خیال
مزاج ملتے ہیں، آشنائی پیدا ہوتی ہے۔ ماحول بنتا نہیں۔'' فاطمہ سے عارض کا انکار ہضم نہیں ہو رہا

تھا۔
فاطمہ یہ ہمارا زمانہ نہیں ہے۔ اب زمانہ بہت فاسٹ ہوگیا ہے جو ہمیں نہیں معلوم وہ انہیں پتہ ہے۔ عارض اگر انکار کر رہا ہے تو ٹھیک ہی وجہ ہوگی۔ وہ بہتر سمجھتا ہے۔ اخبار تہہ کر کے رکھا اور دوسرا اٹھالیا۔
''بجائے سمجھانے کے اُس کے ہم خیال بن جائیں۔'' چڑ گئیں۔
''زندگی عارض نے ہی گزارنی ہے۔''
''کس قدر شرمندگی ہوگی مجھے......'' اخبار کی اوٹ سے انہیں دیکھا۔
''تمہارا بیٹا ہے شرمندگی لڑکی والوں کو ہوتی ہے فاطمہ......!'' جواب میں وہ انہیں گھور کر رہ گئیں۔
''اُسے سمجھائیں گھر آجائے تو اپنے قالب میں ڈھال لیں۔''
''ہم اس معاملے میں زور زبردستی نہیں کرسکتے۔ فاطمہ وہ اپنے لیے بہتر سمجھ سکتا ہے۔''
''بات تو کریں۔'' زچ ہوگئیں۔
جواب میں اک نگاہ اُس پر ڈال کر اخبار کی جانب متوجہ ہوگئے۔ فاطمہ سر پکڑے سوچتی رہیں۔

☆......☆......☆

''ہیں......کیوں؟ امی...... وہ تو بہت خوش تھے۔'' زہرہ نے حیرت سے پوچھا۔
''پوچھ لو اپنے بھائی سے جاکر......'' سخت چڑی ہوئی تھیں۔
عارض انکار کر کے آفس وزٹ پر فیصل آباد گیا ہوا تھا۔
''بات تو کرتیں، پاپا سے کہیں......''۔
''خاک کہوں، وہ تو عارض کی طرف ہیں بیٹا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ زندگی اُس نے گزارنی ہے۔''
''ہوں...... کوئی بات ہوئی ہوگی رابی کے ساتھ، ویسے امی ہے بڑی گھمنڈی لڑکی...... بڑا شوق ہے اُسے خودنمائی کا......''
''ارے کیا بکواس کر رہی ہے ہونے والی بھاوج ہے گھر کی، بھائی کو سمجھاؤ ایسا حسن چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو نہیں ملے گا۔''
اندر آتے طاہر صاحب ان کی بات سُن کر مسکرائے اور کاؤچ پہ بیٹھ گئے۔ رخ پھیر کر فاطمہ، زہرہ سے بات کرنے لگیں۔
''ہاں یہ تو ہے سارے خاندان میں دھاک بیٹھ جائے گی۔ میں عارض سے بات کرتی ہوں۔''
''اُسے مناؤ...... اُسے روکو...... میں جلد شادی طے کردیتی ہوں۔ گھر آئے گی تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' بے چینی وفکر ایسی تھی کہ زمین وآسمان ایک ہو رہا تھا۔
''جی......''
''اگر عارض نہ مانا...... اُس کی اور کوئی پسند ہوئی تو......'' زہرہ نے ایک نیا عندیہ پیش کیا۔
فاطمہ کو اتنا غصہ آیا کہ دھڑ سے فون رکھ دیا۔
''جب بولے گی فضول ہی بولے گی۔''
''کیا کہہ دیا زہرہ نے......''
''وہی جو آپ اور عارض چاہتے ہیں۔''
''ہم نہیں چاہتے اللہ چاہتا ہے اک گھر میں تین لوگوں کی مرضی ورائے انکار کی ہو تو وہ کام نہیں کرنا چاہیے۔'' لب بھینچ کر غصیلی نگاہ طاہر صاحب پر ڈالی۔
''ہاں......! جب یہ کام کیا تھا تو سب کی مرضی ومنشا شامل تھی۔''
''اب اُس نے پرکھ لیا تو کیا کیا جائے۔

چائے پلوا رہی ہو..... اور یہ ردا کدھر ہے۔''
''پڑوس میں میلاد میں گئی ہے۔''
وہ ریموٹ اُٹھا کر کاؤچ پر ہی نیم دراز ہو گئے۔
''آپ عارض سے بات کریں نا.....'' ملتجی نگاہ اُن پر ڈالی۔
''اُسے آ تو لینے دو میں سمجھاؤں گا مگر زبردستی نہیں کروں گا۔ آخری فیصلہ اُس کا ہوگا۔ فاطمہ کے اعصاب شل ہو رہے تھے۔ انکار...... اور وہ بھی بلا جواز......
ان کی جگ ہنسائی ہے رابی ان کا انتخاب تھی۔ ان کا اصرار تھا جو عارض نے ہاں کیا۔ مگر وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔
فاطمہ کو حسین بہو چاہیے تھی۔ حامد میاں کے ہاں چکر کاٹ کاٹ کر ہاں کروالی اب انکار......
''اُف......!'' چائے لا کر طاہر صاحب کو دی۔
''یار...... ! فکر مت کرو جو ہوگا بہتر ہوگا۔ ہمارا بیٹا نا سمجھ نہیں ہے انکار کی کوئی وجہ ہوگی۔'' اٹھ کر کپ تھام لیا۔
تم نے بھی تو حسن کی پری کا انتخاب کیا ہے وہ اگر پروں میں سمیٹ کر ہمارے بیٹے کو لے اڑی تو......!'' خفگی سے انہوں نے طاہر صاحب کو دیکھا۔
''اگر اُسے ہم کالے کلوٹے لوگ پسند نہ آئے تو......'' باز نہیں آئے۔ رگِ ظرافت اُبھر رہی تھی۔
اور......
''اور...... میں اٹھ جاتی ہوں قیاس آرائیاں بند کریں۔ کوئی لمحہ قبولیت کا بھی ہوتا ہے۔''
''ہا...... ہا......'' کھل کر ہنسے۔
''قبولیت کا لمحہ وہ بھی ہوتا ہے جب کچھ ہمارے نصیب میں نہیں ہوتا۔'' فاطمہ نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ باہر نکل گئیں۔ ان کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔
''رابعہ کی دادی آنا چاہ رہی تھیں۔ کیسے ان کو منع کریں۔ ان کا بیٹا......
''اُف...... اُف عارض کس مشکل میں ڈال دیا ہے بیٹا۔''

☆......☆......☆

''بھائی ماما بہت پریشان ہیں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔'' ردا نے عارض کو چائے دیتے ہوئے کہا اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔
''امی کی وکیل بن کر آئی ہو۔''
''نہیں ماما نے مجھے کچھ نہیں کہا اپنے طور پر آئی ہوں۔''
''میرا دل نہیں مان رہا اُس سے شادی کو۔''
''آپ کو پسند ہے کوئی......؟''
''نہیں......''
''پھر انہیں سمجھائیں آپ سے ملتی ہیں آپ کی باتیں سنیں گی۔''
''نہیں...... وہ ایک ضدی اور گھمنڈی لڑکی ہے۔ ''میں'' کی اُس کی نظر میں اہمیت ہے۔ خود نمائی کا شوق نہیں جنون ہے اُسے ...... وہ خود کو قلوپطرہ سمجھتی ہے۔''
''مجھے کچھ نہیں سمجھتی۔ اور جہاں مرد کی عزت نہ ہو وہاں مرد اک پل نہیں ٹکتا۔ یہ تو عمر بھر کا ساتھ ہے۔'' ردا بھائی کو دیکھتی رہ گئی اور کچھ بولنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔
''تم ماما کو سمجھاؤ انہیں کسی کے سامنے کوئی حساب کتاب نہیں دینا ہوگا اپنے ساتھ مجھے ان کی بھی عزت کا خیال ہے اور ان کی عزت کے لیے ہی یہ سب کر رہا ہوں۔''

''پر...... بھائی......''

''مجھے...... مثل حور نہیں چاہیے۔ مجھے زمین کی لڑکی چاہیے اپنے جیسے انسان کے لیے حور کے لیے گلفام بہت ہیں۔'' عارض کا لہجہ اٹل اور انداز فیصلہ کن تھا۔

ردا میں کوئی اور بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا خالی کپ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

''بات کی......'' امی نے کچن میں پکڑ لیا۔

''نہیں...... اُن کا فیصلہ آخری ہے۔''

''کل اُس کے گھر والے تاریخ کے لیے آنا چاہ رہے ہیں دادی آئی ہیں پشاور سے کیا کروں میں۔'' پتنگے لگے ہوئے تھے۔

''ابھی انہیں ٹال دیں، بہانہ بنا دیں۔ یہ کہہ دیں ردا بہت بیمار ہے۔'' مسکرا کر ماں کا ہاتھ تھام کر تسلی آمیز انداز میں کہا۔

''ہائے...... اللہ نہ کرے......'' پھر سر جھٹکا۔

''مجھے عارض کا سمجھ نہیں آرہا۔''

''میں...... آپ کو سمجھا دوں گا آپ فکر مت کریں۔ اور آپ کو کسی کے آگے جواب نہیں دینا ہوگا۔'' عارض کسی کام سے آیا تھا۔ فکر پریشانی والا انداز دیکھ کر رُک گیا۔

ناراضگی سے منہ پھیر لیا۔

''کوئی بہانہ کرکے انکار کر دیں کل کا آنا ملتوی ہو جائے گا۔ باقی میں دیکھ لوں گا۔''

دھیرے سے اُن کا ہاتھ دبا کر ماتھا چوم کر باہر نکل گیا۔ فاطمہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''مگر...... انکار...... عارض کا انکار ہضم نہیں ہو رہا تھا۔'' ردا نے فاطمہ کا ہاتھ تھام لیا۔

پریشان نہ ہو۔

مگر وہ پریشان کیسے نہ ہوتیں عزت کا معاملہ تھا۔ لڑکی والوں کی عزت بھی معمولی بات نہیں ہوتی۔ کیا جواز دیں گی انکار کا اس پریشانی سے ڈپریشن میں مبتلا کر دیا۔

کل کا آنا تو ملتوی ہوگیا۔ مگر آئندہ کا آنا......

انہیں سخت بخار ہوگیا۔

عارض خود انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔

دوا دی سوپ بنا کر بلوایا۔

انہیں ٹائم دیا۔

فاطمہ خوش ہوگئیں انکار نہیں کرنا پڑے گا۔

مگر انکار...... انکار تھا۔

بیٹا اپنی ماں کی خاطر ہی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرلو۔ رانی میں تو گویا اُس کی جان ہے۔

طاہر صاحب نے سمجھایا۔

یا انکار کی معقول وجہ بتاؤ۔

''آر یا پار فیصلہ ہو جائے۔''

''پاپا...... دھیرے سے کہا۔

میں ماما کو سمجھا چکا ہوں مگر اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا۔ مجھے ہم مزاج لڑکی چاہیے ہٹلر ٹائپ نہیں جسے میرا خیال نہ ہو میں کیا کرسکتا ہوں۔''

''ہوں......!''

''پاپا وہ معمولی معمولی باتوں کو ایشو بناتی ہے۔ میری سالگرہ یاد نہیں۔ مجھے بتا کر نہیں گئے، کال نہیں کی۔

میری کالز کیوں کاٹ رہے ہو۔ میرا گفٹ بھول گئے نا...... شاپنگ پر جانا ہے۔ مجھے اگنور کیوں کر رہے ہو۔ وغیرہ وغیرہ......

فاطمہ لیٹے سے اٹھ بیٹھیں۔ ردا سوپ لیے کھڑی تھی۔ پاپا میں بہت مصروف بندہ ہوں مجھے بہت آگے جانا ہے خود نمائی۔

خودستائش مجھے پسند نہیں ہے۔ میں فارغ

نہیں رہتا۔

بزنس مائنڈ ہے میرا، سو کام ہوتے ہیں، میں اُس کی کالز اٹینڈ کروں تو باقی کام کیسے کروں...... اور...... عارض نے گہرا سانس لیا۔

طاہر صاحب بغور اُسے دیکھ رہے تھے۔

حسن کے قصیدے آپ نے ماما کے نہیں پڑھے تو میں کیسے سیکھ سکتا ہوں مجھے آپ لوگوں کی طرح اچھی، زندگی گزارنی ہے، جہاں لڑائی جھگڑا، جنگ و جدل، پوچھ گچھ، لمحوں لمحوں کا حساب نہ ہو۔ پاپا اس سے زندگی دشوار ہوتی ہے۔

''تم اس وقت کہاں ہو۔ یہ وقت سونے کا ہے بھلا، اُف، اُف! بلاوجہ بدگمان رہتی ہے۔''

کتنے چکر ہیں مجھ سے پہلے کتنے تھے اب کتنے ہیں۔ میں سب جانتی ہوں۔ مصروفیت کے بہانے آفس میں کیا گل کھلاتے ہیں۔''

''مجھے ہم سفر چاہیے ہم مزاج ہم آشنا...... استاد نہیں۔''

ازدواجی زندگی کا رشتہ طویل ہوتا ہے ہم آہنگی، اعتبار و اعتماد نہ ہو تو زندگی بے رنگ و بے کیف ہو جاتی ہے۔ اور نہ میں اپنے گھر کا ماحول بدسکون کرنا چاہتا ہوں۔''

بیڈ روم میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ ردا دم بخود بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ گھڑی کی ٹک ٹک فاطمہ دم نا...... کشیدم...... طاہر صاحب کی نگاہ میں توصیف تھی۔

''مجھے شادی کے بعد الگ گھر نہیں بنانا۔ وہ کہتی ہے اسلام آباد میں گھر بنائیں گے۔''

''ماما...... بہو کے ساتھ اور میرے ساتھ رہنا چاہیں گی میں......'' عارض نے نگاہ اُٹھا کر باپ کو دیکھا۔

''میں آپ بننا چاہتا ہوں۔ آسودہ، خوشحال، بااعتماد اور بااعتبار......''

''مجھے آپ جیسا شریکِ سفر چاہیے۔ ملنسار، خوش گفتار بڑے دل والا مہمان نواز...... اور سب کو ساتھ لے کر چلنے والا تاکہ آنے والی نسلیں بااعتبار اور افراد کا پاس لحاظ کرنے والی بنیں۔''

فاطمہ کی آنکھوں سے پانی گرنے لگا۔

''والدین کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ ان کے آگے میں سب کچھ بیچ سکتا ہوں۔ مجھے مجبور نہ کریں۔''

''عارض......'' فاطمہ نے بیٹے کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

عارض اُٹھ کر اُن کے قریب جا کر بیٹھا اور انہیں گلے لگالیا۔

''ماما...... وہ حسن پسند ہے، مادہ پرست ہے گھر بار کی ذمہ داری نہیں اٹھائے گی۔

میں ملازم افورڈ کرسکتا ہوں مگر میری بیوی مجھے سنبھالے۔

آپ کے کام کرے بس اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' ماتھے پر پیار کیا۔

طاہر صاحب کا سر فخر سے بلند ہوگیا۔ ردا نے بھیگی پلکوں کو صاف کیا۔ فاطمہ نے عارض کا ہاتھ چوما۔

جو میرا بچہ چاہے گا وہ ہوگا۔''

''ماما میری کوئی پسند نہیں ہے مگر معیار ہے اخلاقیات کا ترازو ہے پسند آپ کی ہی ہوگی آپ رحمت خالہ کی بیٹی عروسہ کو بہو بنالیں، سلجھی ہوئی سمجھدار، گوہر آبدار حسن و سیرت سے مالا مال......

''تم......! تم اُس سے کب ملے؟'' شکی پن سے دیکھا۔

''میں اُس سے چھ سال پہلے ملا تھا۔ باخدا اب تک دیکھا بھی نہیں ہے۔'' کان پکڑ کر گواہی

دی۔ اُس کے انداز پر سب ہنس دیے۔

''اور آپ انکار کی فکر نہ کریں۔ میں نے کر دیا ہے رابی کو بتا دیا ہے اُس نے اپنا قصور نہیں جانا اور بد دعائیں دینے لگی۔

بجائے معذرت سوری کرنے کے واہی تباہی بکنے لگی۔''

طاہر صاحب فخر سے اپنے دور اندیش بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔

اوائل سفر میں ہی سفر کا راستہ طے ہو جائے سمت کا یقین درست ہو جائے تو سفر سہل اور خوشگوار ہوتا ہے ساتھی ہمقدم ہمراہ ہم مزاج نہ ہو تو..... وقت سے پہلے تھکن غالب آ جاتی ہے۔

''ماما خوب سیرت لوگ خوبصورت ہوتے ہیں۔ خوبصورت لوگ کم ہی خوب سیرت ہوتے ہیں۔'' وہ ماما کو سمجھا رہا تھا۔

فاطمہ کو سمجھ آ گیا تھا اور جب بات سمجھ آ جائے تو انکار آسان ہو جاتا ہے۔

عروسہ کیسی ہے۔ لمحہ بھر کو سوچا عرصہ ہو گیا تھا اُسے دیکھے۔

کیا سوچنے لگیں۔ ماما کا ہاتھ دبایا۔

''آں..... ہاں.....'' مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''کچھ نہیں.....''

''جس فیصلے میں شش و پنج ہو اُس کو زیادہ زیر غور نہیں لاتے آپ کا بیٹا اپنے ساتھ ساتھ آپ کا مستقبل بھی خوشگوار دیکھنا چاہتا ہے۔''

''اکلوتے بیٹے کی طرح اکلوتی بہو کو بھی شاندار ہونا چاہیے۔''

''انشاء اللہ.....'' اُس کے بال سنوارے۔

تبھی فون بجا۔

طاہر صاحب نے سیل اٹھایا۔ رابی کے گھر سے ہے سب الرٹ ہو گئے۔

انہوں نے سہولت بھرے انداز سے اگلے کی بات سنی اور سکون سے کہہ دیا۔

''حامد صاحب بات آپ کی ٹھیک ہے لڑکے لڑکی کی مرضی نہیں ہے تو کیا فائدہ قدم آگے بڑھانے کا..... سفر اِدھر ہی ختم کر دیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ دونوں خاندانوں کی زندگی اجیرن ہو۔

''ٹھیک ہے.....'' لمحہ بھر کو رُک کر اگلی بات سنی۔ اور خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ عارض نے سر جھکا لیا۔

''تم نے اپنی مرضی دیکھ لی جس چیز میں میرے بیٹے کی خوشی ہو گی میں وہ کروں گا۔''

''اور جس چیز میں میرے والدین کی خوشی ہو گی میں اُس کو انجام دوں گا۔''

''بالکل!''

''ماما..... ناراض تو نہیں۔''

''نہیں..... میں تم سے ناراض نہیں جانتی ہوں میرا بیٹا بہت عقلمند ہے۔''

''ماما..... دولت سے گھر بھرتے ہیں دل نہیں..... اور دولت ہمارے پاس بہت ہے ہمیں سکون دل و ایمان کی دولت بڑھانی ہے۔''

''بالکل.....'' سب نے خوشی سے کہا اور مسکرا دیے۔

فاطمہ عروسہ کی شکل ذہن میں لا رہی تھیں۔ مگر یاد نہیں آ رہی تھی۔ بہت سال پہلے دیکھا تھا۔

''کل ہی عروسہ کے گھر چلتے ہیں۔'' طاہر صاحب نے کہا۔

''بالکل.....'' فاطمہ نے تائید کی۔

عارض ماں باپ کے مطمئن چہرے دیکھ کر طمانیت سے مسکرا دیا۔

☆☆.....☆☆

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

افسانہ

غزالہ جلیل راؤ

مڑ کے جو دیکھا

"تم نے پہلے پیار کا یقین دلایا اور جب میری آنکھوں میں تمہارے دکھائے گئے خوابوں کا رنگ گہرا ہو گیا تو اب میری محبت تمہیں پانے کی آرزو تمہارے نزدیک جذباتی پن ہے۔ یہ محبت کا کون سا رنگ ہے تابش عزیز۔ تم نے ہی خوشی سے......

وہ رو رہی تھی اس کے سامنے، مگر وہ اپنی ہی مجبوری بیان کر رہا تھا۔

"دیکھو چندا! تم میرے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں ابھی گھر والوں کو نہیں بھیج سکتا۔ میرا بڑا بھائی اور بڑی بہن گھر بیٹھی ہیں۔ جب تک ان کی کہیں شادی نہیں ہو جاتی میں اپنی بات نہیں کر سکتا۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"لیکن میں ابھی شادی کرنے کے لیے کب کہہ رہی ہوں۔ اپنے گھر والوں کو بھیج دو تاکہ بات طے ہو جائے۔ شادی بہن، بھائی کی شادی کے بعد ہو جائے گی۔" آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے جیسے برسات کا آغاز ہو گیا ہو۔

"چندا میری جان رویا مت کرو۔ تمہاری آنکھیں روتی ہیں تو تابش عزیز

کا دل روتا ہے۔ اس نے محبتوں سے پُور لہجے میں کہا اور اپنی انگلیوں کے پوروں سے اس کے گالوں پر سے آنسو چننے لگا۔

"اگر دکھ ہوتا ہے تو اتنا رلاؤ نہیں، تم اصل میں مجھے چاہتے ہی نہیں ہو۔ جن کو چاہا جاتا ہے نا ان کے چھن جانے کا تصور بھی اُداس کر دیتا ہے۔ تابش عزیز، اور میں تمہیں بار بار تاکید کر رہی ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنے گھر والوں کو بھیج دو۔ میں نے لاڈلی ہونے کی وجہ سے بہت غلط فائدہ اٹھالیا ہے اب تک۔ کبھی پیار سے کبھی روکر اور کبھی غصے سے نہ کرتی رہی تھی۔ مگر اب میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ امی ابو سیریس ہو رہے ہیں میرے معاملے میں، مجھے یقین ہے جس دن کوئی ایسا رشتہ آیا جوان کے دل کو بھا گیا تو میرا انکار، میری ضد دھری کی دھری رہ جائے گی۔ پھر میں کیا کروں گی اس وقت۔"

"تم انکار کر دینا چندا۔" اس نے اتنی طویل بات کا مختصر سا جواب دیا۔

"تو میں اب تک کیا کر رہی ہوں۔ انکار ہی تو کر رہی ہوں۔" چندا نے زچ ہو کر کہا۔

اس کے چہرے پر اُلجھن تھی، پریشانی تھی، دکھ تھا۔

"تم چاہتی کیا ہو؟" تابش عزیز نے چڑ کر کہا۔ تابش عزیز کا اکھڑا اکھڑا اور اجنبی سا لہجہ چندا کے دل میں خنجر کی طرح پیوست ہو گیا۔ لیکن وہ اپنے دکھ کو چھپا گئی۔ اور اس کو سمجھانے کی غرض سے اپنی بات کو ایک بار پھر دہرانے لگی۔

"تم اپنے گھر والوں کو بھیج دو کسی طرح، پھر ساری بات مجھ پر چھوڑ دینا۔ منگنی کے بعد جتنا عرصہ تم کہو گے میں آسانی سے انتظار کر لوں گی۔ میرے ممی پاپا میری کوئی بات رد نہیں کرتے۔"

"لیکن چندا میں ابھی گھر والوں سے بات کرنے کی پوزیشن میں بالکل بھی نہیں ہوں۔ میں اپنے رشتے کی بات کروں گا تو گھر میں ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ کوئی بھی میری بات نہیں مانے گا۔ تم تھوڑا سا صبر کر لو۔ میری بہن کی منگنی کا مسئلہ حل ہو جائے تو پھر ساری پریشانی ختم ہو جائے گی۔" تابش عزیز نے اُسے سمجھانا چاہا۔

"تابش عزیز تمہیں اپنی بہن کی فکر ہے تو میں بھی کسی کی بہن، بیٹی ہوں میری فکر کسی کو نہیں ہو سکتی کیا؟ تمہاری تو ایک بہن اور بھائی ہے لیکن ہم تو چار بہنیں ہیں۔ میرا رشتہ طے ہوگا تو میری چھوٹی بہنوں کا بھی ہوگا۔ ان کے لیے بھی پرپوزلز آنے شروع ہو گئے ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو میں اپنی بہنوں کا مستقبل خراب کر دوں۔ میں ان کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بنی رہوں۔" چندا سسکنے لگی۔

"تم جذباتی ہو رہی ہو چندا ریلیکس پلیز!" اس نے چندا کا ہاتھ تھپتھپایا تو چندا نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔ جیسے اس کے وجود میں برقی رو دوڑ گئی ہو۔

"میرے آنسو، میری محبت، میری بے قراری تمہارے نزدیک میرا جذباتی پن ہے۔ یہی امید کی جا سکتی ہے تم سے۔" چندا کا لہجہ تیز تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ حیرانی تھی۔

"دیکھو تابش عزیز میرے دل میں محبت کی آگ تم نے ہی لگائی ہے۔" چندا رو پڑی۔

"تم نے پہلے پیار کا یقین دلایا اور جب میری آنکھوں میں تمہارے دکھائے گئے خوابوں کا رنگ گہرا ہو گیا تو اب میری محبت تمہیں پانے کی آرزو تمہارے نزدیک جذباتی پن ہے۔ یہ محبت کا

کون سا رنگ ہے تابش عزیز۔ تم نے ہی خوشی سے آشنا کیا تھا اور اب تم ہی دکھ دینا چاہتے ہو۔ تم نے ہی بے اختیاری لگائی اور اب تم ہی لاتعلق بن رہے ہو۔ تمہارے لیے ہی روتی ہوں اور تمہیں ہی احساس نہیں۔ تم نے ہی پہلے یقین دلایا کہ تم صرف اور صرف میرے ہو۔ اور اب جب میں تمہارے علاوہ کسی کا تصور بھی نہیں کرسکتی تو تم راستہ بدلنا چاہتے ہو۔'' چندا کا لہجہ کھودینے کی اذیت سے ہارا ہوا تھا۔

''کون کافر راستہ بدلنا چاہتا ہے۔'' تابش عزیز تلملا اٹھا۔

''تم راستہ بدلنا چاہتے ہو تابش عزیز تم، تمہارا مقصد صرف مجھ سے دوستی کرنا تھا۔ چلو کچھ اچھا وقت گزر جائے گا۔ تم مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنا نہیں چاہتے۔'' چندا نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا اور پھر اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

تابش عزیز نے اس رونے سے نہیں روکا اور جب اس کی سسکیاں خود بخود تھم گئیں تو وہ گویا ہوا۔

''چندا، تابش عزیز یہ تمہارا اعتماد، اعتبار بھروسہ ہی اس کی زندگی ہے۔ مجھ سے کبھی بدگمان نہ ہونا، ورنہ جینا بہت مشکل ہو جائے گا۔''

چندا خاموش رہی، وہ بولتے بولتے تھک گئی تھی یا الفاظ اس کی زبان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یا اس کے پاس کچھ بولنے کے لیے رہا ہی نہیں تھا۔ وہ بھی شاید اب مزید ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا میں اب اجازت چاہتا ہوں۔''

چندا نے ہمیشہ کی طرح اُسے جاتے ہوئے روکا اور نہ ہی دوبارہ ملنے کا وعدہ لیا۔ بس خاموش بیٹھی اسے تکتی رہی۔

''خدا حافظ بھی نہیں کہو گی؟'' اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''اللہ حافظ۔'' چندا نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا تو وہ بھی خدا حافظ کہتا ہوا چلا گیا۔

''کیا کہہ رہا تھا تابش عزیز، تمہارا رانجھا۔'' فاریہ تابش عزیز کو گیٹ تک چھوڑ کے ڈرائنگ روم میں آئی اور داخل ہوتے ہی چندا سے پوچھا۔ جواب میں اس کی ٹھنڈی سانس ابھری۔

فاریہ نے بغور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ وہ بہت زیادہ روئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے جیسے روئی کے پھائے کے رکھے ہوں۔ جھکی ہوئی پلکوں کے تلے نین کٹوروں میں ابھی بھی پانی بھرا ہوا تھا۔ فاریہ جانتی تھی اگر اس نے چندا سے کچھ پوچھا تو وہ اتنی شدت سے روئے گی کہ اسے چپ کروانا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن وہ مانا یا نہیں یہ جاننا بھی تو از حد ضروری تھا۔

''ارے چائے تو ٹھنڈی ہو گئی تمہاری۔ یقیناً تم نے کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔'' فاریہ نے چائے کی ٹرالی میں رکھی چیزوں کا جائزہ لیا۔

''میں اچھی سی چائے بنا کر لاتی ہوں۔ پھر بیٹھ کر تسلی سے بات کریں گے۔'' وہ کہتی ہوئی باہر چلی گئی اور کچھ دیر بعد وہ چائے لے کر آ گئی۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا چائے پینے کو۔'' چندا نے انکار کر دیا۔

''تم چائے پی لو چندا...... یقیناً تمہارے سر میں درد ہوگا چائے پینے سے درد میں کمی محسوس کرو گی۔ تو سکون مل جائے گا۔ فریش ہو جاؤ گی۔ اگر

یہی اترا ہوا بھیگا سوجھا چہرہ گھر لے کر جاؤ گی تو تمہاری امی کو علم ہو جائے گا۔ تم رو کر آئی ہو، وہ پریشان ہو جائیں گی اور سمجھیں گی میرے ساتھ تمہاری لڑائی ہو گئی ہے۔'' چندا نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا اور خاموشی کے ساتھ چائے کی چسکیاں لینے لگی۔

''کیا کہا تابش عزیز نے، کب بھیج رہا ہے اپنے والدین کو؟'' اسے خاموشی سے چائے پیتے دیکھ کر فاریہ نے پوچھا۔

''وہی ڈھاک کے تین پات، ابھی اس پوزیشن میں نہیں کہ ان کو بھیج سکوں۔'' چندا نے بھیگے بھیگے لہجے میں آہستہ سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ جو حقیقت تم نے اسے بتائی ہے اسے فوری طور پر گھر والوں کو بھیج دینا چاہیے۔ اگر وہ بھی یہی چاہتا ہے تو، اپنے جذبوں میں سچا ہے۔ تو گھر والوں کو بھیجے۔ یہ صرف ٹالنے والی بات ہے۔ بات یہ ہے چندا، محبت میں اعتماد بھی کرتے ہیں اور صبر بھی۔ لیکن ایک حد تک، کوئی بھی چیز جو حد کراس کر جائے تو پھر انجام اچھا نہیں ہوتا۔ چار سال ہو گئے ہیں اسے تمہارے ساتھ عشق و محبت کا کھیل کھیلتے ہوئے۔ ابھی وہ کہتا ہے کہ اس پوزیشن میں نہیں، اگر ہمت نہیں تھی تو محبت کیوں کی تھی؟ یا پھر گھر والوں کی اجازت اور رضا مندی سے عشق بگھارتا تم سے، اور جنہوں نے اپنی محبت کو اپنی زندگی بنانا ہوتا ہے۔ تو وہ ہر حد سے گزر جاتے ہیں چار سال تو کیا چار دن جبکہ لمحوں میں معاملات طے کر لیتے ہیں۔ نہ صرف گھر والوں کو منا لیتے ہیں اور بھیج بھی دیتے ہیں۔

''کیا تم اس فریبی شخص کا انتظار کر سکتی ہو؟''

''میں کیا کروں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ساتھ چھوڑ گئی ہیں۔'' آنسو چندا کے گالوں پر رقص کرنے لگے تھے۔

''اگر رونا دھونا بند کرو گی تو کچھ سمجھ میں آئے گا۔ روؤ مت کرو پلیز اتنا رو رو کر بینائی کمزور ہو جائے گی۔ رونے سے کوئی فائدہ حاصل ہو تو رونے میں کوئی حرج نہیں۔'' فاریہ نے اسے ڈانٹا۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آنسو صاف کیے اور چل دی۔

''اچھا فاریہ اب میں چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنا بیگ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

فاریہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہی۔

وہ دیر تک بستر پر لیٹی رہی۔ بھائی اور ابو آفس جا چکے تھے۔

جاسیہ اور فہیم کالج آمنہ اور فروا اسکول چلے گئے تھے۔ امی اور بھابی گھر کے کاموں میں مصروف، چندا جانتی تھی کہ گھر کی صفائی ستھرائی اسے ہی کرنی ہے۔ لیکن وہ پھر بھی کسلمندی سے لیٹی رہی۔ اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ اُٹھ کر باہر جائے۔ وہ لیٹی ہوئی تابش عزیز کے متعلق سوچتی رہی اور ایسا پہلی مرتبہ تھوڑا ہی ہوا تھا۔

جب سے تابش عزیز اس کی زندگی میں آیا تھا۔ اس کی دھڑکنوں میں دھڑکن بن کر دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اپنی ذمہ داریاں، اپنے فرائض سے پہلو تہی کرنے لگی تھی۔ بڑی بیٹی کی ہونے کی حیثیت سے اس کی کچھ ذمہ داریاں کچھ فرائض تھے مگر وہ بھولتی چلی گئی۔ یاد رہا تو صرف تابش عزیز۔

سہیلیوں سے بھی رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ انہیں شکوہ تھا کہ تم تو ہمیں بھول گئی ہو۔

عزیز واقارب کے لیے وہ عید کا چاند بن کر رہ گئی تھی۔ وہ کرتی بھی کیا۔ اس کا دل ہی نہیں چاہتا تھا کسی سے ملنے کو۔ اس کے سارے دھیان تو تابش کی طرف لگے رہتے تھے اور جب سب کے اصرار پر وہ اپنی دوستوں یا خاندان میں کسی سے ملنے کا پروگرام بناتی۔ یا امی جانے کو کہتیں اتفاق سے اسے اس دن تابش عزیز سے ملنا ہوتا تھا۔

اور گھر میں بھی اسی وقت سب کو کوئی نہ کوئی کام یاد آتا جب وہ تابش عزیز سے بات کررہی ہوتی۔ اس صورت میں تابش کو کہتی کہ آپ ہولڈ کریں یا بعد میں بات کرتے ہیں تو وہ ناراض ہوجاتا تو کہتا۔

''تم اپنی من مانیاں کرو جب فرصت ہو تو بات کرلینا یا ضروری بھی نہیں ہے۔'' اس کے بعد فون بند کردیتا۔

وہ اس کو مناتی رہ جاتی مگر وہ مانتا ہی نہیں۔ وہ خوب اس کی منت سماجت کرتی۔ ڈھیروں SMS کرتی۔ تب جاکر وہ راضی ہوتا۔ اب اکثر وہ اس دوران میں کوئی کام ہوتا تو وہ جاسیہ کو کہتی کہ وہ کام کردے۔ پھر وہ اسے کہتی۔

''تم ناراض نہ ہوا کرو تابش پلیز، یوں ہی ذرا سی بات پر خفا ہوجاتے ہو اور پھر مانتے بھی نہیں ہو۔ تمہیں منانے کے لیے دو دو دل گردے ہونے چاہئیں۔ یہ تو میری ہمت ہے کہ تمہیں منالیتی ہوں مگر کتنی مشکل سے یہ میں جانتی ہوں۔''

تابش ہنس کر کہتا۔ تو پھر تم میری بات کیوں نہیں مانتی ہو۔ جب کہتا ہوں کہ کال چلنے دو ہولڈ کرکے تم اپنا کام کرلو۔ مگر تم سنتی نہیں ہو۔ اپنی من مانیاں کرتی ہو۔ اور مجھے اچھا نہیں لگتا کہ جب ہم بات کریں تو کوئی ڈسٹربنس نہیں۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے مگر کام تو کسی وقت بھی کوئی پڑ سکتا ہے۔ اور پھر تم ہولڈ بھی نہیں کرنے دیتے ہو۔'' وہ لاڈ سے کہتی۔

''تو تم کون سا مان جاتی ہو میری بات، وہ ہی کرتی ہو جو تمہارا دل کرتا ہے۔''

''مجبوری ہے۔'' وہ ہنس پڑتی۔ جب تمہارے پاس آجاؤں گی تو سب کام ختم ہو جائیں گے۔ بس پھر ہم دونوں ہوں گے اور ہمارا پیار، تب ہمیں کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں ہوگا۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہتا۔

''پتا نہیں کب آئے گا وہ وقت......''

''جب تم چاہو گے......؟''

''میرا بس چلے تو ایک لمحہ بھی ضائع نہ کروں۔ بس کچھ مجبوریاں ہیں۔ کچھ وقت لگے گا سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم تھوڑا انتظار کرلو۔''

''انتظار...... انتظار...... کب ختم ہوگا یہ انتظار......''

''تم سب جانتی ہو۔''

''میں تو آخری سانس تک انتظار کرسکتی ہوں مگر میری بھی تو کچھ مجبوریاں ہیں۔''

''چندا...... سب ٹھیک ہوجائے گا تم پریشان نہ ہو۔ بس جیسے بھی ہو کچھ وقت اور گزارلو۔ وہ وقت دور نہیں جب ہم ایک ہوجائیں گے۔''

وہ ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش رہ جاتی۔ تابش عزیز سے بات کرنے کے لیے اسے کتنے بہانے بنانے پڑتے تھے وہ ہی جانتی تھی۔ کبھی کسی دوست کا نام لیتی کبھی کسی دوست کا کہ اس سے بات کررہی ہے۔ مگر وہ شاید اس کی مجبوری کو سمجھتا ہی نہیں تھا یا پھر اسے تنگ کرنے کے لیے کرتا تھا ایسا۔

یا پھر جب وہ اس کی باتوں میں کھوئی ہوتی تو

بھابی بھتیجے کو اس کی گود میں ڈال جاتیں کہ اسے سنبھالو۔ اور اس کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور دل الگ ٹھکانے پر نہیں ہوتا تھا اس وقت۔

کچھ دیر بعد ہی وہ بھتیجے کو بھابی کی طرف بڑھا دیتی۔

''یہ چپ نہیں ہو رہا۔ سنبھالیں اپنے سپوت کو۔''

تابش عزیز سے اسے محبت ہوئی تو وہ سب کچھ بھولتی چلی گئی۔ دن، مہینے، سال، اسے یاد تھا تو صرف تابش عزیز کا نام۔ اس سے کس دن ملنا ہے۔ کس وقت فون پر بات ہونی ہے۔ کس رنگ کن کپڑوں میں وہ اچھا لگتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے کچھ یاد نہیں تھا۔

تابش عزیز اس کی آرزو اس کی خواہش، اس کی آنکھوں کا خواب تھا۔ بس اسے اس خواب کی تعبیر پانے کی خواہش تھی۔ وہ اس کی محبت میں ڈوبتی چلی گئی۔ وہ وقتاً فوقتاً اسے گھر والوں کو بھیجنے کے لیے کہتی رہتی۔ وہ بڑی محبت سے چندا کو جواب دیتا۔

''جان...... تمہیں پانا میری اولین خواہش ہے۔ میری بہن کا مسئلہ ہے۔ بس وہ حل ہوتے ہی گھر والوں کو بھیج دوں گا۔ تم کیوں فکر کرتی ہو چندا۔''

ہر گزرتا دن جذبوں میں نئی شدتیں لے کر بیدار ہوتا۔ اور ہر رات آنکھوں تابش کے خواب لیے اترتی اور وہ اس کے خوابوں میں کھوئی رہتی۔ جیسے ہی وہ گریجویشن سے فارغ ہوئی اس کے رشتے آنے شروع ہو گئے۔ شاید گھر والوں کے معیار پر ابھی کوئی رشتہ پورا نہیں اترا تھا یا واقعی ہی اس کے انکار پر گھر والوں نے اسے زیادہ پریشان نہیں کیا تھا اور اب اسے ماسٹر کیے ہوئے بھی ایک سال ہو گیا تھا۔ جاسیہ جو بی اے کر چکی تھی۔ اس کے بھی رشتے آنے شروع ہو گئے تھے۔ تب اسے پتا چلا کہ امی ابو جلد ہی اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔

اور اس روز پہلی مرتبہ وہ تابش عزیز کے سامنے روئی تھی۔ اور رو رو کر اس نے آنکھیں سوجھالی تھیں۔

''تابش تم اپنے والدین کو جلد بھیج دو۔ ورنہ کچھ غلط ہو جائے گا۔ امی ابو آج کل اسی میں لگے ہیں۔ وہ جلد ہی کوئی فیصلہ کر لیں گے پھر کچھ نہیں بچے گا۔ پلیز کچھ سوچو......'' لیکن تابش عزیز پر جیسے اس کے رونے کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے اپنی مجبوریاں بیان کرنی شروع کر دیں۔

اور آج ایک ماہ ہو گیا تھا۔ چندا ہر طرح سے اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ گھر والوں کو بھیج دے۔ رو کر، پیار سے، غصے سے، ناراضگی سے یہاں تک کہ اس کی دوست فاریہ نے بھی حالات کی نزاکت کا احساس دلایا لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔

لیکن چندا کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کوئی خاص مجبوری نہیں ہے۔ بس وہ اسے ٹال رہا ہے بس اس دن سے چندا کی آنکھوں سے آنسو خشک نہ ہوئے۔ فاریہ اسے سمجھاتی تسلی دیتی۔ لیکن اس کے دل کو چین و قرار نہیں تھا۔

وہ ابھی تک کمرے سے باہر نہ آئی تھی۔ امی پریشان سی کمرے میں داخل ہوئیں کہ وہ ابھی تک اٹھی کیوں نہیں، اسے لیٹا دیکھ کر فکر مندی سے بولیں۔

''چندا، بیٹا ابھی تک اٹھی نہیں ہو خیر تو ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''جی ٹھیک ہوں امی جان، بس یونہی اٹھنے کو

دل نہیں چاہا۔ ابھی اٹھتی ہوں۔'' اس نے امی کو مطمئن کر کے کمرے سے بھیج دیا۔

ان معصوم سادہ لوح ماؤں کو کیا خبر کہ ان کی لاڈلی بیٹیاں کبھی کبھی اپنے دلوں کو ایسا روگ لگا لیتی ہیں کہ ان سے جان چھٹتی ہے نہ روح۔ اور ماؤں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

نجانے چندا کی آنکھیں کیوں بھیگ گئیں۔

''میں چندا ارسلان، والدین، بہن بھائیوں کی لاڈلی خاندان بھر میں سلجھی ہوئی لڑکی، خوب صورت ذہین...... ایک شخص کے لیے اتنا گر گئی۔ اس کے لیے اتنی ارزاں ہو گئی کہ وہ اپنے قدموں کی جوتی سمجھ بیٹھا۔ میں نے اس شخص کی محبت کی خاطر کیوں اپنا وقار ختم کر لیا کہ اس کی نگاہوں میں کوئی حیثیت نہیں رہی میری؟''

بہت سارے دن گزر گئے چندا کو اس کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے اور قائل کرتے ہوئے۔ آج چندا کو رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے رونا، منتیں، سماجت کرتے ہوئے، اب اسے برا محسوس ہو رہا تھا۔

''اگر میں اس کی طلب ہوں، وہ بھی میری خواہش رکھتا ہے۔ میری تمنا ہے تو اسے بھی میرے چھن جانے کا دھڑکا لگنا چاہیے اسے بھی میرے کھو جانے کا احساس ہونا چاہیے۔ مگر اسے احساس ہی نہیں تھا۔ اس کا ذہن مسلسل سوچوں میں گم تھا۔

''میں چندا، ارسلان جو ایک عزت دار باپ کی بیٹی، غیرت مند بھائیوں کی بہن ہوں۔ ایک شخص کی محبت میں کتنی مجبور ہو گئی ہوں۔ روتی ہوں، گڑگڑاتی ہوں، تڑپتی ہوں اس کے سامنے، رو رو کر اپنی محبت کی بھیک مانگتی ہوں۔ اپنی اَنا کو مار کے، اپنا وقار ختم کر کے، صرف اس ایک شخص کی محبت کی خاطر، اسے پا لینے کی خواہش، اس کے لمس کے حصول کے لیے...... سب کچھ بھول گئی اپنی عزت اپنا وقار، اپنی حیثیت کچھ بھی تو کسی بات کا بھی تو خیال نہیں رہا۔ سب کچھ تو داؤ پر لگا دیا۔ کسی ایک بات کا بھی تو خیال نہیں کیا۔ لیکن کیا یہ کسی شریف خاندان کی شریف لڑکی کو یہ سب زیب دیتا ہے۔ اُس کا ذہن گیلی لکڑیوں کی طرح سلگ رہا تھا۔

جو لوگ محبتیں پانے میں اپنی اَنا برقرار رکھتے ہیں وہ پھر تمام عمر کے لیے اپنی محبت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ گنوا دیتے ہیں۔

''لیکن میں، میں نے تابش کو پانے کے لیے اپنے بیچ اپنی محبت میں اِنا نہیں آنے دی۔

مگر پھر بھی...... پھر بھی...... تابش کا ملنا بہت مشکل ہو رہا ہے۔'' اس سوچ نے اس باقی سوچوں کو رد کر دیا۔

''اگر...... اور یہ بات تو نہیں کہ تابش عزیز مخلص ہی نہ ہو۔'' ایک ٹھنڈی سانس اس کے لبوں سے آزاد ہوئی۔

چندا کو اس بات کا پکا یقین ہو گیا تھا کہ تابش عزیز اس کے حصول کے لیے وہ تڑپ نہیں رکھتا جو چندا کے دل میں ہے۔ وہ سمجھ دار تھی۔ وہ اس کا گریز سمجھ رہی تھی۔ اس حقیقت کو سمجھ رہی تھی۔

اسے آج شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا۔

''مجھ جیسی لڑکیاں ہی ایسے لڑکوں پر اعتبار کر کے ان کی لچھے دار باتوں کو محبت سمجھ کر، محبت کا جواب محبت سے دے کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرتی ہیں۔ اپنی بے وقوفی کا ثبوت دیتی ہیں۔ انجانے میں اپنے لیے خاردار رستہ چن لیتی ہیں۔ اور پھر اس رستے پر چلتے ہوئے خود کو لہولہان

کرلیتی ہیں۔ مجھ جیسی معصوم لڑکیاں جب لڑکوں کی محبت پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آتی ہیں تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی میں سوائے اس شخص کے حصول کے کوئی اور خوشی نہیں۔ اسی محبت، اسی خوشی، سرشاری میں وہ آگے بڑھتی جاتی ہیں۔ اور ...... میری طرح کسی کو بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں اور آنسو اس کے گالوں پر ڈھلکتے آ رہے تھے۔

اور یہ رنگین مزاج لڑکے، پیار بھرا انداز، لہجہ میٹھی میٹھی خوشبو جیسی دل موہ لینے والی باتیں کر کے، اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے جھوٹی محبت کی قسمیں کھا کر مستقبل کے سہانے خواب دکھاتے ہیں اور جب ان خوابوں کی تعبیر کا وقت قریب آتا ہے تو وہ ٹال مٹول کر کے اپنا دامن بچالیتے ہیں۔ جیسے تابش عزیز، مجبوریوں کی داستان سنا کر خود مجبوری کا پیکر بن جاتے ہیں۔

''میری بہنوں کی ذمہ داری سر پر ہے۔ جب تک ان سے فارغ نہیں ہوجاتا یہ ممکن نہیں۔''

یا پھر...... ''ابھی بے روزگار ہوں۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں چند سال درکار ہیں۔ تم انتظار کرسکتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''جان میں نے کوشش کی تھی مگر گھر والے نہیں مانتے۔ میری شادی ماموں زاد سے کرنا چاہتے ہیں۔ اور ممی نے دودھ نہ بخشنے کی قسم کھالی ہے۔ میں بہت مجبور ہوں۔ کچھ نہیں کرسکتا۔''

یا یہ کہ ''ہمارے خاندان سے باہر شادیاں نہیں کی جاتیں۔ بہت مجبور ہوں۔''

''میری منگنی کردی گئی ہے اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر میں انکار کرتا ہوں تو مجھے عاق کردیا جائے گا اور تمہارے گھر والے ایک بے روزگار لڑکے سے کبھی شادی کرنے پر تیار نہیں ہوں گے۔''

یہ ساری باتیں اس وقت ان کو یاد نہیں ہوتیں جب وہ عشق بگھارتے ہیں۔ محبت کے ڈرامے رچاتے ہیں۔ وقت گزاری کے لیے محبت کا کھیل رچا کر سفید جھنڈی دکھا کر کسی اور لڑکی کو اپنے جال میں پھنسانے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ یہ ہوتی ہے ان لڑکوں کی حقیقت...... اور اس میں سارا قصور ان لڑکوں کا ہی نہیں ہوتا بلکہ لڑکیاں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ ان کی جھوٹی باتوں پر ایمان لے آتی ہیں اور آنکھیں بند کر کے یقین کرلیتی ہیں۔ اور جھوٹی محبت کی انگلی تھام کر اس طرف چل پڑتی ہیں جس کے سارے رستے تباہی کی طرف جاتے ہیں۔

جب چند روز گزر گئے اور چندا نے فاریہ کو فون کیا نہ اس کو بلایا اور نہ ہی خود اس کی طرف گئی تو فاریہ کو بہت حیرت ہوئی تو وہ خود ہی چندا کی طرف چلی آئی۔ چندا اسے سامنے صحن میں ہی بیٹھی مل گئی۔

''کیسی ہو چندا؟'' فاریہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تمہارے سامنے ہوں۔'' چندا نے جواب دیا۔

چندا کو فاریہ بہت پسند تھی۔ چندا کے دکھ سکھ کی ساتھی بڑے اچھی یادگار دن چندا کے ذہن میں محفوظ تھے۔ جب گھنٹوں فاریہ کے ساتھ تابش کی باتیں کیا کرتی۔

نیا نیا معاملہ تھا اور آغاز محبت کے دن تابش عزیز کی ہر بات، اپنے دل کی ہر کیفیت فاریہ کو بتایا کرتی اور فاریہ بھی ایک مخلص دوست کی

حیثیت سے اس کی باتوں میں بھرپور دلچسپی لیتی تھی۔

''گھر میں کوئی نہیں ہے کیا؟'' فاریہ نے گھر میں مکمل خاموشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں امی بازار گئی ہیں اور بھابی اپنے میکے......''

''تم اتنی خاموش کیوں ہو۔ تابش عزیز سے بات ہوئی کیا؟''

''نہیں......''

''تم نے بھی نہیں کیا؟''

''میں اسے فون کر کے کیا کہوں فاریہ۔ مجھے تو اس کی محبت پر شک ہو رہا ہے۔ میرا دل کہتا ہے تابش کی محبت میں وہ لگن، وہ جذبے، وہ سچائی نہیں جو کسی کو پالینے کے لیے ہوتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے اس کے دل میں کھوٹ ہے۔''

''چندا ایسا بھی تو ہو سکتا ہے ایسا کچھ بھی نہ ہو جیسا تم سوچ رہی ہو۔ وہ واقعی ہی اپنی محبت میں سچا ہو۔ اور وہ سچ ہی کہہ رہا ہو کہ وہ مجبور ہے۔ اور تم اس کی وفا اس کی محبت پر شک کر کے اسے کھو دو۔ اور پھر ساری عمر اسی پچھتاوے میں روتی رہو۔'' فاریہ کی زبان پر دل کے خدشے آ گئے۔

''میں نہیں مانتی فاریہ، کوئی بھی مجبوری سچی محبت کرنے والوں کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ جو مجبوری وہ بتا رہا ہے وہ اتنی بڑی مجبوری نہیں۔ اگر وہ چاہے تو گھر والوں کو منانے کے ہزاروں طریقے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ خود ہی سیریس نہ ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے۔ اور میں کیا کروں۔''

''پھر کیا سوچا ہے تم نے؟''

''اب میں مزید اس کے ہاتھوں کھلونا نہیں بن سکتی فاریہ۔ اگر وہ اپنے جذبوں میں سچا ہے تو اسے اپنی سچائی ثابت کرنی ہوگی۔ اپنے گھر والوں کو بھیجنا ہوگا۔ نہیں تو میں اس سے قطع تعلق کر لوں گی۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا پھر......''

''رہ لو گی اس کے بنا، بھول جاؤ گی اسے، اپنے دل کو سمجھا لو گی؟''

میں اتنی اس کی عادی ہو گئی ہوں۔ اتنی شدت سے اسے چاہا ہے۔ نہیں جانتی میں کیسے ایسے بھول سکوں گی۔ لیکن یہ بھی تو نہیں چاہتی کہ اس کے ہاتھوں کھلونا بنی رہوں اور مجھے بے وقوف بناتا رہے۔ میں سب کچھ بھول کر اس کے اشاروں پر چلتی رہوں۔'' اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور آنسو چہرے کو دھونے لگے جیسے......

اس شام وہ میگزین ہاتھ میں لیے اس کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ مگر ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ تب سیل پر بیل ہوئی۔ تابش عزیز کی کال تھی۔ اس کی دھڑکنیں منتشر ہو گئیں۔

''جی بولیے......'' چندا نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہ تم کہہ رہی ہو چندا......تم......تم جانتی ہو تابش عزیز تم سے بات کیے بنا نہیں رہ سکتا۔'' ہمیشہ کی طرح اس پیار بھرے شدتوں سے چور لہجے میں کہا۔

''گھر والوں کو کب بھیج رہے ہو؟'' چندا کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''ایک تو میں تمہاری اس رٹ سے تنگ آ چکا ہوں۔ تمہیں میری ایک دفعہ کی کہی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کہا نا یہ سب ابھی ممکن نہیں ہے۔'' تابش عزیز نے سخت مگر اپنے مخصوص نرم اور پیار بھرے انداز میں کہا۔

''اگر تم مجھے پانا چاہتے ہو، اپنی خواہش کی تکمیل کرنا چاہتے ہو تو اپنے گھر والوں کو بھیج دو۔ جتنی جلد ممکن ہو، ورنہ پھر مجھے کوئی دوش مت دینا۔''

''کیا مطلب چندا......؟'' اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ تم تو کہا کرتے تھے تابش عزیز کہ چندا تم کہو تو میں تمہاری خاطر آسمان سے تارے توڑ لاؤں اور اب میں تمہیں کہتی ہوں کہ گھر والوں کو بھیج دو اور تم کہتے ہو کہ میں مجبور ہوں۔ میرے بس کچھ نہیں ہے۔ یہ کیسی محبت کر رہے ہو تم تابش عزیز۔ محبت تو انسان کو بہادر بنا دیتی ہے۔ انسان بڑے بڑے امتحانوں سے گزر جاتا ہے۔ بڑی سے بڑی دشواریوں کا سامنا کرتا ہے اور تم کہتے ہو میں نے گھر میں بات کی تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ اگر تم ان جھگڑوں سے یونہی ڈرتے رہے تو تم کبھی بات نہیں کر سکو گے۔ تابش عزیز تم گھر میں بات کرو، اگر نہیں تو مجھ سے......سب رابطے ختم کر لو۔ ہر تعلق توڑ لو، آج ہی فیصلہ کر لو، کیا کرنا ہے۔''

''یہ کیسی باتیں کر رہی ہو چندا، تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔''

''کاش تابش عزیز میں پاگل ہوتی یا پھر شروع میں تم پر اعتماد کرنے کے بجائے یہ شرائط رکھتی کہ تم اپنے گھر والوں کو بھیج دو۔ لیکن یہ میرے اندر کی سچائی تھی کہ تمہاری جھوٹی اور منافقانہ باتوں پر ایمان لے آئی۔ لیکن اب مزید جھوٹی آس پر تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی۔ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ مجھے تم پر بھروسہ نہیں رہا۔ تمہارے سب دعوے ریت ثابت ہوئے، پانی پر گھر تعمیر کرتے رہے۔ سچ کہوں تم گھر والوں کو بھیجنا ہی نہیں چاہتے اور مجھے یقین ہو جائے گا تم بے وفا تھے۔ میں تمہیں ایک ماہ کی مہلت دیتی ہوں اس عرصہ میں، میں اپنا کہیں رشتہ طے نہیں ہونے دوں گی۔ لیکن اس کے بعد میرا ہر اختیار ختم ہو جائے گا اور گھر والے جہاں چاہیں بات فائنل کر دیں۔ اور ہاں اگر تم واقعی ہی مجھ سے محبت کرتے ہو۔ مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو تو گھر والوں کو بھیج سکے ہو تو فون کرنا ورنہ آج کے بعد کوئی رابطہ نہ کرنا مجھ سے پلیز۔'' یہ کہہ کر چندا نے کال ڈراپ کر دی۔ اور خود چہرہ گھٹنوں میں چھپا کر رونے لگی۔

اس کے لیے جو رشتہ بھی آتا تو بھابی اسے، اس کے متعلق بتاتیں، تب اس نے بھابی سے مدھم لہجے میں کہا۔

''بھابی ایک ماہ تک آپ کہیں بات فائنل نہیں کرنا۔''

''کیوں خیریت، کوئی خاص وجہ؟''

''بس ویسے ہی۔'' وہ بھابی کی معنی خیز نگاہوں سے گھبرا کر بولی۔ اس لیے جلدی خلاصی ہو گئی۔ ایک تو ان کی عادت نہیں تھی کریدا، کریدی کی دوسرے وہ چندا کی اس عادت سے واقف تھیں کہ وہ اپنے دل کے معاملے میں بہت ریزرو سی رہتی ہے۔ اپنے دل کی بات بہت کم شیئر کرتی ہے۔ اس لیے انہوں نے صرف اتنا ہی کہنا مناسب سمجھا۔

''چندا اگر کوئی بات ہے تو بڑی بہن سمجھ کر شیئر کر لینا۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گی تمہاری مدد کر سکوں۔''

''نہیں بھابی ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس نے گہری مسکراہٹ میں اپنی پریشانی کو چھپا لیا۔ حالانکہ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا جب تابش عزیز کے گھر والے آئیں گے تو وہ پہلے بھابی کو ان کے بارے میں بتائے گی۔

لیکن تابش عزیز نے ایک ماہ بھی اسی خاموشی سے گزار دیا۔ چندا نے یہ دن کیسے گزارے وہ ہی جانتی تھی۔

ہر آہٹ پر وہ چونک جاتی۔

ہر بیل پر اس کا دل دھڑک جاتا۔ تابش کا فون ہوگا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تابش کے فون کی اطلاع دیتیں مگر تابش عزیز تو جیسے بھول ہی گیا تھا۔

دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ تابش کے نمبر ڈائل کرتی لیکن سکینڈ کے ہزارویں حصے میں اس کے اندر کی لڑکی جاگ اٹھتی۔

''چندا عقل کے ناخن لو، ہوش میں آ جاؤ۔ جتنی محبت تم اس سے کرتی ہو، جتنی شدتوں سے چاہتی ہو۔ وہ بھی تو اتنی شدتوں سے اپنے جذبوں کا اظہار کرتا ہے۔ اگر وہ مخلص اور سچا ہے تو بھیجے اپنے گھر والوں کو۔ دل کے کہنے میں نہ آؤ۔ یہ تمہیں دلدل کی طرف لے جا رہا ہے۔ رسوائی، ذلت، بدنامی کے سوا کچھ نہیں۔ سراب ہے۔ دل کو سمجھاؤ، سنبھالو خود کو۔ تمہارا دل ٹوٹے گا تو کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوگی۔ مگر دل کی انگلی تھام کر یونہی آگے بڑھتی رہو گی تو ذلیل و رسوا ہو جاؤ گی اور جب عزت نہ ہو تو کیسے رہ پاؤ گی۔

تابش عزیز کا نمبر ڈائل کرتے کرتے وہ رُک جاتی۔ وہ بے اختیار ہو جاتی لیکن خود کو روک لیتی اور پھر اس کا آنسوؤں اور آہوں پر اختیار ختم ہو جاتا۔ ہر لمحے اس کے دل سے ٹھنڈی آہیں نکلتیں۔ وہ سب سے چھپ چھپ کر بے تحاشا روتی۔

ایک ماہ تو کیا دو ماہ گزر گئے۔ تابش عزیز نے مڑ کر اس کی خبر نہ لی۔ رو رو کر اس نے اپنا برا حال کر لیا تھا۔

''تم تو کہا کرتے تھے تابش عزیز کہ میں تم بن چندا، جی نہیں پاؤں گا۔ ایک سانس بھی نہیں لے سکتا۔''

اور اب وہ زندہ بھی تھا اور سانس بھی لے رہا تھا۔ اسے چندا کی پروا بھی نہیں رہی تھی۔ چندا ذرا اس سے خفا ہو جاتی تو اس کی منتیں کرتا، اسے مناتا، اور اسے منا لیتا۔ اس کی باتیں چندا کو پہروں رلاتیں۔

''تابش عزیز کاش ایک بار صرف بار تم فون تو کرتے۔ چندا کا حال تو پوچھتے۔ اس کا دکھ تو بانٹتے، ایک بار اسے اپنی محبت کا یقین تو دلاتے۔ مگر تم...... تابش عزیز تم......تو ایسے خاموش ہو کر بیٹھ گئے ہو جیسے تمہارا میرے ساتھ کبھی کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ کیا مجھے تم بھلا سکتے ہو۔ کیا میں اتنی ارزاں تھی کہ تم اتنی آسانی سے بھول گئے۔ کبھی کسی لمحے میری یاد نہیں آئی تمہیں؟''

وہ روتی تڑپتی اور اس کی یادوں سے باتیں کرتی۔ تو فاریہ اسے سمجھاتی۔

''چندا تمہارے لیے یہی مناسب ہے کہ اسے ایک حسین خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔'' اور پھر یوں ہی تڑپتے سسکتے چندا کی منگنی ہوگئی۔ گھر کے سب فرد خوش اور مطمئن تھے لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ اس کو چاہنے والا ایک عام سا شخص نکلا۔ وہ جو اسے دنیا سے الگ منفرد اور جدا سمجھتی تھی لیکن وہ بھی تو ایک عام ہی شخص نکلا۔ وہ اسے فرشتہ کیوں سمجھنے لگی تھی۔ خوب صورت باتیں کرنے والا، میٹھے لہجے کا مالک، ایک فریبی انسان تھا۔ چندا ارسلان کے آنسوؤں کی حقیقت کوئی نہیں جان سکا اور اپنی آہوں اور آنسوؤں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ لاجواب ہوگئی۔ اور ریزہ ریزہ دل کے ساتھ اس بے وفا کو یاد کر کے روتی رہتی۔ جتنا کوشش کرتی اسے بھول جانے کی وہ اتنی ہی شدت سے اسے یاد آتا۔ اس کی باتیں، اس کی یادیں اسے تڑپاتیں۔ اسے بھولنے کب دیتی تھیں۔ میں یہ سب اس کے اختیار میں کب رہا تھا۔

اور نہ جانے وہ اس کے دل سے نکلتا بھی ہے کہ نہیں۔ وہ خود سے سوال کرتی مگر ہر سوال تابش عزیز کی طرف جاتا تھا اور تابش عزیز تو کب کا اس کو بھلا چکا تھا۔

☆☆......☆☆......☆☆

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

''اگر تم ایسا سوچتی ہو قدر! تو پھر لازم ہے یہ بھی سوچو کہ یہ فرض صرف میرا نہیں تمہارا بھی ہے۔ یہ بھی سوچو کہ تم نے مجھے خوش رکھنے کی کتنی کوشش کی۔ میری خوشی کا کتنا خیال رکھا۔ جہاں تک میری بات ہے تو میں شادی کے بعد اس معاملے میں اپنے دل پر کوئی بوجھ نہیں پاتا۔ زندگی میں صرف ایک معاملہ نہیں ہے۔ ازدواجیات کا معاملہ، اس میں باقی......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا ستائیسواں حصہ

''آپ بات کرلیں۔'' اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ پلکیں بوجھل بوجھل۔

''بیٹے آپ کرو...... بلکہ اندر لے جاؤ فون اپنے کمرے میں۔'' لاریب نے اس کی سہولت کے لیے کہا تھا۔ عبداللہ کے کھنکھارنے، اتباع کے ہنسنے پر قدر کچھ اور بھی خفیف سی ہونے لگی۔ پھر ان سب کے اصرار پر ہی وہ محفل سے اٹھ کر تنہائی میں آ گئی تھی۔

''تم ٹھیک ہو ناں قدر......! امی نے جو بتایا...... تم خوش ہو......!'' وہ اس کی پریگنینسی کا حوالہ دے رہا تھا۔ قدر نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب کر خود کو صوفے پر گرا دیا۔

''ناخوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیے عبدالعلی!'' وہ پتا نہیں کیوں اتنی سنجیدہ تھی۔ عبدالعلی لاجواب سا ہوا۔

''میرا مطلب...... شاید تم اتنی جلدی ان چکروں میں پڑنا پسند نہ کرو۔'' وہ خود بھی سنجیدہ ہوا۔

''عبدالعلی آپ کے لیے تو میں نے وہ سب بھی کرلیا جو کبھی تصور بھی نہ کرتی تھی۔ یہ تو میرے لیے پھر بہت بڑا اعزاز تھا۔ مگر آپ کہاں سمجھیں گے آپ پہلے کہاں مجھے کچھ سمجھ پائے ہیں۔'' اس کے اندر ہزاروں شکوے تھے۔ وہ شکوے کرنا بھی چاہتی تھی۔ اس کا دل اتنا ہی بھرایا جارہا تھا۔ دوسری جانب یکلخت سناٹا سا چھا گیا۔

''تم ابھی تک خفا ہو مجھ سے قدر......!'' وہ جیسے حیران تھا۔ یا شاید دکھی۔ قدر سمجھ نہیں سکی۔

''نہیں...... محبت خفگی کی اجازت نہیں دیتی ہے عبدالعلی! آپ نے سنا تو ہوگا۔ عشق کے علاقے میں حکم یار چلتا ہے۔ میں آپ کے خلاف نہیں چل سکتی۔ ہاں یہ دکھ ہمیشہ رہے گا۔ کاش آپ نے بھی محبت کی ہوتی۔ عبداللہ بھائی کے جیسی محبت......'' اس کا لہجہ حسرتوں سے چیخ رہا تھا۔ شکوہ کا مطلب ہی دوسری جانب سے کچھ سننا تھا۔ کوئی پیار بھرا فقرہ، کوئی بھروسے سے لبریز عہد کوئی یقین کوئی

اظہار...... مگر وہ اتنی خوش بخت کہاں تھی۔ لائن کٹ گئی تھی۔ وہ ہاتھوں میں فون لیے بھیگی آنکھوں سمیت وہیں بیٹھی رہی۔ روتی رہی۔

☆......☆......☆

سارا کی نظریں اس پر تھیں۔ آنکھوں میں نمی، وہ کتنا تبدیل ہو گیا تھا۔ حواس سلامت ہوئے تھے تو کیسی مثبت تبدیلی لائے تھے۔ خوش الحان پُرسوز آواز میں جب وہ مناجات پڑھتا سارہ کا دل سجدہ ریز ہو جایا کرتا۔ ورنہ اک وہ بھی وقت تھا جب انہیں لگتا تھا۔ وہ اک بار پھر تباہ ہو جائیں گی۔ خالی ہاتھ رہ جائیں گی۔

مگر...... عبدالغنی نے کہا تھا آپ فکر نہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور وہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ خوش نصیب ہے وہ جس کا حاصل کبھی لا حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا حاصل اس کی خود شناسی ہے۔ جس نے اپنے آپ کو دریافت کر لیا۔ اس نے سب کچھ ہی پا لیا۔ ہمیشہ کے لیے ہمہ حال صاحبِ حال ہو گیا۔

عبدالغنی کی بات رب کے حکم سے پوری ہو گئی تھی۔ ارسل انہی بابخت لوگوں میں شمار ہوا تھا۔ جو خود شناس ٹھہرتے تھے۔ جو خود کو دریافت کرتے ہیں۔

"ہر نماز کے بعد تین مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھیں اور یہ دعا مانگیں۔

"اے ہمارے رب...... اس کلمہ پاک کو اپنے پاس ہماری امانت کے طور پر محفوظ فرما لے...... ہماری موت سے تین منٹ پہلے اس امانت کو ہمیں واپس لوٹا دیجیو اور بیشک تو سب سے بڑا امین ہے۔" وہ اسامہ کے پاس بیٹھا انہیں اور چھوٹے بھائی کو کہہ رہا تھا۔ اسامہ کے چہرے پر بڑی آسودہ مسکان تھی۔ جس میں فخر کی بھی آمیزش تھی۔

"آپ بھی پڑھا کرو ماما!" وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ انہوں نے فی الفور سر کو اثبات میں ہلا دیا تھا۔ پھر اس کے برابر بیٹھ کر چائے کا مگ اس کی جانب بڑھایا۔

"اک بات مانو گے میرے چاند!" ان کا لہجہ محبت آمیز بھی تھا۔ اور ملتجی بھی ارسل نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔ گویا اجازت دی۔

"شادی کر لو بیٹے! مجھے بہت ارمان ہے تمہیں دولہا بنے دیکھنے کا۔" ارسل کے چہرے کی سنجیدگی آن کی آن میں گھمبیرتا میں ڈھل گئی۔

"مجھے اعتراض نہیں ہے۔ کرلوں گا، مگر شرط وہی ہے۔ کوئی ایسی لڑکی جس میں کوئی جسمانی نقص ہو۔ جو اس کی شادی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ٹھہر رہا ہو۔" اس نے جتنے سکون سے یہ بات کہی تھی۔ ماحول پر اسی قدر سناٹا چھا گیا تھا۔

☆......☆......☆

"جب آنکھوں سے سجدے بہنے لگیں تو قبولیت کے سمندر میں ہلچل ضرور مچتی ہے ایک بار رب کو پکار کر تو دیکھو۔"

عبدالہادی فون پر کسی سے مخاطب تھے۔ علیزے وہیں دروازے سے پلٹ آئیں۔

"دوزخ کو دیکھے بغیر جنت میں رہنے والوں کو جنت کی قدر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ انسان دوزخ کو دیکھے بغیر اس کی ہولناکی کا اندازہ ہی نہیں لگا پاتا۔" علیزے کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ انہیں ماضی یاد آیا۔ جب رب انہیں لگتا تھا ان سے روٹھ گیا ہے، وہ مری نہیں تھیں۔ مگر انہیں لگتا تھا وہ مر گئی ہیں۔ وہ دوزخ میں نہیں تھیں مگر انہیں لگتا تھا وہ دوزخ میں پھینک دی گئی ہیں۔ انہیں

یقین ہی نہ آتا تھا۔ رب انہیں معاف بھی کر سکتا ہے۔ ان جیسی گناہ گار کو بھی......''

مگر بریرہ نے کہا تھا۔

''تمہارا دل و ضمیر ابھی زندہ تھا۔ ابھی مہر نہیں لگی تھی۔ اس لیے پلٹا دیا گیا۔ روک دیا گیا۔ سو کوڑوں کی سزا صرف غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے مخصوص ہے۔ شادی شدہ مرد و عورت کی سزا سنگساری ہے۔'' اور جن دنوں وہ عبدالہادی کو معاف نہیں کر پا رہی تھیں۔ ان کے لیے گنجائش نہیں نکال پا رہی تھیں۔ تب عبدالغنی نے انہیں سمجھایا تھا۔

''اللہ کے ساتھ جن لوگوں کا تعلق جتنا زیادہ ہوتا ہے۔ ان میں معاف کرنے کی صلاحیت اتنی ہی زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جس کا اللہ سے تعلق نہیں ہوتا۔ وہ پھر اپنا بدلہ آپ لیتا ہے۔ بلکہ بدلے میں پھر ظالم ہو جاتا ہے۔ تو ظالم سے بدلہ لیتے وقت پھر مظلوم بھی ظالم ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس سے بچو...... یعنی بدلہ لینے سے، بلکہ تم دعا کرو اللہ وہ کرے جو تمہارے لیے بہتر ہے۔''

تب جواب میں وہ بے تحاشا رونے لگی تھیں۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی ہے بھائی! یہ کیا ہو گیا ہے۔ میں اب کیا کروں؟'' وہ تب کتنی وحشت زدہ رہتی تھیں۔

''کہا نا...... سب اللہ پر چھوڑ دو۔''

''لیکن معاملہ پھر مذہب کا درمیان آ گیا ہے بھائی! اب جب آنکھیں کھل گئی ہیں۔ تو جان سے بڑھ کے عزیز ہے اپنا ایمان اپنا مذہب، مذہب وہ اٹل حقیقت ہے جس کے سامنے دنیا کی ہر شے ہیچ ہے، محبت بھی...... یہ دونوں اگر ساتھ ہوں تو مل کر ایک دلکش رنگ ضرور جنم دیتے ہیں۔ جس کے سامنے کائنات کے سب رنگ بے معنی ہیں۔ لیکن اگر یہ آپس میں متصادم ہو جائیں تو زندگی کا چہرہ مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور میں یہ چہرہ مر کے بھی مسخ ہونے سے بچاؤں گی۔''

''علیزے......!'' انہوں نے چونک کر سر اونچا کیا۔ عبدالہادی ان کے سامنے کھڑے حیران نظروں سے انہیں دیکھتے تھے۔ جبکہ علیزے کی نظریں خالی خالی تھیں۔

''کہاں پہنچی ہوئی تھیں بیگم صاحبہ! کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔'' وہ ان کے مقابل آ بیٹھے۔ علیزے نے سر کو آہستگی سے نفی میں ہلا دیا۔

''ماضی کا خیال آ گیا تھا آپ کی باتیں سن کر...... بہت تنگ کر چکی ہوں نا آپ کو اور بہت شک بھی کرتی تھی۔'' وہ نرم مسکان سے انہیں محبت سمیت تکنے لگیں۔ عبدالہادی نے چونکتے ہوئے بغور انہیں دیکھا۔

''آپ کا رویہ بالکل نارمل تھا علیزے۔''

''مگر مجھے پھر بھی آپ سے معافی مانگنی چاہیے تھی۔''

''کم آن علیزے! کن تکلفوں میں پڑ رہی ہیں۔ آپ مجھ سے الگ نہیں ہیں۔ خود سے کیسی معذرت جانِ من!'' انہوں نے اپنا بازو ان کے شانے پر پھیلا کر خود سے قریب کیا۔ علیزے جیسے تھک سی گئی تھیں۔ سر ان کے شانے سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

''اب عمر کے اس حصے پر آ پہنچی ہوں کہ ہر خطا سے تائب ہونے پر غلطی پر معافی مانگنے کا ہی خیال دامن گیر رہتا ہے۔ بس اتنی بات تھی۔'' ان کی آواز جیسے ڈوب رہی تھی۔ عبدالہادی نے پریشان کن نظروں سے انہیں دیکھا۔

''پلیز بیگم ایسی باتیں نہ کریں۔ ہم تو کچھ اور سوچ رہے تھے۔ قدر تو اتنی جلدی اپنے گھر کی ہوگئی۔ ہمیں اپنے اگلے بچے کا سوچنا اور رب سے درخواست کرنا چاہیے۔'' وہ مسکرا رہے تھے۔ علیزے پہلے حیران ہوئیں پھر اسی قدر جھینپ گئی تھیں۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں اس عمر میں۔'' وہ سرخ پڑ رہی تھیں۔ عبدالہادی اور زور سے ہنسنے لگے۔

''یار اتنے بھی بڈھے نہیں ہوئے ہیں ابھی۔ میں تو سنجیدہ ہوں آپ بھی سوچ لو۔'' علیزے انہیں گھورتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''چند ماہ ہیں بیچ میں نانا بننے کی تیاری کریں، سمجھے......!'' اور عبدالہادی مسکراتے ہوئے آنکھیں موند گئے تھے۔ ان کا مقصد علیزے کو ریلیکس کرنا تھا۔ وہ کامیاب رہے تھے۔

☆......☆......☆

وہ لان میں جھولے پر بیٹھی تھی۔ بال کھلے تھے، دوپٹہ کندھے پر دھرا ساتھ ساتھ لہرا تھا۔ بالوں کی طرح، اس کی آنکھیں یاس زدہ تھیں۔ چہرہ زرد سا، کانوں میں ہیڈ سیٹ تھا۔ وہ میوزک انجوائے نہیں کر رہی تھی گویا غم منا رہی تھی۔

عبیر نے کچن کی کھڑکی سے اسے اداسیوں کی زد میں دیکھا تھا۔ اور گہرا سانس بھر کے پلٹ کر سالن کے نیچے آنچ دھیمی کرنے کے بعد دوسری جانب چائے کا پانی رکھ دیا۔ ارادہ اس کے پاس جا کے اس کا ذہن بٹانے کا تھا۔ کبھی کبھی تو انہیں بھی لگتا۔ عبدالعلی نے واقعی اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ قدر نے جھولا روک دیا اور ہاتھ کی پشت سے آنکھیں پونچھ کر گہرا سانس بھرا۔ اس کے ہونٹ عجیب سے اضطراب کے ساتھ بار بار انہی الفاظ کو دہرا رہے تھے۔

پیار تمہیں کتنا کرتے ہیں
تم یہ سمجھ نہیں پاؤ گے

ضبط چھلکا تھا۔ آنسو قطرہ قطرہ پلکوں سے ٹوٹنے بکھرنے لگے۔ وہ خود بھی اسی ٹوٹ پھوٹ کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ کل پھر اس کا فون آیا تھا۔ وہ جتنی خوش ہوئی تھی۔ اس سے بات کرتے اسی قدر بے چین بھی ہونے لگی۔

''آ جائیں عبدالعلی!'' اور وہ دوسری جانب اس قدر حیران ہوا تھا۔

''ارے...... ابھی تو گیا ہوں۔ اتنی جلدی یہ کہاں ممکن ہے۔''

''یہ جلدی ہے؟'' وہ بجھ گئی۔ حد سے زیادہ دل برداشتہ ہوئی تھی۔

''ایک ماہ بھی نہیں ہوا۔ پھر یہ تاخیر کدھر سے ہوگئی؟'' وہ ہنسنے لگا تھا۔ اور وہ کہتے کہتے رہ گئی۔ کہہ نہ سکی۔ مجھ سے پوچھیں کتنے دن کتنے منٹ کتنے پل بیت گئے۔ ہر لمحہ ایک صدی تھا۔

''پھر کب آئیں گے؟'' وہ بیکل تھی۔ مضطرب تھی۔

''اپنے بچے کو دیکھنے آ جاؤں گا ڈونٹ وری۔'' اور سانسیں قدر کے سینے میں اٹک گئی تھیں۔

''اتنا لیٹ......؟'' وہ رو پڑی۔

''یہ لیٹ کہاں ہے یار......''

''میرے لیے تو ہے۔ اور اگر میں اسی انتظار میں مر گئی۔ عبدالعلی تو......؟''

''پلیز قدر......! ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ بجائے میری حوصلہ افزائی کے تم حواس چھین لینے کے درپے ہو جاتی ہو۔'' وہ الٹا خفا ہونے لگا تھا۔ وہ یکلخت خاموش ہوگئی بلکہ اپنے تئیں ناراض ہوگئی

تھی۔

اس نے فون عبیر کو تھمایا خود وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ اس کے بعد تو جیسے اضطراب مزید بڑھا تھا۔ آنکھیں خشک ہوتی ہی نہ تھیں۔ وہ سب کے درمیان موجود ہو کے بھی جیسے اکیلی تھی۔ اک صرف عبدالعلی کے نہ ہونے سے...... اس وقت بھی عبیر چائے کے مگ سمیت اس کے برابر آن کر بیٹھ گئیں اور اسے خبر تک نہ ہو سکی۔ ان کے پکارنے پر وہ ہڑبڑائی تھی۔ اور گھبرا کر بھیگی آنکھیں اور گال رگڑ کر صاف کرتے ان سے نظریں چرانے لگی۔

''ایسے تو آپ بیمار پڑ جاؤ گی بیٹے! بچے کی صحت پر بھی اثر پڑے گا۔'' انہوں نے تفکر سے کہتے اسے افسردگی سے دیکھا تھا۔ قدر نے ہونٹ کچل دیے۔ پھر بھراہٹ زدہ آواز میں بہت مدھم انداز میں گویا ہوئی تھی۔

''میں نے پڑھا تھا۔ عورت ایسے مکان کی طرح ہوتی ہے۔ جو زندگی میں بس ایک بار آباد ہوتا ہے۔ کوئی مکین آتا ہے اور اس میں سما جاتا ہے۔ اگر وہ مکین کسی بھی وجہ سے چھوڑ کر چلا جائے تو عورت اپنی مرضی سے آسیب زدہ مکان بن جاتی ہے۔ تاکہ کوئی بھی دوسرا مکین اس کے اندر قدم نہ رکھ سکے۔ میں عبدالعلی کے معاملے میں ایسی ہی شدت پسند سوچ رکھتی ہوں۔ وہ اگر مجھے نہ ملتے تو میں ساری عمر شادی نہ کرتی۔ اب اگر وہ مجھ چھوڑ کر چلے گئے ہیں تو میں کیسے ہنسوں کیسے خوش رہ لوں؟

''ممانی جان......! میرا دل میرے خلاف مجھے چلنے ہی نہیں دیتا۔ میری آبادی میری ویرانی عبدالعلی کی ہجر و وصال سے ہی منسوب ہے۔ آپ یقین کریں میں بے بس ہوں۔

عبیر خود چائے پینا بھول کر گم صم بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی یاسیت اس کا دکھ ان کے دل میں جیسے شگاف ڈال رہا تھا۔ اک اک لفظ ضبط برداشت اور اذیت کا مظہر تھا۔ وہ اسے غلط کیسے کہہ دیتیں۔ قدر نے ہاتھ سے پھر سے بھیگ جانے والے گال صاف کیے۔

''مجھے معلوم ہے میں کمزور دل کا مظاہرہ کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے عبدالعلی جیسے مجاہد اور بلند اداروں کے مالک شخص کی بیوی کو اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے۔ انہوں نے اتنا مجھے سمجھایا۔ اتنا قائل کیا ہے۔ مگر میرا دل...... میرا دل قرار ہی نہیں پکڑتا...... صبر ہی نہیں کرتا۔ ممانی جان......! آپ نے کبھی مقناطیس کا چھوٹا سا ٹکڑا دیکھا ہے؟ اس ٹکڑے کے دو حصے ہوتے ہیں۔

شمالی قطب

جنوبی قطب

مقناطیس کو درمیان میں سے کاٹ کر دیکھیں۔ اور کوشش کریں۔ شمالی قطب جنوبی قطب علیحدہ ہو جائیں۔ آپ دیکھیں گی کہ نئے دو ٹکڑوں میں پھر شمالی قطب جنوبی قطب پیدا ہو جائیں گے۔ آپ مقناطیس کو کاٹنے کے عمل سے چھوٹا کرتی چلی جائیں۔ مقناطیس کے آخری مولیکیول میں بھی ایک سرا شمالی اور دوسرا جنوبی قطب ہوگا۔ انسان کا بھی یہی حال ہے۔ اسے خیر اور شر دونوں سے بنایا گیا ہے۔ اس میں آگ اور پانی دونوں بیک وقت موجود ہوتے ہیں گو کہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن چراغ اندھیرے کے علاوہ روشن نہیں ہو سکتا۔ نہ خوشنما ہی لگتا ہے۔ میں اب سمجھی عبدالعلی مجھے چھوڑ کر جانے سے قبل مجھے عمرہ کے لیے کیوں لے کر گئے تھے۔ وہ مجھے صبر سکھانا چاہتے تھے۔ وہ مجھے برداشت پڑھانا

چاہتے تھے۔ وہ مجھے رب کی راہ پر چلانا چاہتے تھے۔ مگر......"

"ممانی جان......! صبر نہ تو شربت ہے جیسے پلا دیا جائے، برداشت بھی کوئی دوا نہیں جسے حلق سے زبردستی اُتار لیا جائے۔"

انسانی فطرت میں اگر خیر شر برداشت اور حوصلہ ہے تو بے قراری' اضطراب وحشت اور بے کلی بھی ہے۔ ان سے کیسے یکلخت چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ عبدالغنی کو بھی یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ میں بہر حال خواہشات سے پاک نہیں تھی۔ فرشتہ نہیں تھی، مجھے کچھ تو مہلت دیتے۔ کیا ضروری تھا......؟ شادی کے فوری بعد اتنے کٹھن محاذ پر پوسٹنگ......؟" وہ سسکیوں ہچکیوں کے درمیان سوال پر سوال کر رہی تھی۔ اور کچھ فاصلے پر ان کی پشت کی جانب کھڑے عبدالغنی ہر لمحہ اضطراب کا شکار ہوتے جارہے تھے۔

☆......☆......☆

اس کی ضد جیتی تھی۔ عبداللہ کو پھر ہار تسلیم کرنی پڑی۔ وہ اس کے ساتھ نہیں گئی۔ عبداللہ نے محض اس سے دوری کو گوارا نہ کرتے اپنے کیریئر کی اہم کامیابی سے کنارہ کرلیا۔ اور اسے جتلایا نہیں۔

"آپ چلے جائیں، میرے پابند تھوڑی ہیں؟" اتباع کو اس کا فیصلہ بریرہ سے معلوم ہوا تو حیرانی اپنی جگہ تھی۔

"تم ایسا نہیں سمجھتی ہوگی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں خود کو تمہارا پابند پاتا ہوں۔ صرف پابند نہیں...... مجبوری بھی بتا چکا ہوں۔ تمہارے بغیر نہ رہ سکنے کی۔" اتباع خفیف سی ہوگئی تھی گویا کسی قدر جھنجلا بھی گئی۔

"بو جانی اور ماموں پوچھیں گے تو یہی فضول وجہ بتائیں گے آپ انہیں......؟" وہ اسے گھور رہی تھی۔ عبداللہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچل مچل گئی۔ اسے شرارت سوجھ گئی تھی۔

"ظاہر ہے جو سچ ہے وہی بتاؤں گا۔"

"فضول نہیں بولیں، سمجھ لیں آپ......" وہ کھسیا گئی تھی۔ عبداللہ کھل کر ہنسنے لگا۔

"پھر تم بتادو...... کیا کہوں میں؟"

"مجھے نہیں پتا......" وہ اب جھلا رہی تھی۔

"مجھے تو پتا ہے۔" اس نے مسکراہٹ دبائی۔

"کیا......؟" اتباع نے حیرانی سے پوری آنکھیں وا کیں۔

"یہی کہ میں تو مرتا ہوں تم پر۔ کاش تم بھی مجھ پر مرجاتیں۔ مگر اپنی ایسی قسمت ہی کہاں کہ......"

وہ مصنوعی افسردگی کا مظاہرہ کررہا تھا۔ اس کے باوجود اتباع کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

"میں نے ہرگز یہ حماقت نہیں کی...... یعنی خودکشی کی، اور یہ کیسا فضول شعر ہے۔ غور بھی نہیں کیا ہوگا آپ نے......" وہ آن کی آن میں برہم ہوئی تھی۔ عبداللہ نے مگر کہاں اثر لیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا پھر اس کا گال چوم لیا۔

"میری جنت کی حور! مومنہ! صادقہ بات تو سن لو۔ میری جان! عرف دھان پان! مذاق کررہا تھا۔ رئیلی۔"

"مذاق بھی سوچ سمجھ کر کیا کریں۔" اس کا موڈ بحال نہیں ہوسکا۔ ننھی سی ناک نخوت سے چڑھائی۔

"جو حکم می لارڈ!" وہ دونوں ہاتھ باندھ کر عاجزانہ غلامانہ انداز میں جھکا تو اتباع کو بھی مسکراہٹ ضبط کرنا محال ہوگیا تھا۔

"اچھا...... کل میرا برتھ ڈے ہے۔ اگر تم نے وش نہ کیا تو میں خفا......"

''یہ کیا بات ہوئی بھلا.....؟ آپ کو معلوم بھی ہے۔ میں یہ کام نہیں کرتی۔'' وہ چڑ گئی تھی۔

''جانتا ہوں پرہیزگار لوگو! مگر صرف وش کرنے میں تو کوئی حرج نہیں، ایک گلاب کا پھول دے دینا۔ بندہ خوش ہو جائے گا۔''

وہ مسکینیت سے بولا۔ اتباع اسے گھورتی رہی۔

''رسم تو پوری ہوگئی۔ یہ دن مخصوص ہوا تو...... عبداللہ میں غیر شرعی رسم کے سختی سے خلاف ہوں اگر سالگرہ اسلام میں منانا جائز ہوتا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء ایک لاکھ چوبیس صحابہ اور ان گنت اولیا کرام کی آمد کا جشن منانے کے لیے سال کے تین سو پینسٹھ دن کم پڑ جاتے۔'' عبداللہ خفیف سا نظر آتا محض سر کھجا رہا تھا۔

''تو پھر جو علماء کرام بارہ ربیع الاول کو کیک کاٹ کر نبی کریمؐ کا جشن ولادت مناتے ہیں۔ وہ ......؟ اسے بھی غلط کہو گی؟''

عبداللہ کو اچانک یاد آ گیا تھا۔ جبھی گرفت بھی کر لی۔ اتباع نے متاسفانہ سانس بھرتے سر کو جھٹکا۔

''اسے بدعت کہوں گی۔ احادیث میں صحابہ کرام رضوان اللہ کی حیات سے ہمیں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اور عبداللہ! بدعت سنت کی ضد ہے۔ بدعت اس واضح حقیقت سے آنکھیں میچ لیتی ہے کہ دین مکمل ہو چکا۔ اور شریعت پر مہر ثبت ہو چکی۔ جن چیزوں کو مقرر ہونا تھا۔ مقرر ہو چکیں۔ اب جو بھی کوئی بنا عمل اس کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ وہ محض غلط اور کھوٹا ہوگا۔ امام مالک کا قول ہے کہ جس نے بھی دین کے اندر نئی چیز ایجاد کی اور اسے اچھا سمجھے تو گویا اس نے دین میں خیانت کی۔ کیونکہ اللہ فرماتا ہے۔

''میں نے آج کے دن تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا۔''

جو اس وقت دین کا جز نہیں تھا وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتا۔ اے ہمارے رب! ہم اتنے ہی دین پر راضی ہوئے۔ جتنا تو نے ہمارے نبی کریمؐ پر نازل کر دیا۔ اور ہمیں یقین ہے نبی کریمؐ نے پورا دین ہم تک پہنچا دیا۔ جن کو یقین نہیں...... وہ جتنا مرضی اضافہ کریں۔ اللہ پاک ہمیں یہودیوں اور عیسائیوں کے راستے پر چلنے سے ہمیشہ بچائے۔ جنہوں نے سب سے پہلے انبیاء کی سالگراہوں کو منانا شروع کیا اور ان کی قبروں پر سجدہ شروع کر دیا۔''

اس نے بات مکمل کی تھی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ متاثر تو عبداللہ بھی تھا۔

''مجھے صحیح معنوں میں آج معلوم ہوا...... میری بیوی تو بہت بڑی عالمہ بھی ہے۔ ماشاء اللہ!'' وہ مسکرا رہا تھا۔ خوش تھا۔ اتباع قدرے خفیف سی ہوگئی۔

''اللہ کا کرم ہے۔ اُس نے توفیق بخشی ہے۔ ورنہ میں کوئی کمال نہیں رکھتی۔'' عبداللہ نے مسکرا کر گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ پھر گھمبیر آواز میں گویا ہوا۔

''میں نے سنا تھا۔ خاموش انسان پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں۔ خاموشی خود ایک اسرار ہے اور صاحب اسرار خاموش رہنا پسند کرتے ہیں کہ خاموشی دانا کا زیور ہے۔ آج یہ بات ثابت بھی ہوگئی تمہاری صورت۔''

اتباع بری طرح بلش کر گئی تھی۔

''پلیز اتنی تعریفیں نہ کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔'' وہ چند ثانیوں کو خاموش ہوئی پھر اس کے دونوں ہاتھ

بہت نرمی سے محبت سے اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''عبداللہ! میں چاہتی ہوں آپ بھی ویسے بن جائیں۔ جیسے بابا جان ہیں۔ جیسے عبدالہادی انکل ہیں۔ بنیں گے......؟ عبداللہ دوزخ کی چابی نفسانی خواہشات کی تکمیل ہے۔ دراصل نفسانی خواہشات کو ختم کردینا ہی بہشت کے دروازے کی چابی ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا۔ جس نے نفسانی خواہشات کو روکا......ضرور اس کی جائے پناہ جنت ہے۔'' عبداللہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر بے اختیار مسکرانے لگا۔

''ضرور بنوں گا، اگر تم مجھے بنانا چاہو، بنالو......''

''میں نہیں، اللہ بنائے گا، آپ کو بس خواہش کرنی ہے۔ دعا کرنی ہے، کوشش کرنی ہے۔''

''اور مائی اینجل! تمہیں ان تمام کاموں میں میری مدد کرنی ہے۔'' وہ ہنسا۔ اتباع کی ہنسی اور تائید بھی شامل ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

پھر بہت سارا وقت بیتتا چلا گیا۔ ہفتے...... مہینے، زندگی کا ڈھب وہی تھا۔ ہر جگہ اپنے انداز میں بیتی ہوئی۔ عبدالعلی واپس نہیں آسکا۔ عبدالغنی کی اس موضوع پر بالخصوص اس سے بات بھی ہوئی۔ انہوں نے اسے کسی پوسٹنگ چینج کرنے کا بھی کہا، مگر اب یہ معاملہ عبدالعلی کے اختیار سے باہر کا تھا۔ یہ تو عبدالغنی بھی جانتے تھے۔ اور بے بس بھی تھے۔

''تمہیں واقعی اتنی جلدی اتنی دور نہیں جانا چاہیے تھا بیٹے!'' وہ بھانجی کے لیے اکثر ملول رہتے۔ عبدالعلی جب بھی کال کرتا، وہ ایک ہی سوال کرتی۔

''کب آئیں گے عبدالعلی......؟ آجائیں۔'' پھر خاموش ہوجاتی۔ عبدالعلی ہی بولتا رہتا۔ وہ ایسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایمان افروز واقعات سناتا۔ جن میں جہاد کی اہمیت کا خاص تذکرہ ہوتا۔ اس وقت بھی وہ اسے کچھ دیر بہلاتا رہا تھا۔ پھر اصل موضوع کی جانب آگیا۔

''بڑے کام کی قیمت اپنے آپ کو چھوٹا کرلینے میں ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو چھوٹا کرلینے پر راضی نہیں ہوتے۔ اس لیے اکثر لوگ بڑے کام نہیں کرسکتے۔ میں تمہیں ایک بہت دلچسپ واقعہ سناؤں قدر......!''

وہ گویا اجازت طلب کررہا تھا۔ قدر نے یاسیت سے...... بے رغبتی سے ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔ عبدالعلی نے ان کیفیات کو جانے کس حد تک محسوس کیا تھا البتہ گلا کھنکار کر سلسلہ کلام ضرور جوڑ لیا تھا۔

''بغداد پر تاتاری فتح کے بعد ہلاکو خان کی بیٹی بغداد میں گشت کررہی تھی کہ ایک ہجوم پر اس کی نظر پڑی۔ پوچھا لوگ کیوں اکٹھے ہیں؟ جواب آیا ایک عالم کے پاس کھڑے ہیں۔ دختر ہلاکو نے عالم کو اپنے سامنے پیش ہونے کا حکم دیا۔ عالم کو تاتاری شہزادی کے سامنے لاکر حاضر کیا گیا۔ شہزادی مسلمان عالم سے سوال کرنے لگی۔

شہزادی......'' کیا تم اللہ پر یقین نہیں رکھتے؟''

عالم......'' یقیناً رکھتے ہیں۔''

شہزادی......'' کیا تمہارا ایمان نہیں کہ اللہ جسے چاہتا ہے غالب کردیتا ہے؟''

عالم......'' یقیناً ہمارا اس پر ایمان ہے۔''

شہزادی......'' تو کیا آج اللہ نے ہمیں تم پر غالب نہیں کردیا؟''

عالم...... "یقیناً کر دیا ہے۔"
شہزادی...... "تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اللہ ہمیں تم سے زیادہ چاہتا ہے؟"
عالم...... "نہیں۔"
شہزادی...... "کیسے......؟"
عالم...... "تم نے کبھی چرواہے کو دیکھا ہے؟"
شہزادی...... "ہاں دیکھا ہے۔"
عالم...... "کیا اس نے ریوڑ کے پیچھے کتے بھی کچھ چھوڑ رکھے ہوتے ہیں؟"
شہزادی...... "ہاں چھوڑ رکھے ہوتے ہیں۔"
عالم...... "اچھا تو اگر کچھ بھیڑیں ریوڑ کو چھوڑ کر کسی طرف کو نکل کھڑی ہوں۔ تو چرواہا کیا کرتا ہے؟"
شہزادی...... "وہ ان کے پیچھے اپنے کتے دوڑتا ہے تاکہ وہ ان کو واپس لے آئیں۔"
عالم...... "وہ کتے کب تک ان بھیڑوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں؟"
شہزادی...... "جب تک وہ فرار رہیں اور چرواہے کے اقتدار میں نہ آ جائیں۔"
عالم...... "تو آپ تاتاری لوگ زمین پر ہم مسلمانوں کے حق میں خدا کی جانب سے چھوڑے ہوئے کتے ہیں۔ جب تک ہم خدا کے در سے بھاگتے رہیں گے۔ اور اُس کی اطاعت میں واپس نہیں آئیں گے۔ تب تک خدا تمہیں ہمارے پیچھے دوڑائے رکھے گا۔ تب تک ہمارا امن چین تم ہم پر حرام کیے رکھو گے۔ ہاں جب ہم خدا کے در پر واپس آ جائیں گے۔ اس دن تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔"

لائن میں کچھ شور تھا۔ فنی خرابی کے باعث...... جبھی عبدالعلی کو بہت اونچا بولنا پڑ رہا تھا۔ بات مکمل کر کے وہ جیسے سانس بحال کرنے لگا۔ جبکہ قدر حقیقتاً اس واقعہ کے تاثر میں گم بیٹھی تھی۔

"میں نے یہ بھی پڑھا ہے قدر کہ جب تم کفار کو عروج پر دیکھو تو جان لو کہ انہوں نے ضرور مسلمانوں کی صفات اپنالی ہیں۔ اور جب دیکھو کہ مسلمان ذلت و پستی میں ہیں۔ تو جان لو کہ انہوں نے ضرور کفار کی بری خصلتوں کو اپنا لیا ہے۔"

وہ پھر توقف کر گیا۔ قدر ہنوز گم صم بیٹھی تھی۔ عبدالعلی کھنکارا۔

ارشاد ربانی ہے...... "کہہ دو کہ موت جس سے تم گریز کرتے ہو تمہارے سامنے آ کر رہے گی۔ پھر تم پوشیدہ اور ظاہر کے جاننے والے (خدا) کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ وہ سب تمہیں بتائے گا۔" سورۃ جمعہ، آیت 8۔

"قدر میری جان! محبت کی حقیقت صرف لا الہ الا اللہ ہے۔ باقی سب سراب ہے۔ مصیبت کی شکایت کرنے والا اپنے دشمن کو خوش اور اللہ کو ناراض کرتا ہے۔ تم سمجھیں میری جان! اب کسی نئے عقیدے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تقلید کی ضرورت ہے۔ صرف تقلید...... یعنی پریکٹس آخری اور مکمل دین کی...... جسے پیغمبر اسلام محمدؐ پر ختم کر دیا گیا۔

اب ہر وہ شخص خسارے میں رہے گا۔ جو دین کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کے بجائے کوئی اور راہ اختیار کرے گا۔ اگر ہماری تعلیم...... ہمارا شعور ہمارے دین کے متعلق صحیح اور غلط کی تمیز نہیں دے سکتے۔ تو ہم میں اور اس جانور میں کوئی فرق نہیں جو تازہ گھاس کے گٹھر کی خاطر کہیں بھی چلا جاتا

ہے۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس کا ریوڑ کہاں ہے۔''

وہ پھر چپ ہوا۔ وہ پھر اس کی تائید کا منتظر تھا۔ قدر نے ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔ اس کی آنکھیں جانے کس کس جذبے کس کس احساس کے ساتھ بھیگ رہی تھیں۔

''ہمیں سوچنا تو چاہیے نا قدر! ہم اپنی ساری زندگی اوپر ہی اوپر اپنے خول اور اپنے باہر کو سجانے میں لگا دیتے ہیں۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اصل انسان تو ہمارے اندر رہتا ہے۔ ہمیں اسے سنوارنا چاہیے۔ قلب کو اگر دنیا کی فضولیات سے خالی رکھا جائے۔ تو اس میں عجز وانکسار کے شگوفے کھلتے ہیں۔ ان شگوفوں کی خوشبو عجز اور کبر کی خوشبو نکال باہر کرتی ہے۔ عجز اور کبر دونوں روحانی بیماریاں ہیں۔

عجز میں انسان دوسرے کو تو حقیر نہیں سمجھتا۔ لیکن اپنے آپ کو عظیم ضرور سمجھتا ہے۔ جبکہ کبر میں انسان خود کو بھی عظیم سمجھتا ہے اور دوسرے کو بھی حقیر سمجھتا ہے۔ یہ خصائل قلب کی صفائی کو گندگی سے آلودہ کردیتے ہیں۔

قدر نے پہلو بدلا اور فون ایک کان سے ہٹا کر دوسرے سے لگایا۔ اسے اپنی کیفیات سمجھ نہیں آتی تھیں۔ پہلے پہل اسے عبدالعلی کی ایسی باتوں میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کوفت بھی ہوتی تھی۔ مگر اب وہ ان کیفیات سے نجات حاصل کر چکی تھی۔ بلکہ اگر یہ کہا جاتا اسے ان باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی تو غلط نہ ہوگا۔

''تم قرآن پاک کو ترجمہ سے پڑھنا شروع کرو قدر! یہ میری خواہش ہے۔ سیرت النبی کا مطالعہ کرو۔ کسی نے بہت خوب کہا ہے کہ......''
جب تک ایک ہاتھ میں قرآنِ پاک اور دوسرے میں سنتِ رسولؐ نہ پکڑلو...... اس راستے پر نہ چلو۔ تاکہ شبہات کے گڑھے میں گرو نہ بدعت کی تاریکیوں میں مبتلا ہو۔''

''ٹھیک ہے میں کروں گی اور کچھ......؟'' وہ بہت سنجیدگی سے سوال کررہی تھی۔ اطاعت کررہی تھی۔ عبدالعلی کو رخصت کے سمے کی قدر یاد آئی، روٹھی روٹھی روئی روئی، مگر فرمانبردار، کتنی پیاری لگ رہی تھی کتنی اپنی اپنی سی، اس کا دل ایکدم سے گداز ہوا تھا۔ اس کی کمی اس کی دوری کا احساس بہت شدت سے دل پہ وار کرنے لگا۔ جسے گہرا سانس بھر کے دباتے اس نے چند مزید باتوں کے بعد فون بند کردیا۔ فرقتوں میں واقعی بہت آزمائش تھی۔ بہت اذیت تھی۔ وہ دل پر اسی یاسیت کی برف گرتی محسوس کرتا رہا تھا۔ بہت دیر تک۔

☆......☆......☆

بریرہ ابھی جائے نماز پر تھیں۔ اتباع ان کے ساتھ ہی اٹھ جاتی تھی۔ تہجد کی ادائیگی کے بعد سورۃ یٰسین، سورۃ رحمٰن اور سورۃ محمدؐ وہ سحری کی تیاری کے دوران تلاوت کرتی تھی کہ حفظ تھیں یہ سورتیں، آج تیسرا روزہ تھا۔ اس کا زیادہ دھیان عبداللہ میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ جو آفیشل ٹوئر سے رات گئے لوٹا تھا تین دن بعد...... اتباع کو یہ جان کر کہ وہ دو روزے چھوڑ چکا ہے اتنا افسوس ہوا تھا کہ آنکھیں بھیگنے سے نہیں بچاسکی تھی۔

''ارے کیا ہوا......؟'' وہ کتنا حیران نظر آنے لگا تھا۔

''بغیر عذر کے روزہ چھوڑنا بالکل جائز نہیں ہے عبداللہ! آپ نے دونوں نہیں رکھے اور آپ کو پروا بھی نہیں۔'' وہ خفا بھی تھی چڑنے بھی لگی۔ عبداللہ نے گہرا سانس بھرا۔

''مجھے تو رمضان المبارک کی آمد کا بھی نہیں پتا لگا۔ یار اتنی گرمی ہے۔ اوپر سے جہاں میں تھا وہاں تو کسی نے بھی نہیں رکھا تھا روزہ...... کسی کو پتا بھی نہیں۔''

''میں نے آپ کو مبارکباد دی تھی رمضان کی آمد پر، روزہ کے لیے بھی تاکید کی تھی۔ اتباع کا ملال ڈھلتا ہی نہ تھا۔

''او کے...... کل رکھ لوں گا، تم مجھے جگا دینا۔ اب خوش......؟'' اس نے جیسے اتباع کو بہلایا۔

اب وہ جب سے اٹھی تھی۔ وقفے وقفے سے اسے جگا رہی تھی۔ مگر اس کی نیند اتنی گہری ہوتی کہ اتباع کو اسے جگانے میں ہر روز گویا پہاڑ سر کرنے پڑتے تھے۔

''اب اٹھ بھی جائیں پلیز! سحری کا ٹائم ختم ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ ہے۔'' اس نے اندر آکر اے سی اور فین بند کرنے کے بعد عبداللہ کا بازو پکڑ کر جھنجوڑا۔ عبداللہ نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھولیں۔ خمار آلود، سرخ آنکھیں، غضب کی دلکشی اور سحر لیے تھیں۔

''کیا ہے یار!'' وہ عاجز سا ہوتا غنودگی میں بڑبڑایا۔

''روزہ نہیں رکھیں گے؟'' اس نے بھی جھنجلا کر پوچھا تھا۔ مگر عبداللہ نے جس طرح فی الفور نفی میں سر ہلایا وہ ایک دم ٹھٹک گئی تھی۔

''واٹ...... ؟ روزہ نہیں رکھیں گے؟'' عبداللہ نے پھر مندی مندی آنکھیں کھولیں۔ وہ جو اسے پھر جھنجوڑنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ عبداللہ نے اس کا وہی بڑھا ہوا ہاتھ جکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ کہاں اس شرارت کے لیے تیار تھی۔ اس جھونک میں لہرا کر اس کے پہلو میں گری۔ اس سے پہلے کہ سنبھل کر اٹھتی۔ عبداللہ نے اسے بازوؤں میں مقید کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی اور اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اتباع اسی قدر بوکھلا اٹھی۔

''کیا کرتے ہیں......؟ چھوڑیں، اٹھیں۔''

''کیوں......؟ آدھی رات کو جگانے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے میری جان!'' مخمور خوابیدہ لہجہ جو سرگوشی سے مشابہ تھا۔ اتباع کا موڈ خراب ہونے لگا۔ یعنی حد تھی۔ جو وہ کہہ رہی تھی۔ اسے سنا نہیں اپنا مقصد خوب ازبر رہتا تھا۔

''سحری کے لیے جگا رہی ہوں عبداللہ! روزہ رکھیں گے ناں؟'' اس نے غصے میں کہتے اسے پیچھے دھکیلا۔ عبداللہ کی آنکھیں روزے کا سنتے ہی بند ہونے لگیں۔

''رکھوں گا۔''

''تو پھر اٹھ کے سحری کھائیں۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنا چاہا۔

''یار قسم سے آنکھیں نہیں کھل رہیں۔ ایسے ہی رکھ لیتا ہوں۔'' وہ سخت بے بسی سے بولا۔

''ایسے نہیں رکھا جا سکتا۔ تھوڑی سی ہمت کریں، اٹھیں۔''

وہ اسے اُٹھا کر ہی ٹلی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ جوتے اور شرٹ تک خود اسے پہنانا پڑی۔ وہ واش روم میں گیا تو بریرہ اتنی تاخیر پر خود اسے بلانے آ گئی تھیں۔

''عبداللہ نہیں اُٹھ رہے تھے بوجانی!''

''وہ تو ایسا ہی لیزی ہے اس معاملے میں، تمہاری پھر بھی ہمت کہ جگا لیا۔'' انہوں نے مسکرا کر کہتے گویا اسے سراہا۔ پھر ہاتھ میں موجود ٹرے اسے تھمائی۔

''یہ کیا بوجانی...... آپ......''

''بیٹے ٹائم بہت کم ہے۔ کچھ نہیں کھایا جائے گا۔ عبداللہ کے چکر میں تم سے بھی...... اور تمہاری

حالت بھی ایسی نہیں کہ سہہ پاؤ، کھاؤ تم، عبداللہ آجائے تو اسے بھی یہیں کھلالینا۔'' ان کا انداز کیئرنگ اور محبت آمیز تھا۔ اس کے باوجود اتباع شرمسار نظر آنے لگی۔

''دودھ ضرور پینا۔ کل بھی شام تک نڈھال ہوگئی تھیں تم۔ میں کہتی بھی ہوں چھوڑ دو...... بعد میں رکھ لینا...... مگر......''

''بو جانی آپ پریشان نہ ہوں۔ گزر جاتا ہے روزہ اللہ کے فضل و کرم سے...... اللہ نے ہمت عطا کی ہے تو چھوڑنا اچھا نہیں لگتا۔'' وہ عاجز ہوکر کہہ گئی۔ بریرہ اس کا سر تھپکتی چلی گئیں۔

''اتباع نے دودھ کا گلاس اٹھالیا۔ روٹین سے ہٹ کر کھانا بہت مشکل تھا۔ اس کی ہمیشہ سے عادت رہی تھی وہ سحری میں زیادہ نہیں کھاسکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ چند نوالے جب شادی نہیں ہوئی تھی۔ عبیر لاریب یا پھر عبدالغنی منتیں کرکرکے اسے دودھ پلاتے تھے۔ وہ اس معاملے میں بہت چور تھی۔

''کھالیں فٹافٹ...... بیس منٹ آپ آل ریڈی ضائع کرچکے ہیں۔''

اس نے عبداللہ کے لیے بھی گلاس میں دودھ نکالا۔ وہ آدھی بند آدھی کھلی آنکھوں کے ساتھ آکر اس کے پہلو میں لڑھک گیا۔ اس کے ٹھوکا دینے پر بامشکل گلاس پکڑا۔

''سحری کی دعا پڑھ لیں پہلے۔'' اسے گلاس منہ سے لگاتے دیکھ کر وہ ٹوک کر مسکرائی۔ عبداللہ نے اُلجھ کر پھر شرمندہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''مجھے تو آتی بھی نہیں۔'' وہ سر کھجارہا تھا۔

''چلیں میں پڑھاتی ہوں۔'' وہ دعا دہرانے لگی۔ عبداللہ نے مسکرا کر اس کی تقلید کی تھی۔ پھر دودھ کے گلاس سے گھونٹ بھرا۔

''یہ سب بھی بہت خوبصورت ہے۔ تمہارے ہمراہ ہر رنگ زندگی کا حسین ہے۔'' وہ خوش لگ رہا تھا۔ اتباع قدرے جھینپ گئی۔ وہ اسے ایک ایک چیز خود پیش کرتی گئی تھی۔ عبداللہ نخروں سے سہی مگر کھا رہا تھا۔ فجر کی اذان شروع ہوئی تو اتباع برتن سمیٹ کر ٹرے اٹھائے کمرے سے کچن میں آگئی۔ بریرہ ٹیبل صاف کررہی تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

''رکھ لیا روزہ عبداللہ نے......؟''

''جی الحمدللہ!'' وہ بے حد مسرور تھی۔

''اللہ پاک صراطِ مستقیم پر قائم رکھے، آمین۔''

''ثم آمین۔ لائیں میں دھوتی ہوں بو جانی!'' اس نے انہیں سنک کے سامنے سے ہٹا دیا۔

''بیٹے میں کرلوں گی۔ آپ نماز پڑھ کے آرام کرو ذرا۔''

''ضرور بو جانی! بس آپ یہ چھوڑ دیں۔ میں آتی ہوں۔ آپ ماموں کو دیکھیں کسی چیز کی ضرورت نہ ہو۔'' اس نے انہیں ہٹا کر دم لیا تھا۔ برتن دھوکر کچن سمیٹ کے وہ اندر آئی تو عبداللہ کو بجائے نماز کے لیے جانے کے سوتا پاکر اس کو ایکدم بہت شدید تاؤ آیا تھا۔ جبھی بغیر لحاظ کے اس نے اسے ایکدم بہت زور سے ہلایا تھا۔

''اب کیا ہے؟'' عبداللہ کو پھر ڈسٹرب ہونا ہرگز پسند نہیں آسکا۔ آنکھیں کھول کر ذرا سا اسے گھورا۔

''غالباً روزہ رکھ کر نماز بھی پڑھتے ہیں۔'' اس نے چلبلا کر کہا تھا۔

''ضرور پڑھتے ہوں گے غالب سے پوچھو۔'' وہ نخوت سے کہہ کر کروٹ بدل گیا۔

اتباع پہلے تو ہکا بکا ہوئی غالب کون' پھر جیسے سمجھی تو بھڑک سی گئی تھی۔ اس کے سر کے نیچے سے تکیہ کھینچ لیا۔

''عبداللہ شرافت کے ساتھ جا کر نماز پڑھیں' سمجھے......؟''

''اب میں شرافت کو کہاں سے ڈھونڈوں؟ جبکہ سرے سے واقف بھی نہیں۔'' وہ سر کھجاتا اٹھ بیٹھا۔ اتباع کے سر پر لگی تھی یہ جان کر کہ وہ محض اسے ستا رہا ہے۔

''اٹھیں...... مسجد جائیں۔'' وہ دونوں ہاتھ کمر پر جما کر اسے گھور رہی تھی۔

''یار...... میری نیند...... میری نیند کی دشمن کیوں بن گئی ہو تم......''

''نماز پڑھ لیں۔ پھر بیشک سو جائیے گا۔'' اتباع نے لہجہ قدرے نرم بنایا۔

''پکی بات ہے......؟'' اپنا ہاتھ اس نے وعدہ لینے کے انداز میں پھیلایا۔ اتباع گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔ حد تھی بچپنے کی بھی۔ اسے اپنا ہاتھ بڑھانا پڑا۔ عبداللہ البتہ پکڑ کر بھولنے لگا کہ چھوڑنا بھی ہے۔ اتباع کو خود اسے بازو سے پکڑ کر باہر چھوڑ کے آنا پڑا تھا۔

☆......☆......☆

وقت اور تیزی سے بیت رہا تھا۔ مگر اس کے لیے نہیں وہ تنہائی کے زنداں کی قیدی تھی۔ اور لمحہ لمحہ گھل رہی تھی۔ شادی کے بعد کی شب برأت پھر رمضان المبارک کی خوبصورت ساعتیں...... پریگیننسی کا آخری مرحلہ جو کٹھن تھا دشوار تھا۔ اور وہ شکستہ نڈھال، اتنے دن سے عبدالعلی کا بھی فون نہیں آیا تھا۔ اس کی طبیعت بھی کئی دنوں سے زیادہ خراب تھی۔ روزے بھی نہیں رکھے جاتے تھے۔ وہ اگر پاس ہوتا وہ بھی زندہ رہتی۔ وہ بھی خوش ہو پائی۔

وہ بھی چاہتی تھی وہ ایک سہاگن کی طرح سجے سنورے۔ سراہتی نگاہوں کی اسے بھی خواہش تھی۔ عبدالعلی اس کا محبوب تھا۔ اور محبوب کی جانب سے سراہے جانے کی خواہش میں وہ ادھ مری ہو رہی تھی۔ اسے یہ بھی وہم ہو گیا تھا کہ عبدالعلی کو اس سے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔ اسے یہ بھی یقین ہو رہا تھا عبدالعلی کو اس کی اب ضرورت ہی نہیں۔ جبھی تو اتنے آرام سے اس کے بغیر رہ رہا تھا۔ وہ بدل گیا ہے۔ اس کے اندر ویسی تڑپ ہی نہیں جو خود قدر اس کے لیے رکھتی ہے۔ جو اسے اندر ہی اندر کھا رہی ہے۔ اس روز وہ صبح سے ہی ایسی یادوں سے پاگل ہو رہی تھی۔ اتفاق یہ تھا کہ اس روز اس کی برتھ ڈے بھی تھی۔ عبدالعلی ان خرافات پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ مگر وہ اس کی جانب سے آج کے دن وش کی متمنی تھی۔ جو نہیں ملی تو اندر رکھتی آگ یکلخت الاؤ کا روپ دھار گئی۔ اس نے بڑی دقتوں سے عبدالعلی سے رابطہ بحال کیا تھا۔ وہ لائن پر آیا تو قدر کا ضبط بالکل پارہ پارہ ہو چکا تھا۔

''آپ کچھ نہیں بولیے گا آج عبدالعلی!'' اس کی آواز میں نمی تھی۔ لڑکھڑاہٹ تھی۔

''میں کچھ بولنا چاہتی ہوں۔ مجھے سن لیں۔ مہربانی۔'' اس کے گالوں پر آنسوؤں کی یلغاریں تھیں۔ اس کی آواز تھرا رہی تھی۔ عبدالعلی جتنا بھی حیران تھا۔ مگر کچھ نہیں بولا۔

''آج آپ کو میرے پاس ہونا چاہیے تھا۔ مجھے مگر اپنی قسمت پہ کوئی امید نہیں۔'' وہ سسکی۔ وہ رو پڑی۔ اس کے الفاظ بھی ٹوٹ رہے تھے۔

''آپ کی دوری نے آپ کی بے حسی نے مجھے لمحہ لمحہ مارا۔ میں...... چپ رہی، مگر...... میں

ٹوٹ رہی ہوں۔ بالکل مر رہی ہوں۔ علی...... علی......"

بھراہٹ زدہ آواز میں کہتی وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ضبط کی ساری عنانیں بکھر گئیں۔ دوسری جانب عبدالعلی پر کیا قیامت ٹوٹی اسے خبر نہیں تھی۔ اسے غرض نہیں تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ بس رو رہی تھی۔ وہ بس تڑپ رہی تھی وہ بس فریادیں کر رہی تھی۔

ہے مجھ کو یہ اعتراف کہ دعاؤں میں اثر ہے
جا ئیں ہی نہ جو عرش پر دعا ئیں تو کیا کریں
اک دن کی ہو بات تو تجھے بھول جائیں ہم
نازل ہوں دل پر روز بلا ئیں تو کیا کریں

ہیجان در ہیجان کا سلسلہ تھا۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔ اس کا بدن زلزلوں کی زد پر تھا۔ تشنج زدہ مریض کی طرح جھٹکے پر جھٹکے کھاتا تھا۔ عبدالعلی نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر قدر نے بولنے نہ دیا۔ وہ جیسے آج اس کی نہیں صرف اپنی سنانے کی متمنی تھی۔

میری مثال ایسی ہی ہے۔ عبدالعلی! میں پاگل ہو چکی ہوں۔ اب مجھے صبر نہیں آ سکتا۔ میں مر رہی...... ہوں...... عبدل...... علی......!!"

اس کی آواز ڈوبتے ڈوبتے بالکل ڈوب گئی۔ عبدالعلی بے چین ہوتا پکارتا رہ گیا۔ دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ سناٹے چھا گئے۔ اور خاموشی خوف میں مبتلا کرتی ہے۔ وہم جگاتی ہے۔ تشویش دلاتی ہے۔ مضطرب کیے جاتی ہے۔ عبدالعلی بھی مضطرب ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

دھوپ تیز تھی۔ گرمی شدید' سورج روشنی نہیں آگ پھینکتا تھا گویا۔ چند پرندسائے اور آب کی تلاش میں کملائے ہوئے اپنے پر کجلاتے تھے۔ ماحول میں سناٹا یا خاموشی تھی۔ اتباع نے گہرا سانس بھر کے ہاتھ میں موجود پیالہ جو پانی سے لبریز تھا۔ چھت پر مخصوص جگہ رکھا دوسرے پیالے میں دانہ موجود تھا۔ وہ مطمئن ہوتی پلٹ آ گئی۔ سیڑھیوں کے سرے پر تھم کر دیکھا۔ پیاس سے پژمردہ پرندے پیالے کے اردگرد جمع ہوتے اپنی چونچیں سیراب کر رہے تھے۔ وہ مسکرا دی۔ نیچے آئی تو وہی سناٹا اور خاموشی یہاں بھی اس کا استقبال کرنے کو موجود تھی۔ بریرہ آج صبح سے ہی عبدالغنی کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ آج تیسرا روزہ تھا اور عبداللہ تین دنوں سے ہی گھر سے نکلنے سے صاف انکاری......

"اس کا موقف تھا اتنی گرمی میں روزہ رکھ کے کون آفس کے لیے خوار ہوتا پھرے۔ مجھ میں اتنی ہمت اور اسٹیمنا نہیں ہے۔"

اتباع کتنا سمجھاتی رہی مگر اس پر مجال ہے اثر ہوا ہو۔ جواب دیا بھی تو یہ۔

"بھئی اگر تمہیں مجھے لازمی آفس بھجوانا ہے تو میں پھر روزہ نہیں رکھتا۔ روزہ رکھوں گا تو آفس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم ذرا یہ ریموٹ تو پکڑانا' اُف ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔ یعنی آدھے سے زیادہ ٹائم باقی ہے روزہ کھلنے میں...... پیاس کی شدت سے حلق میں ابھی سے کانٹے......"

اتباع بوکھلاتی گھبراتی اس کے منہ پر ہاتھ رکھتی رہ گئی۔ مگر وہ کہاں روک پاتی تھی اسے۔

"یہ کوئی احسان نہیں ہے عبداللہ! ایسے نہیں کہتے، اللہ کو پسند نہیں یہ انداز...... پلیز ایسے نہ کہیں اور روزے کے ساتھ ٹی وی کیسے دیکھیں

گے۔ بہت گناہ ہوگا۔ روزہ کی شان کے خلاف ہے یہ کام، عبادت کریں آپ...... قرآن پڑھیں۔''

''ویسے ہی دیکھوں گا آنکھوں سے...... جیسے ہمیشہ دیکھتا رہا ہوں اور کیسے دیکھوں گا؟ صبح قرآن پاک پڑھا تو تھا۔ یاد نہیں جب تک سونے کی اجازت نہیں دی تھی تم نے؟'' وہ جھنجلانے لگا۔ آنکھوں میں غم وغصہ اور سرد مہری بھی اترنے لگی۔ انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔ بولتا تھا تو تڑخنے لگا تھا۔ دوران روزہ بات بات پر ٹیمپر لوز کرتا۔ اتباع کے ماتھے پر تشویش اور سوچ کی متفکرانہ لکیروں کا جال بننے لگا۔ وہ بے بس سی لاجواب سی نظر آنے لگی۔

''دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ مگر تم زبردستی کر رہی ہو میرے ساتھ...... روزہ رکھوانے پر اکتفا نہیں کیا۔ اب آرڈر ہے کہ اور بھی بہت سے کام نہ کروں۔ ٹائم کیسے گزرے گا بھلا میرا......؟ جو گزر کر نہیں دے رہا۔''

وہ ہنوز بڑبڑا جھنجلا رہا تھا۔ اتباع کو باقاعدہ ایسے گستاخانہ انداز پر خوف سے جھرجھریاں آنے لگیں۔

''آپ نے ٹھیک کہا دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ اور میں یہ زبردستی نہیں کر رہی۔ آپ کی اصلاح کرنا چاہ رہی ہوں عبداللہ! اس کی وجہ بھی واضح ہے۔ مجھے جنت میں آپ کا ساتھ درکار ہے اور یہ ساتھ آپ کے صالح اعمال ہی دلا سکتے ہیں۔ مجھے آپ کی عاقبت کی خود سے زیادہ فکر ہے۔ اس لیے کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ عبداللہ اہل دل کو علم اور عقل خود بخود نصیب ہو جایا کرتی ہے۔ یہ ان پر اللہ کا خاص کرم اور عنایت ہوتی ہے۔ اللہ نے ہمیں عقل دی اور فیصلہ کرنے کی قوت بھی ودیعت کردی۔ اب ہم پر منحصر ہے کہ ہم اپنے لیے کیا منتخب کرتے ہیں۔

دنیا کی زندگی تو ویسے بھی چند روزہ ہے۔ دائمی زندگی تو وہاں کی ہے جہاں کے لیے ہمیں سعی یہیں رہ کر کرنی پڑے گی۔ یہ ہرگز زیادہ مشقت کا کام نہیں ہے۔ بس تھوڑا سا حوصلہ اور صبر درکار ہے۔ دنیا تو اک سائے کی طرح ہے۔ اس کے پیچھے بھاگیں گے تو کبھی پکڑ میں نہیں آئے گی۔ جبکہ اگر اس سے منہ پھیر لیا جائے یعنی دنیا سے تو یہ پیچھے بھاگتی آئے گی۔ میں جانتی ہوں دین میں زبردستی نہیں ہے۔ میں تو بس تھوڑی سی کوشش کرتی ہوں یعنی اصلاح کی تبلیغ کی اور دعا کرتی ہوں کہ اے بلندیوں کے رب! میرے شوہر کے قدم اپنی جانب پھیر لے۔ اور عبداللہ آپ کو پتا ہے نیکی آرزو نا کام بھی ہو تو نیکی ہے۔ دیکھیں کیسے کیسے فوائد رکھے ہیں ہمارے مہربان رب نے ہمارے لیے...... پھر بھی ہم اس سے بھاگتے پھریں تو حد ہے پھر ہماری بدقسمتی کی......''

وہ مسکراتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ اور عبداللہ اسے دیکھتا سوچتا تھا وہ مسکراتی ہوئی کتنی پیاری لگتی ہے۔ اس کا دھیان اس کی باتوں سے زیادہ اس کی مسکراہٹ پر گہرا تھا۔ توفیق کی بات ہے جس کو جو مل جائے۔ جسے جو عطا ہو جائے جبکہ اتباع اپنی کوشش میں اپنی سعی میں مگن تھی، مگن رہی۔

''میں اللہ سے درخواست کرتی رہتی ہوں اس لیے کہ مجھے پتا ہے یہ میرے اللہ کو پسند ہے۔ میں جانتی ہوں جب ہم اللہ سے درخواست کرتے ہیں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ آپ کوئی درخواست لے کر اللہ کے دربار میں جائیں۔ اس کے پیچھے ہی پڑ جائیں۔ جس طرح بچے اپنے والدین کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ بچوں کی طرح درخواست کریں۔

بلکیں اور اپنی منوا کر ہی چھوڑیں۔ لیکن شرط تو محبت کا اسمِ اعظم ہے۔ حق باہو فرماتے ہیں

باج حصوری نئیں منظوری توڑے پڑھن صلاتاں ہو

روزے نفل نمازاں گزران جاگن ساریاں راتاں ہو

باجھوں قلب حضور نہ ہووے کڈھن سئی زکاتاں ہو

باج منا رب حاصل ہووئے نہ تاثیر مماتاں ہو

بات پھر وہیں آ گئی۔ دشواری اس لیے ہے کہ محبت نہیں ہے۔ محبت قائم کریں۔ محبت نہیں ہوگی تو مشقت ہی مشقت ہے۔ اذیت ہی اذیت ہے۔ اگر محبت سلامت ہے قائم ہے تو پھر مشقت میں بھی راحت کے پہلو نکل سکتے ہیں۔ جب تعلق اللہ سے بندھ جائے تو پھر محفل ہو یا تنہائی، دونوں ٹھیک ہیں۔ اگر اللہ سے تعلق ٹوٹا ہے تو محفل اور تنہائی دونوں عذاب ہیں۔ بابا جان کو اکثر کہتے سنا ہے۔ بہت پیاری لگتی ہے مجھے یہ دعا ''گناہ تاریکی ہے اور اس کے لیے روشنی توبہ ہے۔ اللہ سے بخشش چاہتا ہوں اور اُس سے رجوع کرتا ہوں۔ اور عبداللہ! دعا کا مقام یہ ہے کہ جہاں کوشش نہیں پہنچاتی وہاں دعا پہنچاتی ہے۔''

''عبداللہ اگر یہ راہ مشکل نہیں ہے۔ تو پھر اس راہ پر چلنے کا لطف بھی کہیں اور نہیں ہے۔ اک بار نیت تو کریں چلنے کی اک بار ارادہ تو باندھیں۔ یقین کریں اللہ آپ کے ارادوں کو خود مضبوط کرے گا۔ راہیں خود آسان کرے گا۔''

وہ جیسے التجا کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ عبداللہ نے منہ کھول کر لمبی جمائی لی۔ پھر اسے خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ زبردستی مسکرایا۔

''اوکے فائن! بلکہ شیور! ابھی تو بہت نیند آ رہی ہے۔ سو جاؤں......؟ مانا ٹی وی دیکھنا گناہ ہے مگر روزے میں سونا تو گناہ نہیں۔''

وہ دانت نکال کر کہہ رہا تھا۔ اتباع اب کیا کہتی۔ اتنی ڈھیر ساری باتوں کا اثر نظر نہیں آیا تھا تو مزید کیا کہتی۔ گہرا سانس بھرتی اٹھ گئی۔ عبداللہ لیٹنے کے بعد آنکھوں پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔ بلکہ غافل ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

وہ بالکل اچانک بنا اطلاع کے آیا تھا۔ بہت رات گئے۔ گیٹ چوکیدار نے کھولا۔ رمضان المبارک کا پہلا عشرہ تھا۔ ہر کوئی کمروں میں بند یا تو عبادت میں مشغول تھا یا سو چکا تھا۔ عبدالعلی سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرا نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں ڈوبا تھا۔ اور وہ خود بستر پر محوِ خواب کسی ریاست کی مغرور شہزادی لگتی تھی۔ دواؤں کے زیرِ اثر تقریباً مدہوش، عبدالعلی نے بیگ کاندھے سے اتار پھینکا۔ جوتے موزے کھولتے اس کی نظریں قدر پر تھیں۔

''قدر......!'' اس نے اپنا مضبوط توانا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا۔ کیسا جادوئی اثر تھا اس کے لمس میں کہ بے سدھ پڑی قدر کی آنکھیں مقناطیسی کشش کے زیرِ اثر کھل گئیں۔ عجیب خود فراموشی کی کیفیت میں اسے اچانک سامنے پا کر وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

''علی......عبدالعلی......!'' دماغ غیر حاضر ہوا تھا دل البتہ ضرورت سے زیادہ دھڑک اٹھا تھا اک انوکھی لے پر یہ لے زندگی کی لے تھی۔ اسی دھڑکن کے شور کے ساتھ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بلکہ عبدالعلی کے بازو سے لپٹ گئی آنکھیں یکدم کیسے چھلک گئی تھیں۔

''آپ آ گئے عبدالعلی......؟ آپ میرے پاس ہیں ناں؟'' وہ زارو قطار روتی پوچھے گئی۔ عبدالعلی نے بڑھ کر سارے فاصلے مٹا ڈالے۔

''ایسے بلوا کر بھی پوچھتی ہو آ گیا ہوں۔ کیسے نہ آتا قدر......'' عبدالعلی کا لہجہ بھینچا ہوا تھا۔ درد میں ڈوبا ہوا۔

''مجھے معاف کر دو، بہت دکھ دیا تمہیں۔'' وہ اس کے سر پر ہونٹ رکھ چکا تھا۔ قدر کو زمان و مکان بھولنے لگے۔ زمین و آسمان بھولنے لگے۔ وہ کچھ نہیں بول پائی۔ اب کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

اگلی صبح سحری کے ٹائم ہی سب کو عبدالعلی کی آمد کے متعلق معلوم ہو سکا۔ سب سے زیادہ مطمئن عبدالغنی نظر آئے۔

''بہت اچھا فیصلہ ہے بیٹے! اب قدر بیٹی کی اجازت کے بغیر نہیں جانا۔ اس کی اجازت نہیں دیتا ہے ہمیں مذہب!'' عبدالغنی کی بات پر کل تک بستر پر نڈھال پڑی اب فریش تر و تازہ نظر آتی قدر نے بالخصوص جتانے والی نظروں سے پلٹ کر عبدالعلی کو دیکھا تھا۔ جس کے چہرے پر عجیب سی اضطرابی کیفیت اتر رہی تھی۔

نماز کے بعد عبدالعلی مسجد سے لوٹا تو قدر بالخصوص اس کی وجہ سے جاگ رہی تھی۔ وہ بستر پر آ کے اس کے نزدیک نیم دراز ہوا تو قدر جس نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ اور چہرے پر انگلیاں پھیر پھیر کر نقوش کو محسوس کرتی مسکرا رہی تھی۔ چونک کر اسے تکنے لگی۔ بلکہ خوف زدہ ہو گئی۔

''آپ نے سنا نہیں ماموں جان کیا کہہ رہے تھے کہ ہمارے مذہب......؟''

''میں سب جانتا ہوں، تم بتاؤ تم یہ ثواب نہیں کماؤ گی؟''

قدر لاجواب ہوئی بے بس ہوئی ٹکر ٹکر ہراساں اسے تکنے لگی۔ وہ نماز پڑھ کر آیا تھا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ قدر نے سن رکھا تھا۔ اللہ کا بندہ جسے نماز میں حضوری حاصل ہو نماز سے فارغ ہوتا ہے تو اس کے چہرے پر اللہ کی تجلی و تجمل کا اک خاص نور جھلملاتا ہے۔ اس کا چہرہ ایسا شفاف مسکراہٹ ایسی ملکوتی اور لہجہ ایسا پاکیزہ اور پُراثر ہوتا ہے کہ مخاطب نیاز و تسلیم سے بھیگ جاتا ہے اور اس نور کا سرسری سا اظہار اپنے وجدان پر محسوس کرتا ہے۔ وہ بھی کر رہی تھی اور جیسے اسی کیفیت کے حصار میں جکڑی تھی۔ نماز تو اس نے بھی پڑھی تھی مگر یہ نماز وہ عبدالعلی والی دل سے پڑھی نماز تو نہ تھی۔ اس کے دل میں یار بستا تھا۔ یار کے دل میں رب بستا تھا۔ پھر نمازیں دونوں کی اک جیسی ہو بھی کیسے سکتی تھیں۔ اس نے پڑھا تھا

''جب من مندر ہوتا ہے تو صنم روٹھ جانے کا احتمال بہر طور رہتا ہے۔ اس لیے کہتا ہوں من مسجد بنالو۔ رب تو جلدی اور آسانی سے راضی ہو جاتا ہے ایک فانی انسان کے لیے تیری آنکھوں کے دروازے تو کھل گئے ہیں اور تو زار و قطار رو رہا ہے۔ لیکن کیا اپنے رب کی یاد میں بھی تیرے دل کے کواڑ کھلے ہیں؟ دل میں پریتم بسائے گا تو یہی حال ہوگا۔ اور اگر پروردگار کو بسائے گا تو سدا شاد رہے گا۔''

وہ عجیب سے دکھ سے بھر گئی۔ وہ یہ محبت کہاں سے لاتی۔ جو اس کے دل میں اتر کے ہی نہ دیتی تھی۔ زبردستی کیسے محبت کی جائے؟ وہ خود سے سوال کرتی تھی نہیں جانتی تھی یہ طلب سے ملتی ہے چاہ کرنے سے عطا ہوا کرتی ہے۔

''نبی پاک ﷺ نے فرمایا۔ عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کو عبادت میں لگائے اور موت کے

بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے۔ جبکہ بے وقوف وہ ہے جو اپنے نفس کی پیروی کرے اور اللہ سے امید رکھے۔''

''اکثر لوگ اسی حماقت کا شکار ہیں۔ جبکہ حقیقی یہ ہے کہ کوئی انسان بھلے دنیا کے سارے ہنر سیکھ لے۔ لیکن اگر اس نے اپنے رب کو نہیں پہچانا تو اس نے کچھ نہیں سیکھا۔''

وہ گم صم سا کن بیٹھی تھی۔ عبدالعلی نے اسے بغور دیکھا۔ پھر اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے گویا ہوا تھا۔

''زندگی سے موت تک کے کئی راستے ہیں۔ جس راستے پر بھی جاؤ اس کی راحتیں ہوتی ہیں۔ اس کی کچھ تکلیفیں ہوتی ہیں۔ اس راہ پر کچھ تمغے ہوتے ہیں۔ کچھ قیمتیں بھی چلنے والوں کو ادا کرنی پڑتی ہیں دراصل کوئی راہ اختیار کرلو کسی بھی راستے پر جاؤ راستہ اتنا لمبا ہوتا ہے کہ مسافر کا سانس اکھڑے ہی اکھڑے۔ تو پھر کیوں نہ اللہ کی راہ اختیار کی جائے کہ دونوں جہانوں کی فلاح و کامیابی اسی راستے پر ملتی ہے۔ تم سمجھ رہی ہو میری بات......؟''

عبدالعلی کو آخر کار اس کے پتھر بن جانے والے وجود کا احساس جاگا۔ سوال کرلیا۔ قدر کی ساکن پلکیں لرزیں۔ وہ خالی نظروں سے اسے تکنے لگی۔

''کبھی کبھار مجھے لگتا ہے بہت گمراہ ہوں. بہت گناہگار ہوں۔ مجھے تو اللہ سے محبت کرنا تک نہ آئی۔ اللہ تک پہنچنا نہ آیا۔ اگر میں ایسا کرنا چاہوں تو کیا کروں عبدالعلی؟'' اس کا لہجہ عجیب سی یاس لیے تھا۔ عبدالعلی ایک لمحے کو سہی مگر اس عاجزی اس احساسِ ندامت کے احساس سے بھیگ گیا جو قدر کے انداز سے چھلکتا تھا۔

''اللہ کو پانے کے تین طریقے ہیں۔ ارادہ...... علم...... محبت...... ان سب سے محفوظ ترین راستہ محبت کا ہے۔ اللہ سے پیار پال لیں۔ وہ آپ کو مل جائے گا۔ جو آپ کو پیارا ہے۔ جو بھی اسے اللہ کے لیے وقف کرتے جائیں نہیں بھی حوصلہ اسی معاملے میں خود پر جبر کرلیں، زبردستی کرلیں۔ اک وقت تک یہ کٹھن لگے گا۔ مگر توفیق مانگتے رہنے سے یہ مشکل راحت میں تبدیل ہونا لازم ہے۔

تم یہ نہ سمجھو کہ میں تم پر یہ سب زبردستی اپلائی کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری فیلنگز سمجھتا ہوں جبھی آج تمہارے سامنے ہوں۔ میں جانتا ہوں مرد ہو یا عورت کوئی بھی زندگی کے ہر لمحے میں بہادر نہیں رہ سکتا۔ بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں جو ہمیں کمزور کرتی ہیں اور کمزور لمحوں میں تسلی کے دو الفاظ بولنے والا دل کے بہت قریب ہوجاتا ہے۔ میں نے کمزور لمحوں میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑا۔ کیا یہ کافی نہیں۔''

تم نے محبت کا پوچھا...... محبت کیا ہے اس کے متعلق لوگوں نے اپنے اپنے اندازے بیان کیے مگر میں سمجھتا ہوں کسی کو بھی حتمی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ خالق کا ایک ایسا راز ہے جس کا سراغ لگانے کو مخلوق کے پاؤں شل ہوگئے مگر نہیں کھلتا اور جب تک بھید بھید رہتا ہے جستجو ختم نہیں ہوسکتی۔ ازل سے ابد تک کا سفر اسی جستجو پر محیط ہے۔ کوئی بھی نہیں جان سکتا محبت کیا ہے۔ ایک روپ کا کھوج لگانے نکلیں تو آزمائش اور محبت میں مبتلا کردیا جاتا ہے۔

میں محبت کی کیا تعریف کروں۔ میں ناقص العقل عام سا انسان ہوں۔ خدا جانے یہ زمین سے پھوٹی ہے یا آسمان سے برسی تھی۔ بس مجھے

اتنا پتا ہے کہ یہ کائنات کے ذرے ذرے کا وجود محبت کے مرہونِ منت ہے۔ خدا خود محبت ہے اور اُس کی ہر تخلیق کا باعث محبت ہے۔ اسی محبت کا باعث ہے کہ رب نہیں چاہتا ہم محض لذت حاصل کرنے کی خاطر گناہ کریں کہ لذت تو ختم ہو جائے گی۔ گناہ باقی رہ جائے گا۔ اور مشقت سے بچنے کی خاطر ہمیں کبھی نیکی سے اجتناب نہیں برتنا چاہیے کہ مشقت ختم ہو جائے گی نیکی قائم دائم رہے گی۔

''ٹھیک ہے عبدالعلی...... آپ جب چاہیں واپس چلے جائیں۔ میں آپ کو کبھی نہیں روکوں گی۔'' ابھی عبدالعلی مزید کچھ کہتا۔ مگر وہ جو کب کی خاموش تھی۔ ایکدم بولی۔ ایکدم اٹھی اور باہر نکل گئی۔ عبدالعلی یکدم ساکن رہ گیا۔ قطعی سمجھ نہ پایا۔ اس نے ایسا کیوں کیا کس کیفیت کے زیرِ اثر کیا۔

☆......☆......☆

حقیقت یہی ہے کہ سچ دل میں اتر جاتا ہے مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ سچ دل میں اترنے کے لیے دل کا سچا ہونا بھی ضروری ہے۔ قرآنِ پاک سرچشمہ ہدایت ہے مگر یہ سب پر ایک سا اثر نہیں کرتا۔ یہ انہی پر الحمدللہ اثر کرتا ہے جن کے دل پاک ہیں۔ قرآن کی روح محبت ہے۔ جو اسے دل جھکا کر پڑھے گا اسے اللہ بڑھ کر تھام لے گا۔ جو ابرو تان کر پڑھے گا وہ نہیں جھکے گا تو اسے توڑ دیا جائے گا۔ قرآن ہر اس دل کے لیے راحت ہے۔ جو راحت کا متلاشی ہے ہر اس دل کے لیے مرہم ہے جو زخم خوردہ ہے۔ ہر اس شخص کا ساتھی ہے جو اکیلا ہے۔ اس میں وہ کاؤنسلنگ ہے جو دنیا کے بڑا سے بڑا کاؤنسلر بھی نہیں کر سکتا۔ الحمدللہ جس دل میں قرآن کی محبت آجائے اللہ پاک دراصل اسی کو اپنی محبت کے لیے چن لیتے ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کے دلوں کو پاک کر دے۔

وہ ساکت بیٹھا سن رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا اور ایمان لا چکا تھا۔ کیا شک تھا۔ کوئی شک ہی تو نہ تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ زخم خودہ تھا۔ سکون کا متلاشی بھی تھا۔ اسے اکیلا نہیں رہنے دیا گیا۔ رب کا جسے ساتھ مل جائے اسے اور کیا چاہیے۔ اس کے سب زخم بھر دیے گئے۔ اب دل میں کسک تھی نہ درد تھا۔ اک سکون بالآخر مل گیا تھا کہ علم عشق اور آگاہی جب کسی خاکی پیکر میں بسیرا کر لیتے ہیں تو پھر اس خاکی پیکر کو مرکزیت کے ساتھ جڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور مرکزیت سے جڑنے کا مطلب ہے تعلق باللہ! وہ چل نہیں سکا۔ لاکھ علاج معالجے کے باوجود...... کتنا دکھی ہوتا رہا۔ کیوں اس کے ساتھ ہی ایسا ہوا۔ کیوں صرف وہی محروم کر دیا گیا۔ آخر کیا مصلحت تھی۔ پھر اسے امن کی محبت کا علم ہوا۔ امن سے از خود محبت بھی ہوگئی۔ مگر وہ چاہنے کے باوجود اسے پانے کا حوصلہ نہ کرسکا۔

حالات بدلے اس نے ہتھیار پھینک دیے۔ مگر امن نے انکار کر ڈالا۔ تب تک ارسل کو لگا محبت اس مقام پر جا پہنچی تھی وصل نصیب نہ ٹھہرا تو موت واقع ہو جائے گی۔ وصل نصیب نہ ٹھہرا اور لحہ لحہ موت کی اذیت نصیب ٹھہر گئی۔ وہ پھر شکوہ کیے بغیر نہ رہا۔ آخر اس کے ساتھ ہی ایسا کیوں ......؟ یہ اللہ کا فضل تھا اور عبدالغنی جیسے بردبار شخص کی محبت کہ بالآخر اللہ نے اسے سمجھا دیا۔ یہ محرومیاں کیا انعام عطا ہونے کے باعث اس پر مسلط کی گئی تھیں۔ اس نے اب جانا عشق کیوں انسان کو کائنات کے دوسرے حصے میں لے جاتا ہے۔ زمین پر رہنے کیوں نہیں دیتا۔ اس نے امن

کے انکار پر کتنی بے بسی سے اس سے گزارش کی تھی۔

''ایسا نہ کرو امن! میں تمہاری یہ بے رخی سہہ نہ پاؤں گا۔ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ شاید میں بہت کمزور بہت بزدل ہوں اس لیے۔'' جواباً وہ کتنی پُرسکون۔

''برداشت کریں گے تو کر سکیں گے ارسل احمد! اور برداشت ہرگز بزدلی نہیں کہ اس سے بھاگنا ضروری ہو۔ دل میں برداشت پیدا کر لیں تاکہ آپ کبھی ہار نہ سکیں۔''

اور وہ چپ رہ گیا تھا۔ ہاں یہ عہد ضرور باندھا وہ برداشت سے کبھی مفر حاصل نہ کرے گا۔ آج وہ نواز دیا گیا تھا۔ اس نے سکھ گننا شروع کر دیے تھے۔ دکھوں سے صرف نظر کرتے ہوئے۔ بڑا افاقہ ہوا تھا اس صرف نظر سے۔

نور وہ ہوتا ہے۔ جو اندھیری سرنگ کے دوسرے سرے پر نظر آتا ہے۔ گویا کسی پہاڑ سے گرتا پگھلتے سونے کا چشمہ ہو اور یہ نور ملتا کیسے ہے؟ جو اللہ کی جتنی مانتا ہو۔ اسے اتنا ہی نور ملتا ہے اگر بہت زیادہ نور چاہتے ہو تو اللہ کو نہ کہنا چھوڑ دو۔ اگر اللہ کو منانا ہے تو خود کو تو نظر انداز کرنا پڑے گا۔ خود کو مارنا ہی شرط ٹھہری ہے اس کام کی۔ بھلے چوٹ کھا کر زخم سہہ کر سہی مگر تسلیم و رضا پر آنا لازم ٹھہرا ہے۔ اس نے اللہ سے رجوع کر لیا۔

تب جانا کہ دکھ بھری داستان کو اللہ دھیان سے سنتا ہے۔ کچھ غم مٹا بھی دیتا ہے۔ اس کے بھی مٹا دیے۔ کچھ اُلجھنیں سلجھا بھی دیتا ہے۔ اس کی بھی سلجھا دیں لیکن ساری نہیں۔

دراصل ساری ہی اُلجھنیں سلجھ جائیں تو خالق اور بندے میں بات چیت بند ہو جانے کا خدشہ ہے۔ اللہ خود ہی مصیبت بھی بھیجتا ہے اور خود ہی ثالث بھی بن جاتا ہے۔ اگر زندگی میں راحت ہی راحت ہو چین ہی چین ہو تو کون اُس کا در کھٹکھٹائے۔ کون اُس سے باتیں کرے۔ دوسرے لفظوں میں عاقبت و دنیا خراب کرے، یہی گوارا نہیں ہے اُس کو اس کی محبت کو اور ارسل کو یہ محبت محبت کا یہ ہی رنگ بھا گیا تھا۔ اس نے اپنی حیثیت پہچان لی اوقات تسلیم کر لی۔

اس نے اب جانا بادشاہوں نے بادشاہی چھوڑ کر درویشی کیونکر اختیار کی ہوگی۔ یا اگر کوئی درویش بادشاہ بننے پر آمادہ نہ ہوا تو کیوں نہ ہوا۔ غم کا احساس بھی روح کو تہذیب سکھا دیتا ہے۔ اسے اس غم کے احساس نے پہچان دی تھی۔

☆......☆......☆

سورۃ مریم تو روز پڑھ رہی ہو نا بیٹے! میں نے کہا تھا پریگننسی میں روز سورۃ مریم کی تلاوت، استغفار اور درود شریف اپنا معمول بنا لینا۔ اللہ پاک تم پر فضل فرمائے گا۔ جیسے آج کل مار پڑ گئی ہے ڈاکٹرز کو...... نارمل کیس کو بھی آپریشن میں بدل دیتے ہیں۔ صرف اپنا پیسہ کھرا کرنے کو جو بے حیائی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ جو گناہ کیا جا رہا ہے غیر محرم ڈاکٹرز کے سامنے عورت کے پردے اتار کر اس کی کسی کو فکر نہیں۔ اللہ معاف فرمائے۔ رحم فرمائے۔ بس بیٹے تم باقاعدگی سے پڑھتی رہو۔ اتباع اور قدر کو بھی وقتاً فوقتاً یہی نصیحت کرتی رہی ہوں۔''

بریرہ فون پر امن سے محوِ کلام تھیں۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ خود بخود بجھ کر رہ گئی تھیں۔ امن کی ازدواجی زندگی کی بے سکونی و اضطراب کہے بغیر اس کے چہرے سے چھلکتا تھا۔ اور بریرہ پچھتاتی تھیں کیسا غلط فیصلہ کر بیٹھیں وہ

بھی......"

"آپ فکر نہ کریں ماما! سب ٹھیک ہے۔ یہ وظائف بھی میرا معمول ہیں۔" امن ہر پل ہر لمحہ انہیں مطمئن کرنے کو سب ٹھیک کا جتنا بھی پرچار کرتی انہیں یقین آ کر نہیں دیتا تھا۔

"دائم کیسا ہے......؟ کچھ خیال کرتا ہے اب تمہارا یا......؟" وہ ٹھیک ہیں ماما! انہیں بچوں کا بہت شوق ہے۔ بچے بہت بڑی کمزوری ہیں ان کی ابھی سے دن گن رہے ہیں بعد میں رویہ اور بہتر ہو جائے گا مجھے یقین ہے۔"

وہ ماں کا دل رکھنے کو مسکرایا کرتی۔ بریرہ سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔ ان کا فون بند ہوا تو امن نے آنکھوں میں مچلتی نمی کو ہاتھ سے رگڑ کر پونچھتے گہرا سانس بھرا۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ دائم کی اس پر سختی بڑھ گئی ہے۔ اٹھا ہوا ہاتھ تھپڑ کی بجائے ہنٹر برسانے لگا ہے۔ زبان سے صرف تضحیک کے الفاظ نکلتے ہیں۔ مگر وہ حوصلے کا صبر کا دامن کیسے چھوڑ دیتی۔ جبکہ وہ ہر دعا میں اعتراف کرتی تھی۔

"مجھے اللہ ہی کافی ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے اُس پر بھروسا کیا اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔"

وہ یہ بھی پڑھ چکی تھی کہ رب بڑی شرم بڑے کرم والا ہے۔ اُس کو اس بات سے شرم ہے کہ اُس کا بندہ اُس کے آگے ہاتھ پھیلائے اور وہ اسے خالی لوٹا دے وہ اگر ہاتھ پھیلانے والی تھی۔ تو پھر اُس کے رب سے بڑھ کر کوئی شرم اور کرم والا بھی نہ تھا۔ دعا کو بالآخر قبول ہو جانا تھا۔ حالات سدھر جانے تھے۔ وہ کیسے راستہ بدل لیتی۔ وہ راستہ نہیں بدل سکتی تھی کہ اس نے سجدے کی عادت اپنائی تھی۔ جو کبھی ناکام نہیں ہونے دیتی۔ جانتی تھی غم اور پریشانی کو سجدے میں درخواست کر کے ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ حدیث مبارکہ کے مطابق سجدے میں ہی بندہ رب سے سب سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے۔ کامیاب وہی ہے جو نہ صرف پیشانی کے سجدے کرنے والا بلکہ ہر حال میں اللہ کے آگے جھکنے والا ہو۔ اور رب رحمٰن ہے رحیم ہے۔ تو کیا وہ غم کے وقت رب کو رحمٰن اور رحیم سمجھنا ماننا چھوڑ دے، ایسا ہی تو نہیں تھا۔ وہ ایسا ہی تو نہیں سمجھتی تھی۔ اسے غم و آلات میں بھی رب رحمٰن و رحیم ہی لگتا تھا۔ جبھی شانت تھی۔ آسودہ تھی، مگن تھی۔

☆......☆......☆

دونوں کے درمیان کیا وجہ اختلاف ہوئی پتا نہیں چل سکا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اتباع ناراضی کے واضح اظہار کے طور پر عبداللہ کا گھر چھوڑ کر واپس میکے چلی آئی۔ ایک دن دو دن کتنے دن جب واپس جانے کا نام لیا نہ عبداللہ نے خیر خبر لی۔ تب لاریب کو تشویش لاحق ہوئی۔ بریرہ سے کیا پوچھتے کہ وہ دونوں تو عمرہ ادا کرنے پھر سے جا چکے تھے۔ انہوں نے اتباع سے پوچھنے سے قبل عبداللہ سے رابطہ کرنا چاہا مگر نمبر بند جا رہا تھا۔ ان کی تشویش میں بے پناہ اضافہ ہونے لگا۔

"تم خیریت سے نہیں آئیں یہ تو جان سکتی ہوں میں۔ مگر وجہ اتنی گھمبیر ہے کہ تم یا عبداللہ بتانا بھی پسند نہیں کرتے......؟"

انہیں غصہ آ رہا تھا مگر خود پر بہت کنٹرول کر رہی تھیں۔ اتباع قدرے گھبرا گئی۔ اس نے بہت کم انہیں ایسے خفگی سے بات کرتے دیکھا تھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے مما!"

"جو بھی ہے مجھے بتا دو۔" ان کا لہجہ سرد تھا۔

اتباع ایکدم خاموش ہوئی۔

"شادی سے قبل میں نے عبداللہ سے کہا تھا۔

وہ سوچ لیں۔ میرے اور ان کے مزاج اور سوچوں میں بہت فرق تھا۔ ہم اکٹھے چل ہی نہیں سکتے تھے۔ سوچوں کا تصادم ہمیں زیادہ دیر اکٹھا نہ رکھ پاتا۔ وہی ہوا، ان کی پسند ترجیحات بدل رہی ہیں۔ اماں وہ مجھ سے مختلف تقاضے کر رہے ہیں۔ یعنی میں بالوں کی کٹنگ کرواؤں اور دیگر بھی اور بہت کچھ جو اسلام میں جائز نہیں...... اماں...... وہ غیر لڑکیوں کو دیکھنا گناہ نہیں سمجھتے۔ ایسے گمراہ انسان سے میں کیسے نبھاہ کر سکتی ہوں۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ لاریب جو سکتے میں بیٹھی تھیں۔ اسے کچھ دیر اسی صدمے کی کیفیت میں تکتی رہیں۔ اتباع آنسو پونچھ رہی تھی۔

''کیا تم نے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے؟'' وہ خاصی تاخیر سے خاصے شاک میں بولیں۔ اتباع خاموش رہی۔ پھر سر کو نفی میں ہلایا۔

''نہیں...... مگر میں چاہتی ہوں وہ پہلے اپنی اصلاح کریں۔ پھر میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔'' اس نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔ لاریب نے گہرا متاسفانہ سانس کھینچا۔

''تمہیں بتا تو رکھا ہوگا اتباع میں نے متعدد بار بار رکھا ہے کہ جب میری شادی تمہارے بابا سے ہوئی میں کیسی تھی؟ اب کیسی ہوں یہ تم نے دیکھ لیا۔ تبدیلی تدریج آیا کرتی ہے۔ اس کے لیے بہت تحمل اور برداشت چاہیے ہوتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کے اہم ضرورت عجز وانکساری کی ہے کہ آپ خود کو برتر نہ سمجھ رہے ہوں۔ جہاں برتری کا ذرہ بھی آپ کے دل میں آیا کام وہیں پہ خراب ہو جاتا ہے۔ اگر ان کئی مہینوں میں تم عبداللہ کو کامیابی سے ٹریٹ کرتی آئی ہو تو اب کیا ہوا کہ یہ کام خراب ہونے لگا۔ اتباع یہ تکبر کے سوا مجھے اور کچھ نہیں لگتا۔ ایک واقعہ سناتی ہوں۔ غور ضرور کرنا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم جو بہت اونچے درجے کے ولی اللہ تھے۔ آپ ایک جگہ کھیت میں پگڈنڈی پر جا رہے تھے۔ اس پگڈنڈی پر سامنے سے ایک کتا آ گیا۔ وہ پگڈنڈی اتنی پتلی تھی کہ ایک وقت میں ایک شخص گزر سکتا تھا۔ آپ اس انتظار میں تھے کہ یہ کتا نیچے اترے اور راستہ دے تو میں جاؤں اور کتا اس انتظار میں تھا کہ یہ اتر جائیں تو میں آگے بڑھوں۔

اب یہ دونوں کشمکش میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان بزرگ نے دل ہی دل میں اس کتے کو مخاطب کر کے کہا۔ تُو تو ایک کتا ہے تو پاکی و ناپاکی حرام وحلال کا مکلف نہیں ہے۔ تو اگر نیچے اتر جائے گا تو تیرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ لیکن میں اگر نیچے اتر جاؤں گا تو میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ بدن ناپاک ہو جائے گا اور غسل کرنا پڑے گا۔ لیکن پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد ان کے دل میں یہ بات آئی کہ مجھے نیچے اتر جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ نیچے کیچڑ میں اتر گئے اور کتا گزر گیا۔

آپ دوبارہ پگڈنڈی پر آ گئے اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ کتا کھڑا ہوا آپ کو دیکھ رہا تھا۔ شاہ صاحب سوچنے لگے یہ کیوں کھڑا ہوا ہے اور کیا سوچ رہا ہے۔ اس وقت یہ بات اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں ڈالی کہ یہ کتا آپ سے کہہ رہا ہے۔

''اے شاہ عبدالرحیم! نیچے اترنے سے تم بڑی مصیبت سے بچ گئے۔ اس وقت تو تمہارے کپڑے اور بدن ناپاک ہو گیا ہے۔ تین مرتبہ دھوؤ گے تو پاک ہو جاؤ گے۔ لیکن اگر تم اس خیال کی وجہ سے نہ اترتے کہ میں انسان ہوں اور یہ کتا ہے تو اس وقت تمہارا دل تکبر کی وجہ سے نجس

ہو جاتا۔ پھر سات سمندروں کے پانی سے بھی یہ نجاست دور نہیں کی جاسکتی تھی۔"

یہ تکبر ایسی خوفناک بیماری ہے بیٹے! اب تم خود فیصلہ کرو۔ اگر کتے کے برابر انسان کو یہ سوچنے کی اجازت نہیں تو ایک انسان کو وہ کیسے خود سے کمتر اور کم درجے پر سمجھ کر کوئی ایسی بات سوچ سکتا ہے۔ اگر تمہارے دل میں ایسا کوئی خیال پیدا ہوا بھی ہے تو توبہ کرو۔ اصلاح جاری رکھو۔ اپنا فرض نبھاتی رہو۔ باقی ہدایت دینا اللہ کے ذمے ہے۔ اسے اللہ کے ذمے رہنے دو۔ بیٹے غور سے سن لو۔ خود پر کبھی ناز نہ کرو۔ ہم انسان ہیں انسان یعنی بندہ تو گندا ہے۔ اس کی سرشت میں ہی نافرمانی ضد کرید لڑائی، شک، حرص اور سرکشی کے ذرات کم و بیش کے ساتھ موجود رہتے ہیں۔ یہ خدا سے زیادہ نزدیک تب ہوتا ہے جب اپنے نیک اعمال پر اتراتا نہیں۔ بلکہ اس سے اپنا فضل و کرم مانگتا ہے۔ تم اس کی غلط باتیں نہ مانو...... یعنی اللہ کے احکام کے خلاف نہ چلو۔ چاہے عبداللہ جتنا مرضی جبر کرے، البتہ باقی حقوق اس کے ادا کرو اور اسے سمجھاتی بھی رہو۔ بس یہی ذمہ داری ہے تمہاری۔"

اتباع ایکدم شرمسار خفت زدہ نظر آنے لگی تھی۔ لاریب نے محسوس کیا جبھی اس کا گال تھپتھپایا۔

"بیٹے ہمارے معاشرے کی ایک بہت خراب عادت محسوس کرتی ہوں میں کہ جب عورت اپنے مرد کی کوئی خراب عادت دور کرنے کی کوشش میں ناکام رہتی ہے تو یہ کہتی ہے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ماں کا جب بچے کی شرارت یا بدتمیزی پر بس نہیں چلتا تو ماں یہ کہہ کر جان چھڑانے لگتی ہے کہ بچے ایسے ہی کرتے ہیں۔ مرد جب عورت کی بداخلاقی یا بری عادت کے سامنے ہار جاتا ہے تو کہتا ہے عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ یہ اعلان کرکے وہ پتا نہیں خود بری ذمہ ہو رہے ہوتے ہیں یا اپنی شرمندگی و ناکامی چھپا رہے ہوتے ہیں۔ یا پھر اپنے بجائے معاشرے کو اس بگاڑ کا ذمہ دار ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔

کچھ بھی ہو مگر یہ تو طے ہے کہ آپ اس بودے بہانے سے اپنے آپ کو اطمینان نہیں بخش سکتے۔ کیونکہ اگر یہ سب مان بھی لیا جائے کہ یہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تو پھر اگلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا یہ ایسے ہی ہونا چاہیے۔ کیا ایسے ہونا ٹھیک ہے؟ اگر نہیں تو پھر ایسے کیوں نہیں ہیں۔ یہ سارے سوال ہمیں دھکیل کر پھر پہلے سرے پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ چنانچہ اطمینان غلطی مان لینے اور اس کو سدھارتے رہنے کی کوشش کرتے رہنے میں ہی ہے۔ اور جب آپ نے غلطی تسلیم کرلی اور اس کو درست کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔ تو پھر سب سے پہلے آپ خود اپنے آپ کو درست کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ خود کو پہلے سدھاریں۔ جب آپ نے خود کو درست کرلیا تو پھر ہی آپ میں وہ قوت پیدا ہوگی کہ کسی دوسرے کو بھی درست راستہ دکھاسکیں۔"

اسی شام جب وہ عبداللہ کے سامنے بیٹھی تھی تو وہی ناراضگی پھر ان کے چہرے پر نظر آرہی تھی جو اتباع کے لیے انہوں نے ظاہر کی تھی۔

"اتباع کو آپ سے جو شکایتیں ہیں۔ انہوں نے مجھے تکلیف دی ہے بہت بیٹے! آپ کو کیا معلوم نہ تھا کہ اتباع کسی مزاج کی بچی ہے۔ سب نے آپ کو سمجھایا تھا۔ مگر آپ تب ہر صورت اس شادی پر تلے تھے۔ پھر اب کیا ہوا ہے؟"

"بوجانی! میں نے محض اک فرمائش کی تھی۔

ضروری نہیں تھا پورا کیا جاتا۔ مگر اتباع کو غصہ پتا نہیں کس بات پر تھا۔ یہ تو بہانہ بنایا اس نے لڑائی کا۔'' وہ خود بھرا بیٹھا تھا جیسے۔ لاریب نے گہرا سانس بھر کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''جو اعتراض اسے ہے۔ وہ صرف اسے ہی تو نہیں ہے۔ اللہ کو بھی بہت بڑا اعتراض ہے اس بات پہ...... جب اللہ نے غیر محرم کو دیکھنا چھونا حرام کر دیا تو پھر خواہ مخواہ کیا ضرورت ہے گناہ مول لینے کی......؟ کیا آپ کی بیوی حسین نہیں ہے؟ نہ بھی ہو اللہ کا خوف ایسا ہونا چاہیے کہ آپ اس گناہ سے اجتناب برتو۔''

عبداللہ کو کہاں گمان تھا کہ لاریب اسے اس نازک موضوع پر بھی گرفت کر کے نصیحت کریں گی۔ وہ یکلخت خفت سے سرخ پڑ گیا۔ کچھ بول ہی نہ سکا تھا جیسے۔

''دیکھو بیٹے! اسلام میں عورتوں کے ساتھ مردوں کے بھی واضح احکام موجود ہیں۔ خصوصاً سورۃ نور اور احزاب میں یہ ساری باتیں بہت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ آج کے مسلمان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ پیدائشی مسلمان ہو کر سمجھتا ہے بس وہ مومن بھی ہو گیا۔ حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ سورۃ نور کی آیت نمبر 30 میں سب سے پہلے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

''یعنی مسلمان مردوں سے کہو اپنی نگاہیں نیچے رکھیں۔'' کیونکہ بگاڑ ان آنکھوں سے ہی تو شروع ہوتا ہے۔

اک بات طے شدہ ہے کہ صنفِ نازک کی طرف دل کھنچتا ہی آیا ہے۔ اور یہ کوئی اتنی غیر حقیقی بات نہیں۔ کیونکہ عورت کو خدا نے مرد کی پسلی سے پیدا فرمایا۔ انسانی وجود فطری طور پر اپنے وجود کے گمشدہ حصے کی تلاش میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انسان پاگلوں کی طرح اسی تلاش میں سرگرداں ہو جائے۔ ایک جذبہ جو بالکل فطری ہے اسے شیطانی کوسوسوں نے غیر فطری کر دیا ہے۔ اب یہ تو ہماری ذمہ داری ہے ناں کہ ہم اپنی آنکھوں اپنے نفس کی حفاظت کریں۔ ہمیشہ یاد رکھو...... اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ عورت کا قصور ہے وہ کیوں بن سنور کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ تو مت بھولو کہ قیامت کے دن تم سے تمہارے اعمال کا سوال ہو گا نہ عورت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ تو فکر اصل میں اپنے اعمال کی ہونی چاہیے۔

دل پہ جما زنگ ہمیں خود اتارنا ہے۔ اسے رگڑنا پڑے گا۔ اسے رگڑنے کے لیے اس پر بھی غور لازم ہے کہ گھر میں طاق میں پڑے قرآن کریم پر جمی گرد کتنی ہے۔ یعنی ہماری اس سے غفلت کتنی ہے۔ قرآن میں نماز میں دل لگاؤ۔ ان خرافات کا خیال خود بخود دفع ہو جائے گا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

دنیا کے شاعروں کا دیوان پڑھ کے دیکھو
پھر اس کے بعد رب کا قرآن پڑھ کے دیکھو
آنکھیں بھی ہوں گی روشن دل بھی بنے گا گلشن
تم بس اک سورۃ رحمٰن پڑھ کے دیکھو

''بیشک آپ نے ٹھیک کہا مما! مگر انہیں تو میں بھی اکثر ایسی باتیں سمجھاتی رہتی ہوں۔ مگر......''

''مگر میں سمجھتا نہیں۔''

عبداللہ نے اس پل وہاں آ کر بیٹھنے اور مداخلت کرنے والی اتباع کو گھور کر دیکھا۔ اتباع نے کاندھے اُچکا دیے۔ انداز میں شرارت تھی۔ پھر بڑے مودب انداز میں اسے چائے پیش کی۔

''پی لیں، روزہ تو رکھا نہیں ہو گا۔''

وہ جان کر اسے چھیڑ رہی تھی۔ عبداللہ نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا پھر لاریب کی سمت متوجہ ہو گیا۔

''بوجان! یہ ہر وقت ایسے ہی مجھے عاجز کرتی ہے۔ وہ بھی دانستہ......'' لاریب محض مسکرا دیں۔ تو

عبداللہ نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر محبت سے دبایا تھا۔

''میں نے یہ حرکت ضرور کی تھی ببو! مگر اتباع کو چڑانے کی خاطر ہی...... مگر آئندہ انشاء اللہ ایسا بھی نہیں ہوگا۔''

''جیتے رہو بیٹے! اللہ پاک نیکی کی توفیق دے، آمین۔'' وہ خوش ہوگئی تھیں۔

''تمہارا عالم فاضلہ کا کورس کب مکمل ہوگا۔'' وہ لوگ واپس آنے کو گاڑی میں بیٹھ گئے تو عبداللہ کے سوال پر اتباع نے چونک کر اسے دیکھا۔

''مکمل ہو چکا ہے کب کا، کیوں؟''

''تو پھر تم باقاعدہ پڑھانا شروع کردو۔ آن لائن کلاسز کے لیے سارا نیٹ ورک مکمل ہو چکا ہے۔ عبدالعلی کی نگرانی میں۔ میری طرف سے بھی تمہیں پوری اجازت ہے۔''

اتباع اسے دیکھتی رہ گئی۔ آنکھیں نمی سمیٹ لائیں۔ وہ کتنا اچھا تھا۔ ہمیشہ اسے حیران کردیا کرتا اپنی محبت کے مظاہروں سے، وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

''ایک شاگرد بہت نالائق نااہل ہے۔ اسے سب سے زیادہ تمہاری توجہ کی ضرورت ہوگی، دوگی......؟'' وہ سوال کررہا تھا۔ اتباع سرہلانے لگی۔

''کیوں نہیں، ہے کون......؟''

''خاکسار آپ کے سامنے ہے۔'' وہ سرجھکا کر شرارت سے بولا۔ اتباع کو یقین نہ آسکا۔

''واقعی......؟ کیا واقعی عبداللہ؟'' عبداللہ نے محض سرہلایا تھا۔ پھر گہرا سانس بھرا۔

''یہ ایک سعی ہے اتباع! دعا کرنا اللہ قبول فرمائے۔''

''آمین۔'' وہ دل کی آمادگی سے بولی اور آسودگی سے مسکرانے لگی۔ اللہ کو اس نے اپنے معاملے میں ہمیشہ بہت رحیم وکریم پایا تھا۔ آج رب اسے اپنے لیے کچھ زیادہ مہربان زیادہ پیار کرنے والا لگا۔ ہر مسئلہ کس حسن اسلوبی سے طے پایا تھا۔ سجدہ شکر تو لازم تھا۔

چھٹیاں ختم ہوگئیں۔ عبدالعلی کے پھر سے واپس جانے کا وقت قریب آ گیا۔ گو کہ قدر اجازت دے چکی تھی۔ مگر اس بے کلی کا کیا کرتی جو چین لینے نہ دیتی تھی۔ یہی اضطراب یہی بے کلی یہی بے سکونی وجہ بنی اور سیڑھیاں اترتے جانے کیسے پیر پھسل گیا۔

اس کے حلق سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ جب تک عبیر کی نگاہ ادھر آتے اس پر گئی۔ وہ تو اپنے ہی خون میں سرتاپا ڈوب چکی تھی۔ گھبراہٹ وحشت کا ایسا ریلا اٹھا کہ جس نے پورے گھر کو لپیٹ میں لے لیا۔ عبدالعلی کیسی پریشانی میں اسے لے کر ہاسپٹل دوڑا تھا۔ اب پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ آئی سی یو میں تھی اور باہر موجود لاریب عبدالعلی اور عبدالغنی کے لیے جیسے وقت ٹھہر گیا تھا۔ منجمد ہوگیا تھا۔ ایک ایک لمحہ بھی رینگ رینگ کر گزرتا تھا۔ خوف اور واہموں میں ڈوبے لمحے عبدالعلی کی سانسیں پاتال میں گرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خوف ہی خوف نظر آرہا تھا۔ رواں رواں دعا گو تھا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ اکیلی رہنا نہیں چاہتی تھی۔ ہر حربہ آزما رہی تھی۔ اس پر اثر نہ دیکھ کر کیسے بے چارگی اور افسردگی و مایوسی میں گھرنے لگی تھی۔

آنسوؤں کا اثر نہ دیکھ کر ہی اس نے کہا تھا۔ عبدالعلی کے بیشک دل کو کچھ ہوا مگر دانستہ نظر انداز کیے رکھا تو قدر جھنجلاہٹ کا شکار ہونے لگی۔

اسے کہو کہ اک نظر دیکھ لے
شاید کہ میں مرنے والی ہوں

''قدر......!'' وہ غصے میں بالآخر چیخ پڑا۔ جبکہ اس کے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔

گواہ رہنا وہ روئیں گے بہت

ہمیں ایک بار تو مر جانے دو
عبدالعلی کا دل ہی تھا۔ پتھر نہیں، کہاں تک سختی برتتا، بالآخر پگھل گیا۔

''پاگل ہو......'' اس نے قدر کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ وہ زاروقطار روئے گئی۔

''راز کی بات بتاؤ۔ موت پہ اتنے شعر کہاں سے اکٹھے کر لیے۔'' وہ ہنس رہا تھا۔ مقصد اس کا دھیان بٹانا تھا مگر اس کا دھیان نہیں بٹ سکا، بلکہ وہ مزید بکھر گئی۔

''اب تو دل کر رہا ہے عبدالعلی! واقعی مر جاؤں۔ آپ کو ایسا دکھ دوں کہ ساری عمر پچھتاتے رہیں۔'' عبدالغنی نے آ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ تو آنکھوں میں ٹھہر جانے والے آنسو بہہ نکلے۔ گلیشیئر پگھل گئے۔

''بابا جان......! اسے کہیں ایسے نہ کرے۔'' ان کے گلے لگتا وہ بے اختیار سسک اٹھا۔ عبدالعلی نے محض اس کا کاندھا تھپکا۔ وہ اسے کیا بتاتے وہ خود کس کرب سے دوچار تھے۔ وہ صرف بیٹے کی خوشی اور گھر کی آبادی کا باعث نہ تھی۔ ان کی پیاری بہن کی لختِ جگر تھی۔ دل کا سکون تھی۔ واحد خوشی تھی۔

''اللہ کرم کرے گا بیٹے! فکر نہ کرو۔'' انہوں نے بکھرتے بیٹے کو تسلی سے نوازا۔ تب ہی دروازہ کھلا اور ڈاکٹر باہر آ گئی تو سب گویا اپنی اپنی جگہ پہ منجمد ہو گئے۔ آپریشن تھیٹر کے دروازے پر جلتی سرخ لائٹ بجھ گئی تھی۔ خوف ان کے قدموں کو ان کے دلوں کو مضبوطی سے جکڑے ساکن کھڑا تھا۔ عبدالعلی کی بے تاب استفہامیہ نگاہیں ڈاکٹر کے چہرے پر جم گئیں۔ دل دھڑکنا بھول چکا تھا۔ کچھ بھی برا سوچتے اس کی سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔

''کیس بہت بگڑ چکا تھا۔ ہمیں تو کوئی امید نہیں تھی مگر سمجھ لیں معجزہ ہوا......'' ڈاکٹر اور بھی کچھ کہہ رہی تھی۔ عبدالعلی کی جانے کب کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔ وہ وہیں دیوار کے سہارے بیٹھتا چلا گیا۔ دل تو سجدہ ریز تھا ہی سر بھی سجدے میں بے اختیار جھکتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ آنکھوں میں ہنوز تشویش لیے۔ قدر کی نظریں اس کے بجائے بچے پر تھیں۔ جو ہو بہو عبدالعلی کی کاپی تھا۔ اس کا عکس، وقت جیسے کئی سال پیچھے جا چکا تھا۔

''روکنے کا یہ طریقہ تو بالکل مہذبانہ نہیں کہلا سکتا قدر! اپنی ہی جان پہ کھیل گئی تم...... اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو......''

وہ بالآخر بول پڑا تھا۔ قدر نے اب کے نگاہ بھر کے اسے دیکھا۔ چہرے پر ابھی بھی نقاہت تھی۔ مگر ممتا کا عکس ممتا کی گرمی کا بھی احساس جھلمل کرتا تھا۔ وہ اس روپ میں انوکھی بہت معصوم لگتی تھی۔ عبدالعلی کو احساس ہوا صرف وہی تو اس کے لیے دیوانی نہیں ہوئی۔ عبدالعلی کو بھی لگنے لگا تھا اب قدر کے بغیر رہنا مشکل۔

''پہلی بات یہ کہ میں نے دانستہ کچھ نہیں کیا علی مزید یہ کہ آپ کو روکنے کو تو بالکل نہیں......'' اس کے لہجے کی سنجیدگی و متانت کو عبدالعلی نے اپنی سوچ کا مفہوم پہنایا۔ جبھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ نرمی سے دبایا۔ گویا اپنائیت کا احساس بخشنا مقصود ہو۔

''ابھی تک خفا ہو......؟'' قدر نے سر کو نفی میں فی الفور جنبش دی۔ پھر گہرا سانس بھرا تھا۔

''میں نے پڑھا تھا۔ خاندانی نہ عروج پر ابلتا ہے نہ زوال پر بسورتا ہے۔ وہ جانتا ہے یہ دنیا کے نشیب و فراز ہیں۔ مگر نو دولتیا چھوٹی ہانڈی ہے۔

جلدی اُبلتا بھی ہے جلد ہی بیٹھ بھی جاتا ہے۔ علی ...... مجھے لگا میں ایسے نو دولتیے کی طرح بنتی گئی تھی۔ میں ایسی نہیں تھی۔ مگر آپ کی محبت نے مجھے اتنا کم ظرف کر دیا تھا۔ آپ نے ٹھیک کہا۔ اگر اللہ سے محبت محسوس نہیں ہو رہی تو اللہ کی خاطر زبردستی کچھ کرو۔ میں بھی یہ ذائقہ چکھنا چاہتی تھی۔ آپ یقین کر سکتے ہیں عبدالعلی صرف اک بار دعا کرنے کی ضرورت تھی اور بس...... گویا مسئلہ حل...... میں حیران رہ گئی۔

اللہ تو جیسے میرا منتظر ہی تھا۔ میرے انتظار میں ہی تھا کہ یہ مجھ سے توفیق مانگے تو میں عطا کروں۔ اللہ اتنا رحیم ہے یہ تو مجھے ابھی اندازہ ہو پایا۔ یہ حقیقت ہے۔ زندگی میں ننانوے بار درست کام کر لو محض ایک بار غلط لوگ تمہارے ننانوے درست کام بھول کر تمہارا ایک غلط کام پکڑ لیں گے۔ اس کو انسان کہتے ہیں اگر ننانوے بار تم غلط کام کر لو اور محض ایک بار مغفرت مانگ لو تو اللہ تمہارے ننانوے غلط کام بھول کر تمہارا ایک ٹھیک کام قبول کر لے گا۔ اُس کو رحمٰن کہتے ہیں۔"

اس کی آنکھیں نم تھیں۔ عبدالعلی مسحور بیٹھا تھا۔ آنکھیں اس کی بھی نم تھیں۔ کتنے عرصے سے وہ قدر کو ایسا بنانے کو ہر طریقہ آزما چکا تھا۔ مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اور جب اللہ نے اس کا دل بدلنا چاہا تو محض چند سیکنڈ لگے۔ اور دنیا بدل گئی بیشک اللہ ہی دلوں کو بدلنے پہ قادر ہے۔

اللہ والے کہتے ہیں دعا لفظوں کا نہیں کیفیات کا نام ہے۔ مظلوم کے پاس کون سا اسمِ اعظم یا کون سا وظیفہ ہوتا ہے جو غیب سے فوراً فیصلے کروا لیتا ہے۔ درحقیقت مظلوم کی آہ اس کی آہ و زاری اس کا رونا صرف بے بس ہو کر ایک اللہ کی طرف متوجہ ہونا ہی غیب سے فیصلے کروا لیتا ہے۔

"خوش آباد رہو۔ تم نے مجھے آج شانت کر دیا قدر!" عبدالعلی نے جھک کر بے حد محبت سے عقیدت سے اس کا ہاتھ چوما۔

"وہ مسکرا رہا تھا۔ مطمئن تھا قدر بھی مسکرا دی۔ وہ بھی اب اطمینان سے تھی۔ یہ سچ ہے توفیق کے بغیر نیکی بھی کٹھن ہے۔ توفیق ہو تو ہر دشواری سہل ہو سکتی ہے۔ یہ توفیق بڑی انمول شے ہے۔ اس توفیق کی رب سے التجا ضرور ہونی چاہیے۔ زندگی سہیل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

☆......☆......☆

ارسل نے وہیل چیئر گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور جیسے اپنا ارادہ بھول گیا عبدالغنی لان میں تلاوت کر رہے تھے۔ جب سے اسامہ و سارہ عمرہ کے لیے گئے تھے۔ عبدالغنی ارسل کی تنہائی کے باعث اس کے پاس آئے ہوئے تھے۔ اُن کا معمول تھا صبح تلاوت لان میں کیا کرتے۔ ارسل اس دوران جیسے اپنی ہستی تک بھول جاتا۔

عبدالغنی کے خوش الحان آواز میں اتنی دل جمعی شدت اور محبت ہوتی کہ وہ ٹھٹک جاتا۔ گویا دنیا جہان کا ایسا استغراق اور ایسا ترنم تھا ان کے لہجے میں ایسی تاثیر تھی جو آج تک ارسل نے کسی اور قاری قرآن کی آواز میں محسوس نہ کی تھی۔ وہ محو ہونے لگتا۔ مگن ہو جاتا۔

اسے لگتا، یہ کلام ہے اور وہ ہے۔ عبدالغنی بیچ میں کہیں نہیں ہیں۔ یہ کلام براہِ راست اسی پر اتر رہا ہے۔ وہ سوچتا کیا یہ جادوگری صرف عربی زبان میں ہی ممکن تھی۔ یہ تاثیر صرف اسی زبان کی مرہونِ منت تھی۔ اگر قرآن کسی اور زبان میں اترتا تو بھی اتنا ہی پُراثر اور ہوش ربا ہوتا......؟ یقیناً...... بغیر کسی شک کے ایسا ہی ہوتا کہ یہ زبان نہ تھی اُس کا کلام تھا جو اس زبان کو پُراثر اور ہوش ربا کرتا تھا۔ قرآن کسی بھی

زبان میں اترتا۔ یونہی دل پر اثر کرتا۔ بدقسمتی سے وہ کہاں ابھی معنیے سے آشنا تھا۔ البتہ تراکیب اور حروف کہیں کہیں آشنائی میں روشن ہوتے تھے تو تتلیوں کے پر بدن پر پھڑ پھڑانے لگتے تھے۔ لیکن یہ نامکمل سی آشنائی اسی کیف کے راستے میں حائل نہ ہوتی تھی اس سرور میں رخنہ نہ ڈالتی تھی، اس خمار کو کم نہ کرتی تھی، جو عبدالغنی کی قرآت اس پر طاری کرتی تھی۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ بہت ماہ پہلے۔

پھر وہ خود پڑھنے لگا۔ اسے تب خود پڑھ کر بھی ایسا ہی سرور ملا۔ وہ جب بھی پڑھتا پہلی بار ہو جاتا۔ وہی لذت وہی کیف پھر چھا جاتا۔ عبدالغنی کی تلاوت مکمل ہوگئی۔ وہ اب کمرے میں جا رہے تھے۔ ارسل وہیل چیئر سمیت گیٹ کی جانب آ گیا۔

وہ ہر روز اس پارک میں آتا تھا۔ کچھ بزرگوں سے ملتا تھا۔ جو بے گھر تھے سامنے کچھ فاصلے پر موجود اولڈ ہوم میں پناہ گزین تھے۔ دردمند تھے دکھی تھے، وہ ان کی دل جوئی کیا کرتا۔ اپنے ہمراہ پھل لے جاتا۔ جوسز لے جاتا۔ اور کچھ نہیں تو چپکے سے ان کے ہاتھوں میں کچھ نوٹ تھما آتا۔ اس نے جانا تھا اس کام میں کتنا سکون ہے۔ خوش دلی اور اخلاص سے بھری مسکان کی خود ایک مسیحا گری ہوتی ہے اور بہت سے گھائل ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا علاج ہی یہ مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اس نے ایک بار پڑھا تھا۔

''اے ابنِ آدم! تجھے کیا ہوگیا ہے۔ تُو نے اپنی دعاؤں، نمازوں اور عبادتوں کو صرف پریشانی اور مصیبت کے وقت کے لیے ہی اٹھا رکھا ہے۔ تُو نے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والے رب کو صرف وقتی خوشیوں کے لیے ناراض کیا ہوا ہے۔

ذرا سوچ تو سہی وہ کیسا رب ہے جس نے تیرے اتنے گناہوں کے باوجود تیری آنکھیں نہ نکالیں۔ تیرے ہاتھ پاؤں کو سلامت رکھا اور تو اُس سے دور ہی ہوتا جا رہا ہے۔ صد افسوس کہ نماز دین کا دوسرا اہم ستون ہے۔ جس کی اہمیت کا اندازہ بھی نہیں ہمیں یاد رکھا جائے کہ نماز ہر حال میں ہر عاقل و بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے انہیں سوچنا ہوگا۔''

کیا وہ عاقل نہیں؟

کیا وہ بالغ نہیں؟

کیا وہ مسلمان نہیں؟

اور جس نے قصداً نماز چھوڑی اس نے کفر کیا۔

ارسل نے اس ایک نقطے کو لے لیا۔ عبادات سے اغراض کو نکال دیا۔ خواہشات کی تکمیل کی خاطر اسے عبادت نہیں کرنی تھی۔ یہ تجارت تھی اسے یہ تجارت نہیں کرنی تھی ایک امن نہیں ملی تھی۔ باقی بہت کچھ میسر تھا۔

اک کسک تھی مگر بہت کچھ مکمل تھا۔ اس نے اپنا دھیان تکمیل کی طرف لگایا تو زبان پر ذکر اور شکر جاری ہوگیا اور ضروری تو نہیں۔ اللہ ہر چیز دے دے۔ خاص کر مطلوبہ چیز...... تب ہی ہم رب رحمٰن کو رحمٰن سمجھیں۔ مزا تو اس میں ہے کہ ہم شانت نہ ہوتے ہوئے بھی دل کی پوری آمادگی کے ساتھ رب کو اپنے لیے رحمٰن رحیم سمجھیں۔ اور وہ سمجھ رہا تھا۔ یہی اس کا فخر تھا۔ یہی اس کا اطمینان یہی اس کی آسودگی تھی۔ اسی آسودگی میں اسی محبت میں وہ بے اختیار ہوا جاتا تھا۔ اعتراف کیے جاتا تھا۔

رحمٰن رحیم سدا سائیں

میری تجھ سے یہی دعا سائیں

میرے من میں دیپ جلا سائیں

اور دیپ جل اٹھے تھے۔ اب نہیں اندھیرا نہیں تھا۔ اب کہیں کوئی گھٹن نہیں تھی۔ کوئی درد نہیں تھا۔ وہ مکمل تھا۔ وہ مسرور مسحور تھا۔

(ختم شد)

ڈیئر قارئین ایڈیٹر صاحبہ

السلام علیکم!

دعا ہے خدا ہمیشہ ہم سب پر مہربان ہو، آمین۔ یہ ناول رحمٰن رحیم سدا سائیں تین حصوں پر مشتمل تھا اور تینوں حصوں سے وابستہ کیفیات جو تھیں وہ بھی ساتھ ساتھ میں آپ سے شیئر کرتی رہی ہوں۔ جب اسے آغاز کیا تو سوچ یہی تھی بہت طویل ہوگا۔ مگر جب لکھا تو انتہائی مختصر کر ڈالا۔ بعد میں پھر اسے حصوں پر مشتمل کیا۔ تیسرے اور آخری حصے کی میں کاشی بھائی کو پندرہ اقساط بھجوائی تھیں۔ سولہویں اور آخری قسط نہ لکھی نہ بھجوائی۔ وجہ یہی تھی کہ اس وقت میں کنفیوژ تھی۔ اس ناول کے اختتام کے حوالے سے اور چاہتی تھی جیسا خوب صورت یہ ناول ہے۔ ویسا ہی اس کا اختتام بھی کروں اور تقریباً ڈیڑھ سال بعد جب یہ اختتام کے مراحل میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کا اینڈ لکھنا ناگزیر ہوگیا ہے تو بھی میں، میں اس کا اختتام لکھنے کی پوزیشن میں خود کو پاتی تھی نہ ہی ذہنی لحاظ سے ڈیڑھ سال قبل کے مطابق ہی تھی کہ اختتام لکھ لوں۔ آپ یقین کریں گے کہ اس آخری قسط کو چھ دن تک میں چاہنے کے باوجود نہیں لکھ پائی اور بس ہمت حوصلہ جمع کرتی رہی اختتام تو وہی ہے جو سوچا تھا مگر وہ صحیح کیفیت وہ الفاظ ضرور کھوگئے۔ جو مجھے چاہیے تھے۔ یا شاید میں اللہ سے اس طرح نہیں مانگ سکی۔ جیسے توفیق مانگ کر میں لکھا کرتی تھی۔ آخری قسط اور پورے ناول میں آپ فرق محسوس کریں۔ اس کے لیے بہت معذرت یا ممکن ہے یہ محض میرا گمان ہو۔ آپ ضرور اپنی رائے سے آگاہ کیجیے۔ میری یہ سوچ کس حد تک درست ہے۔ یہ ایک طویل سفر تھا۔ جو الحمدللہ اب اختتام کے آخری مراحل میں داخل ہو رہا ہے۔ عین ممکن ہے اس طرح دوبارہ آپ سے مخاطب ہونے کا موقع نہ مل سکے جبھی آپ سے الوداعی ملاقات ضروری خیال کی۔ اللہ نے چاہا تو جلد انشاء اللہ میری نئی زندگی کا آغاز یعنی شادی ہوجائے گی۔ آپ سب کی دعاؤں کی طالب رہوں گی۔ دعاؤں میں شامل رکھیے گا مجھے میرے والدین بہنوں اور وطنِ عزیز کو بھی، خوش رہیں خوشیاں بانٹیں۔

والسلام

اُمِ مریم

ماسک

"خیر یہ تو نہ کہیں حمزہ کون سا اماں کے ساتھ رہا تھا جو اماں اُسے کلیجے سے لگا کر رکھتیں۔ اُس کی تو پیدائش ہی امریکہ میں ہوئی تھی۔" ثنا جو اِس گھر کی سب سے چھوٹی بہو تھی اور کتابیں پڑھ پڑھ کر ہر وقت سچائی کا پرچار کرنے پر تلی رہتی فوراً ہی سچ......

"حمزہ کہتا ہے وہ خاندان کی لڑکی سے شادی کرے گا، اسی لیے صفیہ ممانی اور وہ رمضان کے پہلے ہفتے میں پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ عید کے فوراً بعد شادی ہوگی۔" یہ خبر نہیں تھی بلکہ ہزار وولٹ کا کرنٹ تھا کہ جس لڑکی اور اس کی ماں کے کانوں کے پردے سے ٹکرایا وہ فٹ فٹ بھر اونچا اچھل پڑی۔

"نہیں بھئی...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تم کو سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔" ہر لڑکی بمعہ ماں کے خوش بھی ہو رہی تھی اور یقین کرتے ہوئے ہچکچا بھی رہی تھی۔

"اس میں یقین نہ آنے کی کیا بات ہے۔ مجھ سے خود صفیہ نے کہا ہے کہ وہ کہتا ہے اُسے گوری چٹی پسند نہیں ہے اور وہ سانولی سلونی پاکستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" ثریا پھوپو کی اکلوتی بیٹی سدرہ سانولی سلونی بلکہ پیٹ بھر کالی تھی اُن کو اُن کی بھاوج نے جو سالوں سے امریکہ میں رہ رہی تھیں اور جن کے پاس امریکہ کی نیشنلٹی بھی تھی یہ اعزاز بخشا تھا کہ اُن سے یہ راز کی بات کی تھی۔ اُن سے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جلد از جلد یہ خبر سارے خاندان میں پھیل جائے۔ اور اب ثریا پھوپو جن کا اپنی بھاوج سے اینٹ کتے کا بیر تھا۔ اُن کی تعریف میں زمین اور آسمان ایک کیے دے رہی تھیں۔

"سچ بتایئے بجو کیا! انہوں نے آپ سے خود یہ کہا ہے، اپنی زبان سے۔" ذکیہ پھوپو یہ خبر سننے کے فوراً بعد بڑی بہن کے گھر روانہ ہوگئی تھیں۔ اور اپنی آنکھوں کے سامنے اُن سے تصدیق کرنا چاہ رہی تھیں۔

"ظاہر ہے اپنی زبان سے ہی کہے گی۔ وہاں بات کرنے کے لیے زبانیں اُدھار تھوڑی ملتی ہیں۔" انہوں نے اپنے حساب سے بڑا عمدہ جملہ کہہ کر چھوٹی بہن کو شرمندہ کر دیا۔ ذکیہ پھوپو پہلے ہی بڑی بہن کے زیر اثر تھیں اور جب سے یہ سنا تھا کہ امریکہ میں رہنے والی بھاوج نے سارے خاندان کو چھوڑ کر اُن کو اپنا ہم راز بنایا تھا وہ

مرعوبیت کے احساس سے زمین میں دھنسی جارہی تھیں۔
''تم تو جانتی ہی ہو صفیہ ہمیشہ سے اپنا ہر مسئلہ مجھ ہی سے بیان کرتی ہے وہ مجھے تم سے بڑھ کر چاہتی ہے اور ایک ماں کی طرح عزت دیتی

ماں کی زبان سے یہ جملے سن کر چھوئی موئی کی طرح سمٹی جارہی تھی۔
''خیر یہ تو نہ کہیں حمزہ کون سا اماں کے ساتھ رہا تھا جو اماں اُسے کلیجے سے لگا کر رکھتیں۔ اُس کی تو پیدائش ہی امریکہ میں ہوئی تھی۔'' ثنا جو اِس گھر

ہے۔'' ثریا پھوپو کی زبان سے ایسا حیرت انگیز بیان سن کر ثنا چچی کو غش آتے آتے رہ گیا جو تھوڑی دیر پہلے ہی اس خبر کی تصدیق کے لیے پہنچی تھیں۔
''آج اماں زندہ ہوتیں تو کتنا خوش ہوتیں کہ وہ پوتا جسے وہ کلیجے سے لگا کر رکھتی تھیں اُس نے دادی کی محبت کا حق ادا کر دیا۔'' ثریا پھوپو نے یہ کہتے کہتے کنکھیوں سے اپنی بیٹی سدرہ کو دیکھا جو

کی سب سے چھوٹی بہو تھی اور کتابیں پڑھ پڑھ کر ہر وقت سچائی کا پرچار کرنے پر تلی رہتی فوراً ہی سچ اگل دیا۔
''تم تو خاموش رہو۔ تمہارے اماں ابا نے تو تمہیں بڑوں سے بات کرنے کی تمیز ہی نہیں سکھائی۔'' ثریا پھوپو نے اُسے فوراً ہی بھڑک کر اِس کی زبان بند کر دی۔

ثناء ہمیشہ کی طرح منہ بنا کر خاموش ہوگئی کہ اس کے میکے والے غریب بھی تھے اور سب پاکستان میں رہتے تھے جبکہ صفیہ کا آدھے سے زیادہ خاندان امریکہ جا چکا تھا اور اُن کے بھائیوں نے ہی بے شمار جتن کر کے بہن اور بہنوئی کو بھی بلایا تھا۔ اور دونوں نندیں ساری زندگی اِسی خوش فہمی میں بتلا رہیں کہ اگر اُن کی بھاوج کے دل میں اُن کی محبت جاگ جائے تو شاید اُن کے بھاگ بھی جاگ جائیں گے اور وہ بھی امریکہ کی حسین فضاؤں میں سانس لینے کی سعادت حاصل کرسکیں گی۔

''صفیہ پر تو ہمیشہ سے خدا کی رحمت کا سایہ رہا ہے۔ وہ تو اتنی بھاگوان ہے کہ جب شادی ہوکر ہمارے گھر میں آتی تھی تو ہمارے گھر میں بھی ہُن برسنے لگا تھا۔'' ثریا پھوپو جذب کے عالم میں آنکھیں بند کیے ہوئے تھیں۔

''پیسوں کی کیسی ریل پیل ہوگئی تھی۔'' ذکیہ پھوپو بھی خوابوں کے جزیرے پر سیر کرنے نکل گئی تھیں۔ دونوں نندیں بھاوج کی محبت میں گلے گلے ڈوب چکی تھیں۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بھاوج کو کون سے درجے پر فائز کریں۔ شکر ہے اللہ تعالیٰ نے خواتین کو نبی نہیں بنایا ورنہ اِس وقت وہ دونوں اپنی بھاوج کو ضرور نبوت یا ولایت کے منصب پر فائز کرچکی ہوتیں۔

ثناء کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور بالآخر چھلک اٹھا۔

''مگر اماں تو کہتی تھیں کہ صفیہ کا قدم ایسا منحوس ثابت ہوا تھا کہ اس کے آتے ہی اُن کے میاں کو ہارٹ اٹیک ہوا اور بھائی جان کی لگی لگائی نوکری چھوٹ گئی جبھی تو بھائی جان کو پردیس کی خاک چھاننی پڑی۔''

ثناء کی اِس سچ بیانی پر دونوں نندیں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔

''یہ کیا ہوا...... بی مینڈکی کو بھی زکام ہوگیا۔'' انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور پھر جو اُس غریب کے لتے لیے کہ اُس کو بھی دن میں تارے نظر آنے لگے۔

وہ جو مثل مشہور ہے کہ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی وہ صفیہ ممانی کی سسرال پر من وعن صادق آئی چند گھنٹوں میں پورے خاندان میں اِس خبر کا ایسا چرچا ہوا کہ ٹی وی کے نیوز چینل بھی پیچھے رہ گئے۔ ہر گھر میں جہاں لڑکیاں سانولی تھیں گویا خوشی کے شادیانے بجنے لگے اور جو لڑکیاں گوری چٹی تھیں اور آج تک اپنے گورے رنگ پر اتراتی تھیں سخت ڈپریشن میں بتلا ہوگئیں۔ فی الحال پاکستان میں کھلے عام سن باتھ لینے کا رواج عام نہیں ہوا ہے ورنہ تو پاکستانیوں کی عید سے پہلے ہی عید ہو جاتی۔

حمزہ میں صرف ایک ہی خوبی نہیں تھی کہ وہ امریکہ میں پیدا ہوا تھا وہیں پلا بڑھا تھا بلکہ وہ بہت لائق قابل ڈاکٹر تھا اور اب ہارٹ سرجری کی مزید تعلیم حاصل کر رہا تھا اور ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ بہت اسمارٹ اور ہینڈسم بھی تھا۔ رنگ اس کا بھی گندمی تھا۔ لیکن باہر کی آب و ہوا اور ملاوٹ سے پاک غذاؤں نے اِس رنگ میں ایسی سرخی گھول دی تھی کہ وہ گندمی رنگت بھی دمکتی تھی اور ہزاروں پاکستانی گوروں پر بھاری تھی۔

جب تک صفیہ ممانی پاکستان میں رہیں تو سسرال والوں سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بنتی تھی۔ اب امریکہ میں رہ رہی تھیں تو سسرال والوں پر ایسے ٹوٹ کر پیار آتا کہ ہر ایک کے لیے Buy One Get One کی شاپ

سے ایسے ایسے تحفے لاتیں کہ جن کو یہ تحفے دیے جاتے وہ بے چارے حیران و پریشان اِن تحفوں کو دیکھتے رہ جاتے اور احساس کمتری کے مارے یہ بھی نہ پوچھ پاتے کہ انہیں کیسے اور کہاں استعمال کیا جاتا ہے۔ جب پچھلی دفعہ ثنا کے لیے ایسا شاور جیل لائیں تھیں جسے باتھ ٹب میں ڈال کر دیر تک ٹب میں لیٹا جائے۔ مگر وہی غربت کہ ثنا کے واش روم میں باتھ ٹب ہی نہیں تھا۔ وہ بے چاری بہت دنوں تک میاں سے کہتی رہیں کہ اِس شاور جیل کی خاطر ہی ٹب بنوالیں لیکن میاں بھی مردوں کی اُس قسم سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کے کان کے پردے تک بیوی کی آواز نہیں پہنچ پاتی تھی۔

صفیہ اور حمزہ کو رمضان کے پہلے ہفتے میں آنا تھا اور عید کے پہلے ہفتے میں شادی کا ارادہ تھا۔ اِس خبر کی تصدیق ہوتے ہی ثریا پھوپو نے اپنے گھر کی مرمت کرانی شروع کردی۔ انہیں یقین تھا کہ اُن کی بھاوج اور بھتیجا جس پر انہیں اب ہر وقت اتنا پیار آتا کہ بس نہیں چلتا کہ اس کی تصویر کو انلارج کرواکے گھر کی سب سے نمایاں جگہ پر لگا دیں اور ہر روز اُس پر سے آرتی اتاریں۔

انہوں نے فوراً بینک سے پیسے نکلوائے اور بازار کا رُخ کیا۔ فرنیچر، پردے، قالین ہر چیز نئی نکور خریدی گئی۔ لان کو نئے سرے آراستہ کروایا گیا۔ پتہ چلا تھا کہ حمزہ کو گلاب بہت پسند ہیں چنانچہ ساری کیاریوں میں ہر رنگ کے گلاب لگوائے گئے اور اِس کے ساتھ سدرہ کو مسلسل نصیحتیں کی جانے لگیں۔

”ہر وقت نک سک سے درست رہنا حمزہ کو گھریلو اور سلیقہ مند لڑکی پسند ہے تو سگھڑاپے کے سارے اصول اور قواعد زبانی یاد کرادیے گئے۔ اور گھریلو بنانے کے لیے یونیورسٹی سے چھٹیاں دلوادی گئیں۔ اور سخت تنبیہ تھی کہ خبردار اُن لوگوں کے سامنے یونیورسٹی کا U بھی منہ سے نہ نکالنا اگر تعلیم کے بارے میں کچھ پوچھیں تو اداکارہ زیبا کی طرح سر جھکا کر شرما کر بتانا کہ میٹرک کے بعد اماں نے آگے پڑھنے نہیں دیا کہ اب گھرداری سیکھو آخر کو گھرداری سنبھالنا ہے۔

سدرہ بھی کوئی قائم علی شاہ کے زمانے کی تو تھی نہیں، معصوم بھولی، الٹرا نادان کہ یہ نہ جانتی ہو کہ نکاح کے وقت ہاں کہنا ہے یا نہیں۔ اماں اپنے وقت کا قصہ سناتی تھیں کہ اُن کی ایک بھاوج اتنی بھولی بنتی تھیں کہ ایک دفعہ سب کے درمیان بیٹھ کر کہہ رہی تھیں کہ ہم تو نکاح کے وقت اتنے کم عمر تھے کہ ہمیں یہ ہی نہیں پتہ تھا کہ نکاح کے وقت ’ہاں‘ کہتے ہیں یا ’نہیں‘۔ وہ بیچاری جب بہت معصومیت سے یہ بیان کررہی تھیں تو اُن کی ساس جل کر بولیں۔

”تو بیٹا پھر ہاں کیوں کہا۔ نہیں ہی کہہ دیتیں۔ ہماری جان چھوٹ جاتی۔“ تو سدرہ اپنی ماں سے کہیں زیادہ ذہین اور سمجھدار تھی۔ صفیہ ممانی اور حمزہ کے آنے سے پہلے وہ بیوٹی پارلر جاکر 70 کی ہیروئنوں جیسا میک اپ کرواکر آ گئی تھی اور ایسا میک اپ کرواکر آئی کہ ثریا پھوپو بھی چند لمحوں تک پہچان نہ پائیں۔ بے چاری اُسے شمیم آراء سمجھ کر خوشی سے بے حال ہوگئیں۔

”مجھے آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ آج آپ کو اپنے گھر میں دیکھ کر میری جو کیفیت ہے میں اُسے الفاظ میں بیان نہیں کرسکتی۔“ ثریا پھوپو نے جملے کہہ کر گلے لگانے کو آگے بڑھیں تو شمیم آراء چمک کر بولیں۔

”اماں پلیز بڑی مشکل سے بال سیٹ کیے ہیں پارلر والی نے کہا ہے احتیاط کیجیے گا تو ہفتے بھر

چلیں گے۔'' شمیم آراء کے وجود سے سدرہ کی آواز برآمد ہوئی تب انہیں یقین آیا کہ یہ واقعی اُن کی بیٹی ہے۔

جس دن صفیہ ممانی اور حمزہ نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رنجہ فرمایا۔ سارے خاندان والوں نے پیسے جمع کر کے کرائے پر کوسٹر کر لی تھی اور کوسٹر میں زیادہ تعداد کم عمر لڑکیوں کی تھی جن کی عمریں اُن کی ماؤں کے حساب سے بیس سے کم تھیں کیونکہ سارے خاندان میں اڑتی اڑتی خبر یہ بھی نشر ہو چکی تھی کہ صفیہ ممانی اپنے بیٹے کی شادی کم عمر لڑکی سے کریں گی۔

بہرکیف جب صفیہ ممانی اور حمزہ سوٹ کیسوں سے لبالب بھری ہوئی ٹرالی لے کر لاؤنج سے برآمد ہوئے تو ساری لڑکیوں کے چہروں پر شرمیلی مسکراہٹیں آنکھ مچولی کھیلنے لگیں مائیں صفیہ کم حمزہ پر صدقے واری ہونے لگیں۔ وہ بے چارہ بھی سخت حیران تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے ٹام کروز کی شکل اختیار کر لی ہے۔

صفیہ ممانی نے سوالیہ اور فخریہ نظروں سے سب رشتہ دار خواتین کو دیکھا گویا یہ سوال کر رہی ہوں کہ انہیں کس کے گھر کو اپنے اور حمزہ کے وجود سے شرف رہائش بخشنا ہے۔ ثریا پھوپو جن کا بھاوج سے محبت کا گراف مسلسل بڑھ رہا تھا لپک کر آگے بڑھیں اور بھاوج کو گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''آج اماں زندہ ہوتیں تو تم اماں ہی کے گھر جاتیں۔ آج اماں نہیں ہیں، میں اماں کی جگہ ہوں تم پر سب سے زیادہ حق میرا بنتا ہے۔''

حمزہ بھلا کہاں اس قسم کے نظاروں کا عادی تھا۔ وہ پھوپی کی محبت سے اتنا بدحواس ہوا کہ ایک جملہ کسے بغیر اُن کے میاں کے ہاتھ میں ٹرالی تھما دی۔ جبکہ بڑے پھوپا اپنی بیوی کی اتنی بہترین اداکاری پر سوچ رہے تھے کہ اگر اُن کی بیوی اداکارہ ہوتیں تو یقیناً کئی آسکر ایوارڈ جیت چکی ہوتیں۔ مگر کیا کیا جائے پاکستان میں تو ٹیلنٹ کی قدر ہی نہیں ہے ورنہ اگر گھروں کا سروے ہو تو ہر گھر سے ساس نند اور بہو کی صورتوں میں ایسی ایسی اداکارائیں دستیاب ہوں کہ آسکر ایوارڈ کے لیے سلیکٹ کرنے والے جج بھی حیران رہ جائیں کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

رمضان ہر مسلمان کے لیے برکتوں اور رحمتوں کی نوید لے کر آتا ہے اور ثریا پھوپو کے گھر میں تو یہ مہینہ خوشیوں، مسرتوں، امیدوں اور رنگین خوابوں کا پیغام لے کر آیا تھا۔ حمزہ پھوپی کا چھ سو گز پر بنا ہوا گھر دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ جبکہ وہاں امریکہ میں سالوں رہنے کے باوجود وہ ایک فلیٹ کے ہی مالک بن سکے تھے جس کی قسطیں وہ آج تک دے رہے تھے۔ صفیہ ممانی صبح سے شام تک ایک اسٹور پر کام کرتی تھیں اور اُن کے میاں نے وہاں گروسری کی دکان کھولی ہوئی تھی۔ حمزہ کو میڈیسن کی تعلیم دلوانے کے لیے وہ دونوں کولہو کے بیل کی طرح کام کرتے تھے۔ دنوں اُن لوگوں کو ایک دوسرے سے بات کرنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ تو اپنی پھوپی اور اُن کی بیٹی کے عیش و آرام دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

''مما پاکستان میں خواتین کتنا وقت ضائع کرتی ہیں کیا اِن کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا۔''

''دیکھ لو...... جبھی پاکستان کی یہ حالت ہے روز بروز زوال کی طرف جا رہا ہے۔'' صفیہ ممانی نند کے عیش و آرام کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتیں۔

''اِن کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے۔

مجھے تو پھوپا جان بھی فارغ ہی نظر آتے ہیں۔"
"تمہارے پھوپا انکم ٹیکس میں سترہ گریڈ کے آفیسر تھے خوب جی بھر کے دولت کمائی ہے اب وہ دولت بینکوں میں ہے اور اس کے سود سے یہ گھر بار چل رہا ہے۔"
"حیرت ہے مسلمان ہو کر بھی سود کھاتے ہیں۔" حمزہ کو جھٹکا لگا۔
"اس میں حیرت کی کیا بات بیشتر مسلمان بینک سے ملنے والے منافع کو سود نہیں سمجھتے۔"
"لیکن مومن تو کہتا تھا یہ سراسر سود ہے۔" حمزہ نے اپنے سب سے قریبی دوست کا نام لیا۔ جس کی فیملی کو امریکہ میں زیادہ تر لوگ انتہا پسند مسلمان کہتے تھے۔
"مجھے تو خود اتنی معلومات نہیں ہیں یہ مولویوں کے سوچنے کا کام ہے انہیں یہ بتانا چاہیے کہ سود کی اصل تعریف کیا ہے اور کون سا منافع سود کے زمرے میں آتا ہے اور کون سا نہیں۔" صفیہ ممانی نے وہی جواب دیا جو ہر مسلمان کہہ کر اپنی جان بچا لیتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی مشقت سے آزاد ہو جاتا ہے۔
"یہ تو غلط ہے ہر مسلمان کی اپنی بھی ذمہ داری ہے۔ قرآن میں تو اتنا صاف اور واضح بیان کیا گیا ہے کہ سود کھانے والا خدا اور اُس کے رسول کا دشمن ہے۔" حمزہ نے اُس ملک میں پرورش پائی تھی جہاں ہر بات کہنے کی مکمل آزادی تھی۔
"بیٹا میرا دماغ مت کھاؤ۔ میں یہاں چند دن آرام کرنے کے لیے آئی ہوں یہ سوچنے کے لیے نہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط......!" حمزہ ماں کے اِس جواب پر کڑھ کر رہ گیا۔

وہ پورے پندرہ سال بعد پاکستان آیا تھا۔ پہلے جب وہ پاکستان آتا تھا تو بہت لاپرواہ اور لاأبالی سا تھا۔ اُسے بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن اب جو آیا تو بہت زیادہ سنجیدہ اور بردبار ہو گیا تھا اور اپنے پروفیشن کے تقاضوں کے مطابق ہر چیز کو بے حد گہرائی اور غور سے جانچتا اور پرکھتا تھا۔

پورا رمضان افطار پارٹیوں میں گزرنے لگا۔ وہ پاکستانیوں کے طور طریقے دیکھ کر حیران و پریشان تھا۔ رمضان کے جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے مخصوص کیا ہے۔ جس کے ایک ایک پل کی عبادت کا ثواب عام دنوں کی عبادتوں سے ہزاروں گنا رکھا ہے۔ وہاں لوگ عبادت کے سوا ہر کام کرتے نظر آتے تھے۔ نوکریوں پر جاتے تو اونگھتے رہتے۔ دکانوں پر بیٹھے ہوئے تو بات بات پر جھنجلا رہے ہوتے۔ جیسے روزہ رکھ کر اللہ پر احسان کیا ہے۔ تجارت پیشہ لوگوں نے اِس مہینے کو کمائی کا مہینہ بنا لیا تھا۔ عورتیں گھروں میں عبادت کرنے کے بجائے سارا دن بازاروں میں پھرتی رہتیں۔ افطار میں سادگی کے بجائے ٹیبل بے شمار پکوانوں سے چھلک رہی ہوتی۔ خاندان میں ہر روز کہیں نہ کہیں سے افطار کا بلاوا آتا اور ہر گھر میں ہر ڈش اُس گھر کی لڑکیوں نے اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہوتی اور بڑھ چڑھ کر اُس لڑکی کی تعریفیں کی جاتیں اور صفیہ ممانی سے زیادہ حمزہ کو متاثر کرنے کی کوشش کی جاتیں۔

☆......☆......☆

"بھابی آپ کو یاد ہوگا جب ثوبیہ پیدا ہوئی تھی۔ تو میں کتنی بیمار ہو گئی تھی اماں مجھے گھر لے آئیں تھیں۔ آپ امریکہ سے آئی ہوئی تھیں۔ ثوبیہ کا سارا کام آپ ہی کرتی تھیں۔ اِس کے لیے فیڈر بنانا، اِس کے نیپی بدلنا، راتوں کو اُسے

گود میں لے کر ٹہلنا، ثوبیہ تو آپ سے اتنا ہل گئی تھی کہ میرے پاس آتے ہی رونے لگتی۔ اماں تو کہتی تھیں تم اِسے اپنی بڑی بھاوج کو دے دو۔''

ذکیہ پھوپو کے گھر تیسری دفعہ افطار پارٹی پر اُن لوگوں کو بلایا گیا تھا اور ثریا پھوپو بلڈ پریشر ہائی ہونے کی وجہ سے نہ آسکیں تھیں اور ویسے بھی ذکیہ پھوپو نے کون سا انہیں دل سے دعوت نامہ دیا تھا۔ بس اوپری اوپری رسمی طور پر کہہ دیا تھا اور چونکہ ثریا پھوپو اور اُن کا خاندان موجود نہ تھا تو ذکیہ پھوپو کو بیٹنگ کا پورا چانس مل گیا تھا اور وہ خوب چوکے چھکے لگا رہی تھیں۔

صفیہ ممانی آنکھیں پھاڑے نند کی وہ باتیں سن رہی تھیں جنہیں سن کر انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی ہوں۔

''ایسا کب ہوا تھا؟'' بہت کوشش کر کے بھی انہیں کچھ یاد نہیں آرہا تھا ہاں یاد آیا تو صرف اتنا کہ چند سالوں پہلے وہ اپنے ابا کے مرنے پر پاکستان آئی تھیں تو انہوں نے اپنی نند کی اِس بچی کو دیکھا تھا جو بہت کمزور سانولی تھی اور ہر وقت روتی رہتی تھی تو انہوں نے ساس سے کہا تھا۔

''ذکیہ کی یہ بچی کس پر پڑ گئی ہے۔'' تو ساس نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔

''اپنی پھوپیوں پر گئی ہے اور کس پر جاتی۔''

ذکیہ کی ساری نندیں پیٹ بھر کالی تھیں۔

''لیکن اتنی کمزور تو نہیں ہیں۔''

''کمزور......'' اُن کی ساس نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

''اُن کے گھر جاؤ تو لگتا ہے گوشت کے چھوٹے موٹے پہاڑ اِدھر سے اُدھر لڑھک رہے ہیں۔'' اماں نے کچھ اِس انداز سے اُن کے موٹاپے کا نقشہ کھینچا کہ باوجود کوشش کے وہ اپنی ہنسی نہ روک سکیں۔ جس پر وہ بعد میں بہت شرمندہ ہوئی تھیں۔

''اماں خدا کا خوف کیجیے کسی کا اِس طرح مذاق نہ اڑائیں یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح طور پر بیان کیا ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ اور نہ اُن کو برے القاب سے پکارو ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا ہی بہت بُرا ہے اور جو اِن حرکتوں سے توبہ نہ کرے گا۔ پس ایسے ہی لوگ تو ظالم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ وہ ظالموں کو معاف نہیں کرے گا۔'' ثنا چچی جو خاندان میں سب سے زیادہ خوبصورت اور نیک فطرت تھیں انہیں اماں کا اِس طرح ذکیہ کی نندوں کا مذاق اڑانا ذرا اچھا نہیں لگا۔ انہوں نے قرآن کی آیتوں کا حوالہ دیا۔ اور پھر اپنی سچ بیانی پر انہیں ہمیشہ کی طرح پورے گھنٹے اپنے خاندان کی غربت اور کمتر ہونے کے طعنے سننا پڑے۔

''تم صحیح کہہ رہی ہو......ثوبیہ کو میں نے پالا ہے۔'' ذکیہ پھوپو کے مسلسل اصرار پر بالآخر صفیہ ممانی نے اُس ہرن کی طرح اعتراف کرلیا جسے پاکستانی پولیس نے ہاتھی کے دھوکے میں پکڑا تھا اور اُس کی زبان سے یہ کہلوا کر ہی دم لیا کہ میں ہی ہاتھی ہوں یہ میری غلط فہمی تھی کہ اتنے عرصے سے میں اپنے آپ کو ہرن سمجھتا رہا۔

''یہ ساری ڈشیں ثوبیہ نے بنائی ہیں۔ بھابی اس کے ہاتھوں میں آپ کے ہاتھوں کا سا مزہ ہے۔ اماں تو آپ کے جانے کے بعد ہر وقت یہی کہہ کہہ کر روتی تھیں کہ صفیہ کے جانے کے بعد تو کھانے کا مزہ ہی ختم ہوگیا۔'' ذکیہ پھوپو کو آج ایسا گراؤنڈ مل گیا تھا جہاں باؤنڈری پر کوئی فیلڈر ہی نہیں تھا۔ وہ مسلسل چھکے لگانے کی کوششوں میں

مصروف تھیں۔

اور آج صفیہ ممانی پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ اُن کے ہاتھ میں مزہ بھی تھا ورنہ شادی کے بعد جب انہوں نے کچن سنبھالا تھا تو اُن کی ساس کو یہی شکایت رہی کہ ہماری بہو تو سالن کے نام پر کیا گھول کر پکاتی ہے کہ سالن کو دیکھتے ہی بھوک اڑ جاتی ہے۔ لیکن آج تو ذکیہ پھوپو پانامہ لیکس کی نمائندہ بنی نہ جانے کب کب کے پوشیدہ راز افشا کر رہی تھیں۔ صفیہ ممانی کو کیا پتہ تھا کہ امریکہ جانے کے بعد پاکستان میں اُن کی تعریفوں کی آف شور کمپنی قائم ہو چکی تھی۔

''یہ اتنی ساری چیزیں ثوبیہ نے اکیلے بنائی ہیں۔'' حمزہ ششدر رہ گیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' ٹیبل پر افطاری کے نام پر دہی بڑے، فروٹ چاٹ، رول، سموسے، چنا چاٹ، اسپگیٹی، کسٹرڈ اور نہ جانے کن کن چیزوں سے بھری ہوئی تھی۔ حمزہ نے حیرت سے اُس دبلی پتلی نازک سی لڑکی کو دیکھا تو دیکھنے میں میٹرک کی طالبہ لگ رہی تھی۔

''ماشاء اللہ سے میری ثوبیہ بچپن ہی سے کھانے پکانے کی شوقین ہے آپا کی سدرہ کی طرح نہیں ہے کہ سوائے فیشن اور فلمیں دیکھنے کے کوئی دوسرا کام ہی نہیں۔'' ذکیہ پھوپو نے موقع غنیمت جان کر ایک اور چھکا مارا۔

''ہاں یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ حمزہ بھی یہی کہتا ہے کہ سدرہ سارا دن بے کار ٹائم ضائع کرتی ہے۔'' ذکیہ پھوپو کی گیند باؤنڈری لائن کراس کر چکی تھی۔ اور اتنی زبردست کامیابی پر اُن کا دل اچھل اچھل کر اُن کو داد دے رہا تھا۔

''میں نے بچپن ہی سے ثوبیہ کو کچن کے کاموں میں ماہر کر دیا تھا۔ ایسی بہترین کوکنگ کرتی ہے کہ لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جاتے ہیں۔'' ذکیہ پھوپو کا مورال آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اب انہیں اپنی بیٹی کے قصیدے پڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

''میں نے تو کبھی اِسے نہ کوئی فلم دیکھنے دی اور نہ دوستوں کے گھر جانے کی اجازت دی گھر میں جو وقت ملتا اس میں سلائی کڑھائی پر لگا دیا۔ یہ سارے کشن، تکیہ، غلاف سب اِسی کے ہاتھوں کے کاڑھے ہوئے ہیں اور یہ شرٹ جو اس نے پہنی ہے یہ بھی اِس نے اپنے ہاتھوں سے کاڑھی ہے۔''

ذکیہ پھوپو کی لن ترانیاں اپنے عروج پر تھیں اور ثوبیہ کی آنکھیں ماں کے انکشافات پر حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

پورا رمضان صفیہ ممانی اور حمزہ کی سرگرمیاں کچھ پُراسراری رہیں۔ شب قدر بھی آ کر گزر گئی۔ سب کی جان حلق میں آ گئی تھی نہ جانے قرعہ فال کس کے نام نکلے گا۔ عید میں صرف دو دن رہ گئے تھے اور عید کے ایک ہفتے بعد شادی تھی۔ ویسے تو صفیہ ممانی ہر ایک کے سامنے خلوص و محبت کا پیکر بنی ہوئی تھیں ہر ایک کی بچیوں کی دل کھول کر تعریفیں کر رہی تھیں اور ہر لڑکی اپنے آپ کو اُن کی بہو سمجھ کر شرمائی لجائی جا رہی تھی۔ اسی طرح حمزہ بھی کچھ کم گُھنا نہیں تھا۔ ہر لڑکی سے بہت خوش اخلاقی سے بات کرتا۔ اُن کی باتوں کو بہت غور سے سنتا۔ اُن کی بنائی ہوئی چیزوں کی دل کھول کر تعریفیں کرتا اور لڑکیوں کا بس نہیں چلتا کہ دوپٹوں کو ہونٹوں میں دبا کر باغوں میں درختوں کے گرد آئے موسم رنگیلے سہانے، جیا نہیں مانے، جیسے گانے گا گا کر ناچنا شروع ہو جائیں۔

چاند رات کو چاند دیکھ کر ثریا پھوپو اور سدرہ کے

دل سے یہی دعا نکلی کہ ''اے اللہ اِس چاند کی طرح امریکہ کے چاند سے بھی ہمارے گھر میں اُجالا بکھیر دے۔'' اس دفعہ سدرہ نے عید پر بالکل مشرقی انداز اپنایا تھا۔

چوڑی دار پاجامے اور بے شمار کلیوں کے کرتے اور چوٹی میں پرآندہ ڈالے وہ صفیہ ممانی کے پاس آئی اور انہیں جھک کر سلام کیا تو صفیہ ممانی کا چہرہ ہنسی روکنے کی کوشش میں انگارے کی طرح دہکنے لگا۔

عید کے پکوانوں میں اِس دفعہ کوئی فارن کا آئٹم نہیں تھا۔

''میرا بچہ تو دیسی کھانوں کو ترس گیا ہے کیسے ندیدوں کی طرح ایک ایک چیز پر ٹوٹ پڑتا ہے۔'' ثریا پھوپو نے سودا منگواتے ہوئے اپنے میاں سے بڑے دلگیر لہجے میں یہ جملہ کہا تھا اور میاں اپنی بیوی کو دیکھ کر سوچ رہے تھے کہ اِس عرصے میں پہلی بار انہوں نے حقیقت بیان کی تھی۔

دوپہر کے کھانے میں سارے پکوان دیسی تھے۔ حلیم، پلاؤ، قورمہ، کوفتے، شامی کباب، شیر خورمہ، اور قوامی سویاں کہ صفیہ ممانی اور حمزہ کو اپنے روایتی کھانوں سے عشق تھا۔

اُن دونوں نے بڑھ چڑھ کر کھانے کھائے اور تعریفیں بھی کیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد دونوں پھوپا جان کی نئے ماڈل کی گاڑی میں بیٹھ کر خاندان والوں سے عید ملنے نکل گئے۔ دل تو ثریا پھوپو کا بھی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اپنے ہونے والے داماد اور اُس کی ماں کے ساتھ عید ملنے جائیں مگر پھر انہیں خیال آیا کہ یہ بہت چھچھوراپن ہوگا۔ لوگ کیا سوچیں گے شادی سے پہلے ہی بیٹی داماد کے ساتھ گھومنے لگیں۔

☆......☆......☆

''آپا جمعہ کو حمزہ کا نکاح ہے۔'' عید کے دوسرے دن وہ سب ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے خاندان والوں کے بخیے اُدھیڑ رہے تھے کہ صفیہ ممانی نے توپ سے کئی من وزنی گولہ فائر کردیا۔

''اتنی جلدی...... '' ثریا پھوپو گھبرا گئیں۔ اتنے جلدی انتظامات کیسے ہوں گے۔ ابھی تو ہال بھی بک کرانا ہوگا۔''

''حمزہ کہتا ہے نکاح مسجد میں ہوگا اُس نے مسجد کے امام صاحب سے بات کرلی ہے۔'' سدرہ نکاح کا ذکر سنتے ہی شرما کر لاؤنج سے باہر چلی گئی تھی۔

''مگر صفیہ ہمیں تھوڑا سا تو ٹائم دو، لڑکی کا نکاح ہے۔ اتنی جلدی کیسے......؟'' ثریا پھوپو کو سو فیصد یقین تھا کہ اُن کی بھاوج سدرہ کے سوا کسی اور کو اپنی بہو بنا ہی نہیں سکتیں۔

''لڑکی والے بہت سیدھے سادھے لوگ ہیں وہ بھی اسلامی طریقے سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔''

''کون سے......لڑکی...... والے۔'' ثریا پھوپو کے ہاتھ میں چائے کا کپ لرزنے لگا۔

''آپ تو اِن لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔ ثناء کی بھانجی، رمشا......صفیہ ممانی نے بالآخر بلی تھیلے سے باہر نکال ہی دی۔

''ر......م......ش......ا۔'' ثریا پھوپو نے ہجوں کے ساتھ رمشا کا نام دہرایا۔

''لیکن وہ تو طلاق یافتہ ہے۔'' وہ تقریباً رو دینے کو تھیں۔

''تو کیا ہوا؟ آپ ہی تو کہتی تھیں۔ اتنی معصوم، اور پیاری بچی کے ساتھ کیسی زیادتی ہوئی تھی اس کا شوہر نفسیاتی مریض تھا۔ جو اُسے ذرا ذرا سی بات پر مارتا پیٹتا تھا۔'' صفیہ ممانی نے انہی کی کہی ہوئی باتوں کو دہرایا۔

''میں نے کہا تھا...... میرا دماغ تو نہیں خراب تھا کہ میں ایسا کہوں گی...... تم نے غلط سنا ہوگا۔'' انہیں بھاوج کی یادداشت پر شدید غصہ آرہا تھا۔ یا تو

یادداشت کا یہ عالم تھا کہ ہر بات بھول جاتی تھیں اور اب ایک اتنی معمولی سی نہ جانے کس وقت کی کہی ہوئی بات ذہن میں رہ گئی تھی۔

"نہیں آپا آپ ہی نے کہا تھا...... جب ہم ثنا کے گھر افطار پر گئے تھے۔" صفیہ ممانی نے یاد دلایا۔

"ارے ایسے ہی میں ثناء کے سامنے کہہ رہی تھی۔ ورنہ میں بتا دوں بڑی تیز طرار لڑکی ہے۔ تم خود سوچو...... اگر وہ گھر بسانے والی ہوتی تو بھلا خود خلع کے لیے کہتی۔ شریف لڑکیاں تو نہ جانے کیسے کیسے مردوں کے ساتھ گزارا کرتی ہیں اور منہ سے بھاپ نہیں نکالتیں۔" ثریا پھوپو نے سیاست دانوں کی طرح اپنا بیان مکمل طور پر بدل دیا۔

"خیر آپا...... وہ لڑکی تو مجھے بہت اچھی لگی۔ بے حد سادہ معصوم سلجھی ہوئی اور آپ تو جانتی ہیں حمزہ بچپن سے ہی بہت ہمدرد ہے ذرا سا کسی کو تکلیف میں دیکھتا ہے بے چین ہو جاتا ہے۔ اُس دن ہم ثنا کی والدہ کی عیادت کے لیے اُن کے گھر گئے تو وہاں حمزہ نے اُسے دیکھا۔ پھر آپ نے بھی اُس کے بارے میں بتایا تھا۔ حمزہ کو تو بہت دکھ ہوا۔ اور اُس نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ وہ اُسی سے شادی کرے گا۔ اور آپا آپ کو یاد ہوگا۔ جب میں پہلی بار حمزہ کو پاکستان لے کر آئی تھی تو رمشا ثناء کے پاس رہنے آئی تھی۔ اُن دنوں حمزہ اور رمشا کی کتنی دوستی ہوگئی تھی۔ دونوں ہر وقت سائے کی طرح ساتھ رہتے تھے۔" صفیہ ممانی خوش ہو کر پرانی باتیں دہرا رہی تھیں اور ثریا پھوپو کا دل اپنی چھوٹی بھاوج کی مکاری اور چالبازی پر آتش فشاں کی طرح دہک رہا تھا۔

"کیسی میسنی بنی رہتی ہے جیسے اِس کے دماغ میں عقل نام کی کوئی چیز ہی نہیں...... کیسی گھنی نکلی۔ حمزہ کو جان بوجھ کر [illegible] کی مظلومیت کے قصے بڑھا چڑھا [illegible] تھیں کہ بچہ معصوم ہے۔ کر بیان کیے ہوں گے جانی [illegible]

دل کا اچھا ہے، ہر ایک کی باتوں میں آ جاتا ہے۔"

"آپا آپ بھی ہمارے ساتھ بازار چلیے۔ حمزہ کہتا ہے نکاح کا جوڑا پھوپو کی پسند سے لوں گا۔" صفیہ نے جلدی پر تیل ڈالا۔

"زیادہ چاپلوسی کی ضرورت نہیں ہے جب رشتہ کرتے ہوئے ہم سے مشورہ نہیں کیا۔ تو اب جوڑا لیتے ہوئے مشورے کی کیا ضرورت...... تمہاری نظروں میں ہماری کیا اوقات ہے۔ سب سمجھ میں آ گیا۔ ہمیں تو غیروں کی طرح رشتے طے کرنے کے بعد بتایا جا رہا ہے۔" ثریا پھوپو کی زبان جس سے پورا رمضان پھول جھڑتے رہے تھے اب آگ برسا رہی تھی۔

"پھوپو ایسی بات نہیں ہے رمشا کے گھر والوں نے کل ہی فائنل جواب دیا ہے۔" حمزہ گھبرا کر بولا۔

"اے بیٹا ایسی باتیں نہ کرو کیا ہم تمہاری ماں کو جانتے نہیں...... کیسے چلتر سے میرے بھائی کو اپنی ماں بہنوں سے الگ کیا اور پردیس لے اڑیں۔ میری ماں روتے روتے دنیا سے چلی گئیں اور بیٹے کی صورت نہ دیکھ سکیں جیسا صفیہ نے میری ماں کے ساتھ کیا ہے۔ خدا اُس کے سامنے لائے گا خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔" ثریا پھوپو بلک کر رو رہی تھیں اور صفیہ ممانی کا چہرہ نفرت اور غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

دونوں کے ماسک اتر گئے تھے اور نند بھاوج کے اصلی چہرے سامنے آ گئے تھے۔ حسد، بغض اور عداوت سے سلگتے ہوئے چہرے اور حمزہ اُن دونوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی ہیں جو گزشتہ ایک مہینے سے شیر و شکر بنی ایک دوسرے کی تعریفوں میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا رہی تھیں۔

☆☆......☆☆

وفا حسن ہے محبت کا

''اُف کہاں بھاگی جارہی ہو۔ مجھ سے ڈرو مت۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔'' عقب سے اسے اجنبی کی آواز سنائی دی۔ حوریہ رو دینے کو تھی اس صورت حال میں اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی دوستوں کے ساتھ......

یہ بھی عجیب تھا وہ سارا دن اس ناسمجھ میں آنے والی کیفیت میں گنوادیتی جہاں بیٹھتی اٹھنے کا نام نہ لیتی ایسا لگتا تھا جیسے سب کچھ کھو گیا ہے اور وہ خالی دل خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔ محبت نہ رہے تو اور رہ بھی کیا جاتا ہے۔

بڑی دیر سے اس کے موبائل پر کال آرہی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔ کبھی اس کا کہا کوئی جملہ یاد آجاتا تو دماغ وہیں رک جاتا اور آنکھیں بار بار نم ہونے لگتیں۔ اس کا دل چاہتا تھا معاذ کی دھوکہ دہی پر کھل کر احتجاج کرے، چیخے چلائے، اس کا گریبان پکڑے اس کے منہ پر اتنے تھپڑ مارے کہ وہ تڑپ اٹھے۔ حوریہ کے اندر بگولے اٹھ رہے تھے۔ وہ صدمے کی کیفیت میں تھی۔ وہ اپنے خالی ہاتھ اور خالی دل کو دیکھتی تو ماتم کرتی۔ سب سے قیمتی شے محبت گنوادی تھی باقی بچا بھی کیا تھا۔

موبائل کی بیل ایک بار پھر چیخنے لگی۔ وہ اس وقت صحن میں درخت سے ٹیک لگائے بڑی پُرسکون بیٹھی تھی بظاہر پُرسکون نظر آرہی تھی مگر اس کے اندر طوفان اُٹھ رہے تھے۔ اس نے بے دلی سے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا۔ نئے نمبر سے کال تھی۔ اس نے یس کا بٹ دبا دیا۔

''ہیلو حوریہ!'' وہ بڑی بیقراری سے بولا تھا۔

وہ ساکت رہ گئی دوسری طرف وہی تھا۔ دشمن جاں، اس کے سکون کا قاتل، اس کے دل کو برباد کرنے والا۔ اس نے موبائل آف کر دیا تھا۔ وہ اسے بھول جانا چاہتی تھی مگر دل بھلانے پہ آمادہ نہ تھا۔ اسے اپنی بے بسی پر شدید غصہ آتا تھا۔ بعض چہرے کتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔ جی چاہتا ہے انہیں فرصت سے بیٹھ کر دیکھتے ہی رہیں۔ ایسا ہی چہرہ حوریہ کا تھا۔ یا معاذ کے لیے وہ چہرہ ایسا ہی تھا۔

اس دن صبح سے اس کا موڈ خوشگوار تھا اور کچھ موسم دلبربا تھا۔ وہ گھر سے نکلا تھا تو موسم کے تیور اتنے جارحانہ نہ تھے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے یکایک گہرے بادل چھا گئے اور چھما چھم موٹی موٹی بوندیں تیز بارش میں تبدیل ہوتی گئیں۔ تب ہی سفید یونیفارم میں ایک لڑکی تیزی سے چلتی ہوئی اس کے سامنے والے درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ بے چینی سے اپنی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ خوشبو کے جھونکے کی مانند اس کے پاس سے گزری تھی۔ اسے دیکھ کر لگا تھا خوب صورتی کی تکمیل تو اب ہوئی ہے۔ وہ قدرے اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا

کی کیفیت میں تھا۔ حوریہ نز... ۔ وہ نراس

اُسے خوفزدہ ہے... مسان سڑک کو اور ایک نظر

...دور دیکھا اور آنکھیں بند کر کے بس کے آنے

کی دعا کرنے لگی۔

تیز تیز چل کر اسٹال تک پہنچنے کی وجہ سے اس کی گلابی رنگت مزید دہک رہی تھی۔ شفاف چہرے پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ گھنیری پلکیں بارش کی وجہ سے بھیگ گئی تھیں۔ اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے ٹشو نکالا اور چہرہ اور پلکیں صاف کرنے لگی۔

حوریہ نے کن انکھیوں سے ساتھ کھڑے اجنبی کو دیکھا۔ جو اپنے لباس سے شخصیت سے بے حد سوبر لگ رہا تھا۔ وہ مہذب اور ہینڈسم نظر آ رہا تھا مگر اس وقت وہ جس بے خودی سے اسے گھور رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر ہرگز کوئی مثبت رائے نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

''اگر آپ برا نہ مانیں میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ بارش بہت تیز ہے اور اس طرح اکیلے آپ کا یہاں کھڑا ہونا مناسب نہیں۔'' کچھ دیر بعد معاذ اپنے مخصوص دلکش و نرم لہجے میں بولا تھا۔

حوریہ کو اس سے اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی تب ہی وہ حیران پریشان اسے دیکھے گئی۔ وہ بہت زیادہ پُراعتماد نہ تھی خاص طور پر جنس مخالف سے اسے بات کرنی نہیں آتی تھی۔ اس کے گھر کا ماحول بے حد سخت تھا۔ خاندان میں بھی کزنز سے میل جول کو برا سمجھا جاتا تھا۔ اس نے ہمیشہ خاندانی روایت کا احترام کیا تھا۔ اس لیے کبھی کسی کو اس سے شکایت نہ ہوئی تھی۔

''سوچنے میں صرف وقت کا زیاں ہوگا۔'' حوریہ کی خاموشی معاذ کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ حوریہ بنا جواب دیے تیز تیز قدموں سے چلنے لگی وہ اس کے پیچھے...... یہ سچ تھا کہ اس نے کبھی کسی لڑکی کا اس طرح پیچھا نہیں کیا تھا۔ مگر یہاں معاملہ دل کی بے اختیاری کا تھا۔

''اُف کہاں بھاگی جا رہی ہو۔ مجھ سے ڈرو مت۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔'' عقب سے اسے اجنبی کی آواز سنائی دی۔ حوریہ رو دینے کو تھی اس صورت حال میں اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی دوستوں کے ساتھ کالج آتی تھی مگر آج ٹیسٹ تھا۔ اس کی دوستوں کی تیاری نہ تھی انہوں نے چھٹی کر لی اور وہ آ گئی۔ وہ اچھی طالبہ تھی۔

''توبہ توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے شکل سے دیکھو لوگ کتنے شریف لگتے ہیں اور کرتوت......'' حوریہ نے سوچا۔ وہ مزید تیز چلنے لگی۔ تب ہی دور سے بس آتی نظر آئی۔ حوریہ کی جان میں جان آئی مگر یہ کیا وہ اتنی بھری ہوئی تھی اس میں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ تھی اس لیے ڈرائیور نے روکنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ حوریہ ساکت و جامد اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ معاذ اتنے میں اس تک آن پہنچا۔

''مس میں کوئی آوارہ لڑکا نہیں ہوں۔ آپ کی عمر کی دو بہنیں میرے گھر میں ہیں۔ وہ بھی کالج میں پڑھتی ہیں۔ اکیلے آپ کو دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ اب کچھ ہی دیر میں لڑکوں کی چھٹی ہو جائے گی۔ یہاں لڑکوں کا رش لگ جائے گا۔'' معاذ نے نرمی سے کہا۔ حوریہ خاموش رہی۔

''آپ نے کہاں جانا ہے؟'' معاذ نے اس کی لرزتی

پلکوں کو غور سے دیکھا۔

''گلشن اقبال۔'' حوریہ نے بمشکل کہا جب کہ وہ اس وقت ملیر اسٹاپ پر تھی۔

''میں آپ کی کوئی ہیلپ کرسکتا ہوں۔ مجھ پر تو آپ اعتبار کریں گی نہیں۔'' معاذ نے شوخ لہجے میں کہا۔

''کوئی رکشہ مل جاتا تو۔'' حوریہ نے نگاہیں چرائیں۔

''اس کے لیے آپ کو میرے ساتھ سڑک کے اس پار چلنا ہوگا۔ وہاں سے آپ کو مل جائے گا۔'' معاذ بولا۔

حوریہ خاموشی سے چل دی۔ معاذ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

''میرا نام معاذ ہے۔ میں علی انٹر پرائز میں جاب کرتا ہوں۔ گلشن میں رہتا ہوں اور غیر شادی شدہ ہوں۔'' وہ مسلسل بول رہا تھا۔

''مجھے آپ کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' حوریہ نے سوچا۔

دوسری طرف سے رکشہ نظر آیا۔ معاذ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ حوریہ نے ایڈریس بتایا۔ معاذ نے جلدی سے کرایہ دیا۔ حوریہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ چلا گیا۔ معاذ بے چینی سے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

دوسرے دن، تیسرے دن اس نے روزانہ اسے وہاں ڈھونڈنا شروع کردیا۔ مگر وہ نظر نہ آئی۔ وہ مایوس نہیں ہوا۔ ایک دن وہ اسے دو لڑکیوں کے ساتھ اسٹاپ پر نظر آئی۔

معاذ اس کے پیچھے ہولیا تھا۔ حوریہ نے اسے دیکھا تو حیران ہوئی مگر خوفزدہ نہیں تھی۔ اس کی دوست اس کے ساتھ بس میں بیٹھی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اسٹاپ پر اتری اب وہ اکیلی جارہی تھی۔

''مس پلیز میری باتیں سنیں۔'' معاذ نے پکارا۔

''جی۔'' وہ اعتماد سے مڑی۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' معاذ نے پوچھا۔

''میرا نام جان کر کیا کریں گے؟'' حوریہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپ کے گھر رشتہ بھیجوں گا نام نہیں معلوم ہوا تو کہیں آپ کی بہن سے نہ کردیں میری امی رشتہ۔'' معاذ مسکرایا۔

حوریہ بھی بے ساختہ مسکرادی تھی اور نام کے ساتھ موبائل نمبر بھی دے دیا۔ دونوں میں رابطہ ہوگیا تھا۔ حوریہ اس سے بہت محبت کرنے لگی تھی۔ حوریہ محبت میں بہت زیادہ وفا کی قائل تھی۔ وہ معاذ کے سوا کسی مرد کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ ایسا ہی وہ معاذ سے چاہتی تھی۔ معاذ بھی صرف اس سے محبت کرتا تھا۔

☆......☆......☆

محبت کا آفتاب طلوع ہوچکا تھا۔ اب تو اس کی روپہلی کرنوں کی تپش نے جسم سے روح تک کا سفر شروع کردیا تھا۔

وہ پہلی بار جب ہم ملے
ہوگئے شروع یہ سلسلے

حوریہ گنگناتی ہوئی کالج کی سیڑھیاں پھلانگ رہی تھی۔ اس کی دوست فری نے آج اسے گھیر لیا۔ وہ محسوس کررہی تھی مگر منتظر تھی کہ حوریہ خود سے ذکر کرے مگر حوریہ چپ تھی۔ فری کے اصرار پر اس نے سب بتادیا۔ فری جانتی تھی کہ حوریہ شفاف دل کی بہت شدید محبت کرنے والی لڑکی ہے۔

''اگر معاذ تمہارے علاوہ بھی لڑکیوں سے دوستی رکھتا ہو تو تم کیا کروگی۔'' فری نے پوچھا۔

''میں اس سے خفا ہوجاؤں گی۔''

''پھر کیا ہوگا؟'' فری نے اسے غور سے دیکھا۔

''پھر میں اس سے شادی نہیں کروں گی مگر وہ ایسا نہیں ہے۔ مجھے اس پر بہت مان ہے۔'' فری کو اس نے ناز سے کہا۔

''اتنا مان بھی مت کرو اگر ٹوٹ گیا تو......''

''وہ سچا ہے اس کی امی نے میرا رشتہ مانگا ہے۔ ہماری منگنی ہونے والی ہے۔'' حوریہ بولی۔

''سچا تو تمہارے ساتھ ہے مگر اوروں کے ساتھ تو فلرٹ کرسکتا ہے۔'' فری نے اُسے زچ کیا۔

''وہ ایسا نہیں کرسکتا۔'' حوریہ کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔

''آزمائش شرط ہے۔'' فری اترائی تھی۔ دراصل فری جیلس ہوگئی تھی۔ اس کے موبائل میں معاذ کی تصویر دیکھ کر، اس کی اتنی محبت حوریہ کے لیے وہ دوست بن کر ہضم نہیں کرپائی تھی۔ حوریہ کے چہرے پر بکھرے خوب صورت رنگ وہ دکھوں میں بدلنا چاہ رہی تھی۔

''یہ نمبر ہے اس کا میرا وعدہ ہے۔ میں اُسے نہیں بتاؤں گی۔'' حوریہ نے اٹل لہجے میں کہا تھا۔

فری نے خوشی خوشی معاذ کا نمبر لیا تھا گھر جاکر وہ اسے

میسج کر رہی تھی کہ وہ اس کی یونیورسٹی کے زمانے کی دوست ہے جو اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ مگر اقرار نہ کر سکی بڑی مشکل سے اس کا نمبر حاصل کیا ہے۔ معاذ حیران رہ گیا۔ یہ سچ تھا ایم کام میں یونیورسٹی میں اس کی بہت سی لڑکیوں سے بات چیت تھی۔ مگر اس طرح کی دوستی کسی کے ساتھ نہیں تھی۔ حوریہ کے لیے جو جذبات تھے وہ کبھی کسی کے لیے نہیں رہے تھے۔ فری کے میسج پر اس نے کال کی فری نے باتوں کو بہت گھمایا۔ معاذ کو شک نہیں ہونے دیا کہ وہ اسے جانتی بھی نہیں ہے۔ فری کی باتیں دلچسپ تھی۔ انہوں نے ایک گھنٹہ بات کی تھی۔ دوسرے دن فری نے اُسے معاذ کا نمبر اور کال ٹائم دکھایا۔ حوریہ کا چہرہ اُتر گیا تھا۔

معاذ نے حوریہ سے اس لیے ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کا دل صاف تھا۔ دوسرا حوریہ بہت وہمی اور شکی تھی۔ وہ کبھی برداشت نہ کرتی، معاذ صرف جاننا چاہتا تھا فری کون تھی۔ اس لیے بات کرتا رہا۔ حوریہ نے شک ظاہر کیا تو وہ ٹال گیا۔ حوریہ بدگمان ہو گئی تھی۔

''فری نے اُسے بتایا کہ آج لا ثانیہ میں ان دونوں کی ڈیٹ ہے۔'' حوریہ کو شدید دھچکا لگا تھا۔ فری نے اسے کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے گی۔ فری اچھی طرح جانتی تھی حوریہ کو کبھی بھی اجازت نہیں مل سکتی۔ اس لیے یہ جھوٹ بولا۔ درحقیقت اس نے معاذ سے ملنے کا کہا تھا مگر اس نے معذرت کر لی تھی اور اسے حوریہ کا صاف صاف بتا دیا تھا۔ فری کو شکست ہوئی تھی۔ مگر اس کے لیے یہ اَنا کی بات تھی۔ اس نے آگ دونوں کے درمیان لگانے کا سوچا تھا۔

حوریہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ اس نے معاذ پر اندھا اعتبار کیا تھا۔ اس کا دل ٹوٹا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا وہ کسی دل پھینک منافق انسان کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ لہٰذا اس نے فون کر کے سب رابطہ منقطع کرنے سے پہلے اسے وجہ بتائی تھی۔ خود پہ اتنے سنگین الزام معاذ سے برداشت نہیں ہوئے تھے۔ وہ تڑپ اٹھا۔ ہزاروں فون اور میسج کیے مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے بہنوں کو بھیجا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اسے سمجھ نہ آئی کیسے اس سے ملے۔ حوریہ کے گھر والے کبھی اس سے ملنے نہ دیتے اور کالج وہ آ نہیں رہی تھی۔ معاذ بے حد پریشان تھا۔ اس سے کیا خطا ہوئی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا۔

معاذ روزانہ اسٹاپ پر اس کا انتظار کرتا مگر وہ نہ آتی آخر کار ایک دن وہ اسے نظر آئی۔ وہ تیزی سے لپکا۔

''میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔'' حوریہ نے سخت انداز میں کہا۔

''تم ایسے مجھ سے جان نہیں چھڑا سکتی تمہیں مجھے وجہ بتانی ہوگی۔'' معاذ بھی اڑ گیا تھا۔

''میں ابھی یا چند سالوں میں شادی نہیں کر سکتی۔''

''حوریہ تم صرف میری محبت ہی نہیں زندگی بن چکی ہو۔ ایک بار کہہ دو تم میری ہو۔ پھر چاہے انتظار کی سولی پر چڑھا دو۔ میں ملن کی آس میں قیامت تک انتظار کر لوں گا۔'' معاذ کے لہجے میں التجا تھی۔ اور انسان التجا وہاں کرتا ہے جہاں وہ بے بس ہوتا ہے۔

اور ایک بار پھر حوریہ اس کے جذبوں کے سامنے ہار گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سچائی اور فری کی باتیں وہ کشمکش و پیچ میں تھی۔ اس نے معاذ سے پوچھا۔

''میرے علاوہ تم نے کبھی کسی لڑکی سے فون پر باتیں کی ہے؟''

''ہاں! پچھلے دنوں ایک رانگ کال آئی تھی۔'' معاذ نے پھر اسے تفصیل بتائی۔ وہ میسج بھی دکھائے جس میں اس نے فری سے ملنے کی معذرت کی تھی اور اسے صاف لفظوں میں حوریہ سے اپنی محبت کا بتایا تھا۔

بدگمانی کے بادل چھٹ گئے تھے۔ مطلع صاف تھا۔ حوریہ نے مسکراتے ہوئے اسے فری کا بتایا۔ معاذ اس کے بچکانہ پن پر ہنسا تھا۔

''آئندہ مجھ پر بے اعتباری کی تو میں تم سے ہمیشہ کے لیے دور چلا جاؤں گا۔''

''آئندہ کبھی آزماؤں گی نہیں کیونکہ مجھے پورا بھروسہ ہے۔'' حوریہ نے توبہ کی تھی۔

''وفا محبت کا حسن ہے وفا پہلی شرط ہے محبت میں......'' معاذ نے اسے کہا۔

''میں جانتی ہوں۔'' حوریہ مسکرائی۔ فری کی غلط فہمی دو دلوں کی جدائی کا سبب بن رہی تھی۔ مگر معاذ کی عقلمندی نے یہ غلط فہمی دور کر دی تھی۔

شکوہ دل میں رکھنے کے بجائے کر لینا چاہیے۔ بہت سے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔

☆☆......☆☆

چاند کے پار

"لیکن پہلے تو وہ ایک دن سے زیادہ کبھی میکے میں نہیں رہی کیا تمہارے صاحبزادے اس کی موجودگی سے اُکتا چکے تھے وہ اسے لینے کیوں نہیں گئے۔" حیدر علی نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔ سمیرا سٹپٹا گئیں ان کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگے۔ حیدر علی کے انداز کسی آنے والے......

زندگی کے کینوس پر رنگ بھرتے ناول کی دوسری اور آخری قسط

وہ لڑکی اس محلے کی ہے۔ بڑی خوبصورت نیک اور شریف لڑکی ہے۔ اس کے والد کا نام آفاق احمد ہے اور وہ کسی سرکاری آفس میں ہیڈ کلرک ہیں۔ مراد نے تفصیل سے ان کے سوالات کے جواب دیتے ہوئے کہا۔

سمیرا کو ایسا لگا جیسے ان کے سر پر چھت آگری ہو۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تیوریاں چڑھا کر غصے سے بولیں۔ ہمیں ذلیل کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا تمہارے پاس جو ایسے چھوٹے اور کم حیثیت لوگوں سے رشتہ جوڑنے کو سوچ رہے ہو لیکن میں کہے دیتی ہوں کہ میرے جیتے جی کبھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ سمیرا نے فیصلہ کن لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ آپ کا یہی جواب ہوگا۔" وہ ایکدم سے بھڑک اٹھا۔ مگر آپ بھی اس بات کو اپنے ذہن میں بٹھالیں کہ اگر میری شادی میری مرضی اور پسند سے نہ ہوئی تو میں بھی ساری عمر شادی نہیں کروں گا۔" مراد نے بھی کھل کر اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا۔

"تمہاری خودسری حد سے بڑھ چکی ہے مراد تم اپنی خاندانی عزت کیوں داؤ پر لگانے پر تل گئے ہو۔" وہ سمجھانے کے انداز میں نرمی سے بولیں لیکن مراد پر کسی نرمی گرمی کا کوئی اثر نہ تھا وہ تنتناتا ہوا گاڑی کی چابی لے کر باہر نکل گیا۔

سمیرا اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئیں۔ انسان بہت سی چیزوں کے بغیر زندگی گزار سکتا ہے لیکن اپنی عزت نفس اور خاندانی وقار بغیر نہیں جی سکتا اور سمیرا کو اپنی عزت اور اپنا خاندانی وقار جان سے بڑھ کر عزیز تھا۔ وہ مراد کی جذباتیت کے لیے اسے ہرگز نہیں گنوا سکتی تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مراد کو اس کے اس جنون سے باہر نکالنا کوئی آسان بات نہیں یہ ان کے حوصلوں کی کڑی آزمائش ہے مگر سر اٹھا کر فخر سے جینے کے لیے وہ اس پل صراط کو بھی بڑی آسانی سے پار کر سکتی تھیں۔ وہ بے حد پریشان تھیں کہ وہ اس سلسلے میں کس کی مدد لیں۔ بھائی نے تو حیدر علی کے جانے کے بعد انہیں قصوروار ٹھہراتے ہوئے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ وہ کون سا منہ لے کر ان کے پاس جاتیں۔

کاش آج حیدر یہاں موجود ہوتے تو مراد کو ایسا قدم اٹھانے کی ہرگز جرأت نہ ہوتی۔ حیدر علی کا تصور ذہن میں آتے ہی ان کو ایک نئی راہ مل گئی۔ جو کچھ بھی ہوا حیدر علی اپنے بیٹے کو ان راہوں سے کھینچ کر ضرور باہر لے آئیں گے جو اس کو پستیوں کی طرف لے جا رہی تھیں۔

حیدر علی ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے کہ سمیرا کا

فون آ گیا۔ وہ فون ریسیور کرنے کے بعد آ کر ایزی چیئر پر بیٹھ گئے۔
''کیا ہوا کس کا فون تھا حیدر سائیں۔'' مہر بانو نے انہیں خاموش اور اُلجھا ہوا سا دیکھ کر پوچھا۔
''سمیرا کا فون تھا۔ شاید کسی بڑی پریشانی میں مبتلا ہیں مجھے بڑی لجاجت سے ایک دن کے لیے بلا رہی تھیں۔ حیدر علی نے کھوئے کھوئے انداز سے جواب دیا۔
''آپ کو ضرور جانا چاہیے حیدر سائیں مصیبت کے وقت اپنوں ہی سے مدد طلب کی جاتی ہے۔ مہر بانو نے عادت کے مطابق وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔
حیدر علی نظروں میں محبت سموئے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دوسرے دن دوپہر سے پہلے ہی وہ حیدر پیلس میں موجود تھے۔ سمیرا نے ان کی طرف بڑے غور سے دیکھا۔ وہ یہاں سے جانے کے بعد بالکل بدل گئے تھے ان کی نظریں حیدر علی کے سراپا پر جم کر رہ گئی۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں میں چھائی ہوئی بے نیازی سرے سے ختم ہو چکی تھی۔ جسم پہلے کے مقابلے میں کافی بھرا بھرا تھا اور چہرے پر خون موجیں مار رہا تھا ان کے دل میں ایک بار پھر مہر بانو کے لیے حسد کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔
ہاں بھئی کون سی ایسی مصیبت آ پڑی تھی جس کے لیے اس خادم کی ضرورت پڑ گئی۔
حیدر علی نے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں سوال کیا۔
''کیا بتاؤں حیدر اس مراد نے تو میری زندگی کو ایک نئی آزمائش میں ڈال دیا ہے اب ایک نیا گل کھلا کر بیٹھا ہے۔'' سمیرا نے حیدر علی کی روشن پیشانی پر نظریں گاڑھتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔
''بہت خوب تو گویا کوئی گل کھلنے سے باقی رہ گیا تھا میں تو سمجھا تھا کہ آپ کے صاحبزادے اب تک پورا گلستان ترتیب دے چکے ہوں گے۔ حیدر علی کے لہجے میں تمسخر کے ساتھ طنز بھی شامل تھا۔
مراد کمرے میں سو رہا تھا باپ کی آواز سن کر چونک پڑا اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اب یقیناً اس کی زندگی میں جلد بہار آ جائے گی۔ حیدر علی کو ہمیشہ سے غریبوں کے ساتھ بے حد ہمدردی تھی اور محض غریبی کی بنا پر انہیں کبھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔
''آخر بات کیا ہے۔'' حیدر علی نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اب کسی لڑکی کے عشق کا بھوت دماغ پر سوار ہو گیا ہے۔ سمیرا نے مدہم آواز میں کہا۔
''یہ بھی کوئی نئی خبر نہیں ہے وہ تو ہوش سنبھالتے ہی اسی دشت کی سیاحی میں مصروف ہو گیا تھا۔ میں اب تک معاملہ کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا کہ مسئلہ کیا درپیش ہے۔''
''بات یہ ہے کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جو کسی طرح بھی ہمارے خاندان کے لائق نہیں ہے۔'' سمیرا نے مسکین صورت بنا کر کہا۔
''لیکن اس میں ایسا کون سا قابلِ اعتراض عیب ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔ اور سمیرا کے جواب دینے سے پہلے مراد جو باہر کھڑا اماں باپ کی گفتگو سن رہا تھا کمرے میں آ کر باپ کو سلام کرنے کے بعد کہنے لگا۔
''ڈیڈی میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ممی کو کس بات پر اعتراض ہے۔ دراصل وہ لڑکی ہماری طرح دولت مند نہیں ہے بلکہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور ایک معمولی سی اسکول ٹیچر ہے۔''
''ہاں تو اس میں غلط کیا ہے جو لوگ ہمارے برابر بیٹھنے کے قابل نہیں ہیں انہیں تم ہمارے سروں پر مسلط کرنا چاہتے ہو تو کون تمہاری پسند کو سراہے گا۔ سمیرا نے خفگی سے کہا۔
''سمیرا بیگم میرے خیال میں تم زیادتی کر رہی ہو۔ غریب یا کم حیثیت ہونا اتنا بڑا جرم نہیں ہے کہ اولاد کو بھی اس کی خوشیوں سے محروم کر دیا جائے۔
حیدر علی نے ملامتی نظروں سے سمیرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
لیکن حیدر یہ تو سوچیے کہ ہمارا اپنا بھی ایک نام ہے مقام ہے سوسائٹی میں، معاشرے میں عزت ہے اس شادی سے سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔ خاندان والے الگ ہم پر انگلیاں اٹھائیں گے۔'' سمیرا نے جذباتی ہو کر تیز آواز میں کہا۔
''خاندان والوں کو ہمارے ذاتی، معاملوں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔ رہ گئی عزت کی بات تو اس وقت آپ کو عزت کا خیال کیوں نہیں آیا۔ جب یہ سرِ عام

خاندان کی عزت کا جنازہ نکال رہے تھے۔ حیدر علی نے طیش میں آتے ہوئے کہا۔

''رہنے دیں ڈیڈی ممی سے کچھ کہنا سننا بے کار ہے ان کو اپنا اسٹیٹس مجھ سے زیادہ عزیز ہے لیکن میں بھی انہی کا بیٹا ہوں ساری زندگی ایسے ہی گزار دوں گا لیکن کبھی شادی نہیں کروں گا۔ مراد نے اضطرابی کیفیت میں اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

''تم آج بھی اسی ضد اور خودنمائی پر آمادہ ہو سمیرا میں نہیں جانتا کہ تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو اور کس کے بل بوتے پر اتنی اکڑ دکھا رہی ہو تم کو میرے ضبط اور حوصلے کا تو جو امتحان لینا تھا لے چکیں کم از کم اپنی اولاد کو تو بخش دو۔'' حیدر علی کی آواز میں دکھ اور غصے کی آمیزش تھی۔

''اچھا میں چلتا ہوں جب تمہیں اپنی انا پرستی اس قدر عزیز تھی تو مجھے بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر نہیں تم جیسی عورت کے لیے تو اپنی خودسری ضد اور گھمنڈ سب کچھ ممکن ہے سوائے صبر اور سمجھوتے کے حالانکہ گھر کی بنیاد ہی ہمیشہ محبت درگزر اور سمجھوتے پر رکھی جاتی ہے۔'' وہ تلخی سے بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

سمیرا کی اس بے حسی ضد اور احساسِ برتری نے مراد کو اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ مراد کی آنکھوں میں بے بسی سے آنسو آ گئے وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کبھی اس کی خواہش پوری نہیں کرے گی۔

سمیرا کی نظر جیسے ہی بیٹے کے غمزدہ چہرے پر پڑی تو ان کے دل پر گھونسا سا لگا اور وہ بہت ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''میری ممتا کو اور زیادہ نہ آزماؤ مراد تمہاری خوشیاں مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں۔'' مراد کو اپنے کانوں سے اعتبار اٹھتا محسوس ہونے لگا۔

حیدر علی بھی حیرانی اور بے یقینی سے سمیرا کی طرف دیکھ رہے تھے کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی جلدی پتھر میں جونک کیسے لگ سکتی ہے۔ مگر جب سمیرا نے اپنے الفاظ دہرائے تو مراد کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا آنکھوں میں دیوالی کے دیوں جیسی جگمگاہٹ نظر آنے لگی اسے بھی اپنے خوابوں میں اتنی جلدی رنگ بھرنے پر حیرت ہو رہی تھی۔

حیدر علی نے مراد سے کہا تم ان لوگوں کو انفارم کر دو کہ ہم دونوں شام کو ان کے گھر آ رہے ہیں۔

مراد کا فون کلثوم نے ریسیو کیا تھا کرن دوسرے کمرے میں کوئی کام کر رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آئی تو کلثوم کو فون پکڑے فکرمند بیٹھے دیکھ کر بولی کیا بات ہے امی آپ خاموش کیوں ہیں کس کا فون تھا۔ کلثوم کے بتانے پر وہ چونک پڑی میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آخر ان لوگوں کو ہم سے ملنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی میرا تو دل ہول رہا ہے۔ کرن گھبرا کر بولی۔

''امی آپ مجھ سے قسم لے لیجیے میرا اس میں کوئی پیچ نہیں ہے میں تو خود اس کو کئی بار برا بھلا کہہ چکی ہوں لیکن وہ تو جان کو ہی آ گیا ہے کمبخت کو چین نہیں آیا۔ اور ماں باپ کو بھی بھیج رہا ہے۔ کلثوم سارا معاملہ سمجھ گئیں ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ان کی بیٹی کا اتنے بڑے گھر سے رشتہ آنیوالا تھا۔ خوشی سے ان کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اور پھر جلد ہی سارے معاملات آپس میں طے ہو گئے اور شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔

مراد کی خوشیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اگر جذبات کے ان مچلتے طوفانوں کو کسی دریا میں پھینک دیا جاتا تو شاید اس میں بھی طوفان آ جاتا مگر سمیرا کا دل اندر سے بجھا بجھا تھا۔ وہ بیٹے کی ضد کے سامنے پگھل تو گئی تھیں۔ مگر ذہن کرن کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا وہ کرن کے حسن سے بھی خائف تھیں اور مراد کا جذباتی پن بھی ان کو کھٹک رہا تھا وہ ہر وقت اسی سوچ میں ڈوبی رہتیں کہ کل جب وہ لڑکی گھر میں قدم رکھے گی تب تو وہ بالکل ہی اپنی سدھ بدھ گنوا بیٹھے گا۔

پھر جلد ہی وہ دن بھی آ گیا جب وہ دلہن بن کر مراد کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر دلہنوں والا شرمیلا تاثر اور نہ ہی کوئی کومل احساس روح کی گہرائیوں میں اترتا محسوس ہو رہا تھا البتہ مستقبل کے اندیشے ضرور رہ رہ کر دل میں دھڑک رہے تھے۔

شادی ہال سے رخصت ہو کر وہ حیدر پیلس آ گئی جو برقی قمقموں سے اس طرح جگمگا رہا تھا جیسے چاند تاروں کے قافلے اسی جگہ آ کر ٹھہر گئے ہوں۔ رسمیں پوری ہونے

کے بعد اس کو مراد کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ عافیہ نے آ کر اس کا میک اپ وغیرہ درست کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

تنہائی ملتے ہی اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ دوسری قیمتی آرائش اشیاء کے علاوہ میزوں پر رکھے نیم برہنہ عورتوں کے مجسمے اپنے مکین کی رنگینی طبع کے ساتھ اس کی دولت و ثروت کی بھی کہانی سنا رہے تھے۔ قدموں کی آہٹ سن کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی نہ چہرے پر شفق پھوٹی نہ پلکیں صبیح رخساروں پر جھکیں اور نہ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوئے۔

مراد اس کا گھونگھٹ اٹھا کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔ کرن میں نے ایک لمبی مسافت طے کر کے تمہیں اپنایا ہے۔ میں ایک عرصے سے اپنے آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چکا ہوں۔ مجھے تمہاری محبت کی چھاؤں چاہیے ہم دونوں مل کر محبت اور خلوص کے سائے میں اپنے بچوں کو کسی محرومی کا شکار نہیں ہونے دیں گے۔

''بولو کرن تم ہمیشہ میرا ساتھ دو گی۔'' وہ آنکھوں میں امید کے دیے جلائے کرن سے پوچھ رہا تھا۔

کرن کے سارے اندیشے مراد کی چاہتوں کے سمندر میں بہہ گئے آنے والا وقت ایک خوب صورت منزل کے روپ میں اس کے سامنے تھا۔ وہ جذبات کے طوفانوں میں بہنے سے خود کو نہ روک سکی اور شرما کر اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

حیدر علی نے ولیمہ کا ڈنر ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں دیا تھا۔ بڑے بڑے لوگ مدعو تھے۔ کرن کے سادہ اور معصوم حسن کو دیکھ کر سب ہی تعریف کر رہے تھے خاص طور سے خواتین تو اس بات پر حیران تھیں کہ آخر اس صاف وشفاف چہرے کے پیچھے کون سا راز پوشیدہ ہے وہ چہرہ جسے دیکھ کر ایسا لگتا جیسے روشنیاں تہہ در تہہ اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ سچ بتائیں مسز حیدر آپ کو یہ چاند کا ٹکڑا کہاں سے مل گیا اور سمیرا ایک فاتحانہ نظر دلہن پر ڈال کر مسکراتی رہیں۔

نئے جوڑے کو ویسے تو بہت بیش قیمت تحائف ملے تھے مگر ان میں حیدر علی کی دی ہوئی سرخ رنگ کی اسپورٹ کار بہت نمایاں تھی جسے دیکھ کر سمیرا اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکیں۔ اور اپنی بھاوج کے سامنے حیدر علی سے کہنے لگیں۔

''انسان کو تحفہ بھی اس کی حیثیت کے مطابق دینا چاہیے۔ اس بے چاری کی تو سات پشتوں میں بھی کسی کو کار چلانا نہیں آتی ہو گی۔''

حیدر علی کو ان کی کم ظرفی پر غصہ آ گیا۔ تیز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

''ابھی اس بے چاری کو اس گھر میں آئے صرف تین روز ہوئے ہیں اور تم نے ابھی سے طنز کے تیر چلانا شروع کر دیے کبھی تو اپنی زبان قابو میں رکھا کرو۔''

کچھ دور بیٹھی کرن نے بھی شاید ان کی باتیں سن لی تھیں اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔ مگر مراد کی چاہت نے اسے زیادہ دیر افسردہ نہ رہنے دیا۔ اور تب اس نے سوچا ایسے پیار کرنے والے جیون ساتھی کی خاطر اس کی ماں کی کڑوی کسیلی باتیں سن لینے میں کوئی حرج نہیں۔ وجیہہ نے بھی حیدر علی کے جانے کے بعد سمیرا کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

''سمیرا تم کیوں گڑے مردے اکھاڑنے بیٹھ جاتی ہو اب تم ایسی باتیں کر کے بیٹے کو نہ ہاتھ سے گنوا دینا۔'' پھر یہ سن کر تو سمیرا کے کلیجے پر اور بھی سانپ لوٹ گئے کہ حیدر علی بیٹے بہو کو پاکستان کے تفریحی اور تاریخی مقامات پر ہنی مون منانے کے لیے بھیج رہے ہیں۔ بڑے میاں کو اب سارے چونچلے سوجھ رہے ہیں میری شادی کے وقت تو جیسے ان پر اوس پڑ گئی تھی۔

کرن نے ان خوبصورت نظاروں کے بارے میں صرف دوسروں سے سنا تھا یا پھر کلینڈر کے صفحات پر تصویریں دیکھی تھیں۔ مگر اب تو قدرت نے اپنا تمام حسن ساری رعنائیاں سمیٹ کر اس کے قدموں تلے ڈھیر کر دی تھیں۔ وہ اونچے اونچے فلک بوس پہاڑوں گنگناتی جھیلوں سرسبز وادیوں اور پھولوں سے جھکی درختوں کی ڈالیوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

ان حسین نظاروں کے ساتھ مراد کا ساتھ اس کی دل کو چھو لینے والی محبت آمیز باتیں کرن کی روح تک کو سرشار کر دیتیں۔

وہ خود کو بے حد خوش نصیب تصور کرنے لگی تھی مراد نے اُس کو زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ کبھی کبھی اسے اپنی سوچوں پر شرمندگی ہونے لگتی۔ وہ مراد کو کیا سمجھتی تھیں اور وہ کیا نکلا۔

مراد کو تو دن رات اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے سے فرصت نہ تھی۔ کرن جب بھی آئینے میں خود کو دیکھتی تو حیران رہ جاتی۔ مراد کی چند روزہ رفاقت نے اس کے حسن کو کیسا نکھار بخش دیا تھا کہ اپنے آپ پر پیار آنے لگتا۔ مراد کی خوشیاں تو بام عروج پر تھیں۔ کرن کو پا کر اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی انمول خزانہ ہاتھ آ گیا۔ ہر وقت اس پر خمار سا چھایا رہتا مگر اس خمار میں کسی عیاشی کی چھاپ نہ تھی اس کا چہرہ بالکل کسی معصوم بچے کی طرح نظر آتا اور پھر یہ کیف آور لمحات اور مہکتے دن رات جیسے پلک جھپکتے بیت گئے۔ کرن گھر آنے کے خیال سے خوف زدہ تھی۔ لیکن مراد کے ساتھ نے اس کو بڑا مضبوط اور بہادر بنا دیا تھا۔

سمیرا نے کرن کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ پہاڑوں کی تازہ اور کھلی آب و ہوا نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ اور کھلی کھلی دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں ہر وقت کمرے میں بند رہتے۔ جب دبی دبی ہنسی کی آوازیں باہر تک آنے لگتیں تو سمیرا کا دل اندر ہی اندر سلگتا رہتا۔

''کاش میں نے اس دن مراد کی جذباتی بلیک میلنگ سے متاثر ہو کر اس شادی پر رضامندی نہ ظاہر کی ہوتی تو آج میں اپنی ساری عمر کی کمائی کو ایک اجنبی لڑکی کے ہاتھوں میں سونپ کر اپنے لٹ جانے کا سوگ نہ منا رہی ہوتی۔''

حیدر علی کے دل میں مراد کی طرف سے جو میل تھا وہ آہستہ آہستہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے کرن کی عزت نفس کو برقرار رکھنے کے لیے مراد کو کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں منیجر کا عہدہ دلا دیا تھا۔ جہاں وہ محنت اور دل جمعی سے کام کر رہا تھا۔

مراد کے آفس جاتے ہی سمیرا کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جاتا وہ اٹھتے بیٹھتے اس کی غریبی کو نشانہ بنانے سے نہ چوکتیں اور وہ اپنے سامنے کھڑی اس مغرور عورت کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھتی رہ جاتی۔ کبھی تو نیکی خدا ترسی اور انسانیت پر سے اس کا اعتبار ڈگمگانے لگتا لیکن مراد کی بے لوث محبت اس کو مکمل طور پر بے یقین ہونے سے بچا لیتی۔

دن رات کی محنت اور دوڑ دھوپ نے حیدر علی کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ انہیں سکون و آرام کی سخت ضرورت تھی۔ مراد کے راہ راست پر آنے کے بعد وہ مکمل طور سے مطمئن اور بے فکر ہو کر لندن چلے گئے۔ کچھ دن تک تو مراد کی چاہتوں کے سنگ وقت سبک خرامی سے گزرتا مگر اچانک کرن کو محسوس ہوا جیسے مراد کا جوش جنوں ٹھنڈا پڑ چکا ہے اس کی توجہ میں کمی آنے لگی تھی اور گھر بھی دیر سے آنے لگا تھا۔ پہلے تو وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر دل کو سمجھاتی رہی لیکن جب مراد کے رویہ میں کوئی فرق نہ آیا تو ایک روز اس کے لبوں پر شکوہ پھسل گیا۔

''سوئٹ ہارٹ تم مجھ سے بدگمان نہ ہو یہ سب کچھ میں کس کے لیے کر رہا ہوں تمہیں عیش و آرام کی زندگی دینے کے لیے ہی تو مجھے اتنی محنت کرنا پڑتی ہے۔'' مراد نے اس کو پیار سے سمجھانا چاہا مگر جانے کیوں کرن کو ایسا لگ رہا تھا جیسے زبان سے یہ الفاظ ادا کرتے وقت مراد کی آنکھیں اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہی ہیں۔

اس نے اُداس لہجے میں کہا۔

''لیکن مراد آپ جانتے ہیں کہ میری خواہشوں کا گھیرا اس قدر طویل نہیں ہے جس کے لیے آپ خود کو ہلکان کریں۔ میرے لیے تو صرف آپ کی توجہ اور محبت کافی ہے۔ اور مراد اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے کرن کی بات ٹال گیا۔ لیکن جب مراد مستقل گھر سے غائب رہنے لگا تو کرن کی پریشانیوں میں اضافہ ہونے لگا۔

اکثر وہ کھانا بھی باہر سے کھا کر آ جاتا کرن کے شکوہ کرنے پر وہ ناراض ہو کر اسے جھڑک دیتا۔ اور وہ سہم کر خاموش ہو جاتی انہیں دنوں اس کی طبیعت گری گری رہنے لگی اور ہر وقت چکروں کی شکایت رہتی۔ میڈیکل چیک اپ سے پتہ چلا کہ وہ ماں بننے کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ اس خبر سے کرن کو بڑی تقویت پہنچی اس نے سوچا میں یہ خوش خبری فون پر نہیں بلکہ مراد کو خود سناؤں گی۔ شاید وہ مراد کے چہرے پر خوشی کا تاثر دیکھنے

کے لیے بے چین تھی۔ اور جب اس نے شرما کر شرمیلی آواز میں مراد کو یہ بات بتائی تو خوش ہونے کے بجائے وہ تیوریاں چڑھا کر بولا۔

"یار یہ تم نے ابھی سے کیا مصیبت پال لی ابھی تو خود ہمارے کھیلنے اور کھانے کے دن ہیں۔"

کرن کا دل جیسے کسی نے بند مٹھی میں جکڑ لیا وہ بھرائی آواز سے کہنے لگی۔

مراد یہ تو اللہ کی دین ہے لوگ ترستے ہیں اولاد کے لیے اور آپ ......" اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی مراد کروٹ بدل کر سو گیا۔

کمرے میں اس کے خراٹوں کی آواز گونجنے لگی۔

کرن مستقل کروٹیں بدل رہی تھی اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ مراد اس بے رخی اور بے زاری کی وجہ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی تھی۔ دل و دماغ تشویش کے شکنجے میں جکڑتے جا رہے تھے۔

مراد ایک ہرجائی صفت انسان تھا۔ ان چھ مہینوں میں اس کے عشق کا خمار اتر چکا تھا اور اب وہ کرن سے بے زار ہو چلا تھا۔ اسے کرن کے حسن میں کوئی کشش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کلی کلی منڈلانے والا بھنورا صفت مراد ان دنوں ایک کرسچن لڑکی جینی کی زلفوں کے جال میں بری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔ وہ اس کے سامنے والے آفس میں پرسنل سیکریٹری تھی۔

ایک دن وہ کسی کام سے مراد کے آفس آئی اور اسے دیکھ کر مراد کا دل ڈانوڈول ہونے لگا۔ جینی کو امیر نوجوانوں کو پھانسنے میں بڑی مہارت تھی۔ مراد کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھرتے دیکھ کر اس کے حوصلوں کو اور بھی تقویت مل گئی وہ بہانے بہانے روز اس کے پاس آنے لگی مراد دن بدن جینی کے نزدیک اور کرن سے دور ہوتا جاتا رہا تھا۔ آفس ختم ہونے کے بعد اس کا سارا وقت جینی کے ساتھ گزرتا۔ دونوں دیر تک ساتھ گھومتے پھرتے اور اکٹھا ڈنر کرتے۔

جینی کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ اس کی ماں شوہر سے لڑ جھگڑ کر طلاق حاصل کرنے کے بعد لندن چلی گئی تھی اور اس کے باپ نے اس غم میں بے تحاشہ شراب پینا شروع کر دی کہ اس کا جگر چھلنی ہو گیا اور ایک روز اس کی موت واقع ہوئی۔ جینی نے باپ کی موت کے بعد ماں سے تعلقات منقطع کر دیے اور اکیلے زندگی گزارنے لگی کچھ عرصہ قبل اس نے ایک امیر آدمی سے شادی کر لی تھی مگر اب اس سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔

جب سے جینی کو اس بات کا پتہ چلا کہ مراد اپنے باپ کی ساری دولت اور جائیداد کا تنہا وارث ہے اس کے منہ میں پانی آ گیا اور وہ ہر طرح سے مراد کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مراد تو خود ہی اس کی اداؤں کا دیوانہ ہو رہا تھا بے اختیار کھنچتا چلا گیا۔

وہ برسات کی ایک طوفانی رات تھی۔ مسلسل دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ کرن کی نگاہیں بار بار گھڑی کی سوئیوں سے الجھ رہی تھیں رات کے بارہ بج رہے تھے اور ایسے موسم میں مراد کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیالات آ رہے تھے اور وہ گھبرا گھبرا کر بار بار مراد کو فون کر رہی تھی۔ لیکن اس کا موبائل فون مستقل بند تھا۔ وہ سمیرا کے پاس جا کر کہنے لگی۔

"ممی مراد آپ سے تو کچھ کہہ کر نہیں گئے نہ جانے اس وقت وہ کہاں ہوں گے میرا دل ہول رہا ہے۔"

سمیرا نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"بی بی اس میں ہولنے والی کون سی بات ہے۔ مراد کوئی معمولی ملازم تو ہے نہیں کہ اسکول کے بچوں کی طرح چھٹی ہوتے ہی سیدھا گھر بھاگا چلا آئے۔ بڑے آدمیوں کی سو طرح کی ایکٹیوٹیز ہوتی ہیں۔ میٹنگز اور پارٹیاں اٹینڈ کرنی پڑتی ہیں۔ باہر سے آئے لوگوں کے ساتھ ڈیل کرنا بھی ان کی ذمے داری میں شامل ہے۔ مگر تم ان باتوں کو کیا سمجھو گی۔" وہ اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چلی آئی۔ سمیرا نے اس کی پریشانی کا بھی کوئی خیال نہ کیا اور اس وقت بھی اپنی عادت کے مطابق دبی دبی چوٹ کرنے سے باز نہ آئیں۔

کمرے میں جانے کے بجائے وہ اوپر ٹیرس پر چلی گئی۔ جہاں سے سڑک پر گزرنے والی کاریں صاف نظر آتی تھیں۔ وہ ٹیرس پر پڑی ہوئی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی اور لان کی طرف دیکھنے لگی۔ بارش رک گئی تھی مگر درختوں سے پانی کے قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔ لان میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چوکیدار بھی بارش کی وجہ سے گیٹ پر

موجود نہیں تھا۔ وقفہ وقفہ سے جھینگروں کے بولنے کی آوازیں کچھ دیر کے سناٹے میں گونجنے لگتیں۔ یا پھر سڑک سے گزرنے والی اِکا دُکا گاڑیاں اس جمود کو توڑ کر رکھ دیتیں۔ وہ سڑک پر نظریں جمائے بیٹھی تھی اسی وقت مراد کی گاڑی آکر گیٹ کے سامنے رُک گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسری کار بھی اسی کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ کرن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ دوسری کار میں ایک لڑکی اتری اور آکر مراد کے نزدیک کھڑی ہوگئی۔ لڑکی نے ٹراؤزر کے اوپر مختصر سی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیوں میں جلتی ہوئی سگریٹ دبی تھی اور شانوں تک کٹے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔

کرن کی سانسیں رُکنے لگیں۔ وہ سکتہ کے عالم میں بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ مراد نے ہنستے ہوئے لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے آپ سے اور نزدیک کرلیا اور جھک کر اس کے کان میں نہ جانے کیا کہا کہ لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کرن کے دل پر جیسے کوئی بوجھ آگرا اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں اور حلق بالکل خشک ہوگیا۔ اس سے مزید کچھ اور نہ دیکھا گیا دیکھنے سننے کے لیے بچا ہی کیا تھا وہ اپنے وجود کو گھسیٹتی سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی آنسوؤں کے باعث منظر دھندلا چکا تھا اور شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ وہ سیڑھیوں پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور لڑھکتی ہوئی نیچے آ گئی۔ اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا آنکھ کھلی تو وہ اسپتال کے ٹھنڈے کمرے میں تھی کئی اجنبی چہرے اس کے اردگرد موجود تھے۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کی کوکھ اجڑ چکی ہے۔

کرن اب تمہاری کیسی طبیعت ہے ادھیڑ عمر لیڈی ڈاکٹر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔ تو اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہہ کر سفید تکیے میں جذب ہونے لگے۔

''صبر کرو میری بچی، خدا کو یہی منظور تھا۔'' کلثوم نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے شفقت بھرے لہجے میں کہا تو کرن کے آنسوؤں میں اور بھی روانی آگئی۔ آج وہ تنہا تھی بے بس تھی اور خالی ہاتھ تھی۔ قدرت نے اس کا دل بہلانے کا آخری سہارا بھی اس سے چھین لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کا پانی بھی ختم ہوگیا تھا اور خالی خالی ویران آنکھیں لیے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے اس بات کا شدت سے احساس ہوگیا تھا کہ اس کے آنسوؤں میں اب کوئی تاثیر نہیں رہی۔

اسپتال میں اس کی عیادت کے لیے بہت سے لوگ آئے سمیرا بھی ایک دوبار کھڑے کھڑے آکر رسماً اس کا حال چال پوچھ گئیں مگر وہ ستم گر ایک بار بھی رسماً بھی اس کو دیکھنے نہ آیا جو اسے اس حالت کو پہنچانے کا ذمے دار تھا۔

گھر آنے کے بعد اس نے خود کو یکسر بدل لیا تھا اب وہ مراد سے کسی قسم کے سوال جواب نہ کرتی۔ وہ رات کے جس حصے میں بھی آتا اس سے کچھ نہ پوچھتی۔

مراد کو کرن کی اس رویے پر تعجب تو تھا مگر وہ اس کا کھوج نہیں لگانا چاہتا تھا۔ جان بوجھ کر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا کون سی عقل مندی تھی اور پھر کرن کی اس خاموشی اور گریز کی وجہ سے اس کو اور بھی آسانی ہوگئی تھی اور بلاوجہ کے سوال جواب میں اُلجھنے سے نجات مل چکی تھی۔

دونوں ایک گھر میں ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے اجنبیوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ کرن کو ذہنی اذیت اور اندر کی گھٹن نے بے حد کمزور کردیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ وہ چہرہ جو کبھی چاند کی طرح دمکتا تھا اب اس پر صرف دکھ کے گہرے سائے ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔

اس دن وہ رات کو نہ جانے کس وقت گھر آیا تو اس کی نظر کرن پر پڑگئی جو بیڈ پر لیٹی ہوئی کسی میگزین کے ورق اُلٹ پلٹ رہی تھی۔ بلیک کپڑوں میں کرن کا سوگوار حسن اس کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا۔ اس کی نظریں کرن پر جم کر رہ گئیں۔ سیاہ لمبے بال تکیے پر بکھیرے وہ مراد کی آمد سے بے نیاز تھی۔ مراد اپنی سرخ سرخ مخمور آنکھوں سے اس کو گھورتا کرن کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا ارادہ بھانپ کر کرن جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ شراب کے نشے میں مست مراد نے اس کو دبوچنے کی کوشش کی لیکن وہ اسے نفرت سے دھکا دے کر کھڑی ہوگئی۔

"یہ کیا حرکت ہے یار میں تمہارا شوہر ہوں۔ میرا تم پر پورا حق ہے۔" مراد کے منہ سے الفاظ اٹک اٹک کر نکل رہے تھے۔ کرن کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"شرم نہیں آتی آپ کو میرا شوہر کہتے ہوئے۔ اپنی شامیں آوارہ عورتوں کے ساتھ گزار کر آپ جب چاہیں گے اپنا حق جتانے میرے پاس آجائیں گے۔ مجھے گھن آتی ہے تم سے۔" وہ نفرت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

مراد غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے کرن کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے تھپڑوں کی بارش شروع کردی ساتھ ہی ساتھ وہ مغلظات بھی بکتا جا رہا تھا۔

اس کے وحشی پن کے سامنے بے بس ہو رہی تھی۔ جسم چوٹوں سے لہولہان ہو رہا تھا اس کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ مراد مارتے مارتے بے دم ہو کر ہانپ رہا تھا۔ چیخ پکار سن کر سمیرا کمرے میں آگئیں۔

"یہ کیا ہو رہا تھا مراد خاندان کی عزت کو مٹی میں ملانے کی یہی کسر باقی رہ گئی تھی۔" وہ مراد کی طرف رُخ کرتے ہوئے غصے سے بولیں۔

"مجھے کیا کہہ رہی ہیں اس کی زبان نہیں دیکھتیں۔" مراد نے حقارت سے کرن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کم ظرف لوگوں سے اس کے علاوہ اور کیا امید کر سکتے ہو۔ میں نے کتنا سر پٹخا تھا کہ ان گھٹیا لوگوں سے رشتہ نہ جوڑو، لیکن تم نے میری ایک نہ سنی ساتھ میں باپ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔" سمیرا جی بھر کے کرن کی تحقیر کرتے ہوئے بولیں۔

"ہاں ہم لوگ گھٹیا ہیں غریب ہیں مگر ہمارے پاس اتنی شرافت تو ہے۔ ہمارے مرد اپنی عورتوں کو جانوروں کی طرح پیٹتے نہیں ہیں۔" وہ روتے روتے بولی۔

"دیکھ لیا آپ نے قینچی کی طرح اب بھی زبان چل رہی ہے اتنی مار کھا کر بھی اس کے ہوش ٹھکانے نہیں آئے۔" مراد کا لہجہ آگ برسا رہا تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"اچھا تم یہاں سے اٹھو اور میرے کمرے میں جاؤ۔" سمیرا نے کہا۔

"میں تو ہمیشہ کے لیے یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔" سمیرا دہل کر رہ گئیں۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو مراد تم اس دو ٹکے کی لڑکی کی وجہ سے اپنا گھر چھوڑنے پر آمادہ ہو۔ میں تو کہتی ہوں تم اسی کو نکال باہر کرو۔" سمیرا نے بیٹے کو مشورہ دیا۔

"جی نہیں میں اس کے لیے نہیں اپنی خوشی کے لیے جا رہا ہوں۔ جینی نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے ہم دونوں شادی کے بعد لندن سیٹل ہو جائیں گے۔"

تمہارے لیے لڑکیوں کی یہاں بھی کوئی نہیں ہے۔ اس عمر میں مجھے اکیلے چھوڑ کر تم بھی چلے گئے تو میں کس کے سہارے زندہ رہوں گی۔" سمیرا نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں یہ سب نہیں جانتا۔ آپ نے میرے لیے کون سا اپنے شوق اور دلچسپیاں چھوڑ دی تھیں۔ مجھے سب یاد ہے اکیلے پڑا روتا رہتا تھا۔ مراد نے جلدی جلدی اپنا ضروری سامان بیگ میں بھرتے ہوئے جواب دیا تو سمیرا کی سٹی گم ہو گئی۔

زندگی میں کبھی ایسا بھی وقت آئے گا یہ تو انہوں نے بھول کر بھی نہ سوچا تھا۔ مراد اپنے شانے پر اپنا وزنی بیگ لاد کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

سمیرا اس کے پیچھے گیٹ تک چلی آئیں اور منت سماجت کر کے روکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ لیکن مراد نے نہ ان کی آواز پر کان دھرے اور نہ مڑ کر دیکھا یہ کہتے ہوئے کار اسٹارٹ کردی کہ ڈرائیور کو بھیج کر صبح جینی کے گھر سے گاڑی منگوا لیجیے گا۔"

مراد کے جاتے ہی وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کرن کے پاس آ کر غضب ناک لہجے میں کہنے لگیں۔

"جب میرا بیٹا گھر چھوڑ کر چلا گیا تو یہاں کیا کر رہی ہے چل اُٹھ کر اپنا راستہ لے لیں میں صبح ہونے کے بعد تجھ کو یہاں نہ دیکھوں۔"

"آپ مجھے صبح ہونے سے پہلے ہی یہاں نہیں دیکھیں گی۔ میں خود ایسے گھر میں رہنے پر لعنت بھیجتی ہوں جہاں انسانوں کے روپ میں جنگلی درندے بستے ہیں۔" کرن نے زہر اُگلتے ہوئے جواب دیا۔

سمیرا اور زیادہ بھڑک اٹھیں اور پاس پڑی ہوئی بید کی چھڑی اُٹھا کر کرن پر تانتے ہوئے بولیں۔

"مجھے مراد نہ سمجھنا۔ اس نے تو تجھے چھوڑ دیا میں

تیری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گی۔"

کرن نے غصے سے تلملا کر ان کے ہاتھ سے چھڑی چھین کر اسے دو ٹکڑے کر کے ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"سمیرا بیگم میں آج تک تمہاری طنزیہ باتیں اور کڑوے کسیلے جملے صرف اس لیے برداشت کر رہی تھی کہ میں تمہیں اپنے شوہر کی ماں سمجھ کر تمہاری عزت کرتی تھی اور اُس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر تمام تلخیوں کو حلق سے اتارتی رہی لیکن تم لوگوں نے میری جو دُرگت بنائی ہے۔ وہ شاید کوئی نیچ سے نیچ آدمی بھی نہیں کرے گا۔ تم لوگوں کو عزت راس نہیں آتی یہ اس بات کا مجھے اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہے اس لیے مجھ پر سوچ سمجھ کر ہاتھ اٹھانا ورنہ میں ساری حدیں پار کر جاؤں گی۔ بڑے چھوٹے کا کوئی لحاظ نہیں کروں گی۔" اس کے لہجے میں عجیب سی گھن گرج تھی اور آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ سمیرا خوف زدہ ہو کر خاموشی کے ساتھ وہاں سے پلٹ گئیں۔

کرن دیوار کا سہارا لیتی ہوئی آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگی سارے نوکر چاکر دم بخود کھڑے سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ شرف الدین حیدر علی کا پرانا وفادار اور با اعتماد ملازم تھا۔ اس نے کرن کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھہر جائیں چھوٹی مالکن آپ اس اندھیرے میں اکیلی کہاں جائیں گی۔ میں آپ کو چھوڑنے کے لیے چلتا ہوں۔ لیکن کرن نے کوئی جواب نہ دیا وہ خواب کی سی حالت میں چلتی رہی۔ اسے یہ بھی ہوش نہ تھا کہ اس کا دوپٹہ گلے سے اُتر کر پیروں میں لٹک رہا ہے۔ اپنے پھوڑے کی طرح دکھتے ہوئے سر کو ہاتھوں سے دباتی وہ آہستہ سے گیٹ کے باہر نکل گئی۔

شرف الدین بھی اس کے پیچھا لپکا۔ سمیرا نے ڈپٹ کر زور سے کہا۔

"تو کہاں چلا، بڑا آیا اس کا ہمدرد بن کر خبردار جو تو نے گھر سے قدم نکالا۔ اگر تو گیا تو پھر تجھے اس گھر میں نہیں گھسنے دوں گی۔" شرف الدین نے ان کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"کوئی بات نہیں بڑی بیگم زندہ رہا تو محنت کر کے کہیں سے بھی کما لوں گا۔ روزی دینے والا تو اُوپر بیٹھا ہے مگر میں اپنے مالک کی عزت کو اس طرح اکیلے سڑکوں پر رُلتے نہیں دیکھ سکتا۔" اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ سمیرا دانت پیس کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

آفاق احمد اذان کی آواز سنتے ہی اُٹھ گئے تھے اور وضو کر کے نماز کے لیے مسجد جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ گیٹ پر زور زور سے بجتی ہوئی بیل سن کر وہ ذرا دیر کے لیے ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور قدم جیسے اس جگہ جم کر رہ گئے۔ اللہ خیر کرنا اس وقت کون آ گیا۔ وہ تیز قدموں سے گیٹ کے قریب جا کر بولے۔

"کون ہے بھئی......" اور پھر شرف الدین کی آواز پہچان کر آفاق احمد نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔

"خیریت تو ہے شرف الدین تم اس وقت یہاں کیسے آئے ہو۔" ان کی آواز میں گھبراہٹ پوشیدہ تھی۔ مگر شرف الدین کے جواب دینے سے قبل کرن اس کے پیچھے سے نکل کر ابو کہتی ہوئی دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اور پھر ان کے بازوؤں میں جھول کر بے ہوش ہو گئی۔

آفاق احمد کا دل کانپ اٹھا۔ کلثوم بھی پریشان چہرہ لیے وہاں آ گئی تھیں۔ دونوں میاں بیوی نے مل کر کرن کو اٹھایا اور اندر لے جا کر بیڈ پر لٹا دیا۔

کلثوم لائٹ جلا کر کرن کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ گال پر جگہ انگلیوں کے واضح نشانات کسی کے ظلم اور بے رحمی کی داستان سنا رہے تھے۔ کرن کی شرٹ شانے کے پاس سے پھٹی ہوئی تھی اور شانے پر نیل صاف نظر آ رہا تھا۔

ماتھے کے بیچوں بیچ گومڑا پڑا تھا اور ہونٹ کے ایک کنارے سے خون رس رہا تھا۔ آفاق احمد نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے بھرائی آواز میں شرف الدین سے کہا۔

"آخر میری بیٹی سے ایسا کون سا قصور سرزد ہوا تھا جس کی اسے ایسی بھیانک سزا دی گئی۔" کلثوم اپنا کلیجہ پکڑے زار و قطار کرن کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھیں۔ شرفت الدین کہنا مناسب تو نہ سمجھتا تھا لیکن بتانا بھی ضروری تھا اس نے بھی ہچکچاہٹ ہوئے سب کچھ ڈالا۔

"اُف میرے خدا میری پھول سی بچی نہ جانے کب سے ان وحشی لوگوں کا ظلم و ستم برداشت کر رہی تھی اور مجھے کبھی اس نے خبر تک نہ ہونے دی۔" آفاق احمد کے منہ

سے نکلا اور پھر اچانک ان کے دل میں اتنا شدید درد اٹھا کہ انہیں ایسا لگا جیسے کوئی ان کا کلیجہ کاٹ رہا ہو۔ وہ دل کو بڑی زور سے دبا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ لیکن ان کا چہرہ خوفناک حد تک زرد ہونے لگا اور ماتھے پر پسینے کی بے شمار بوندیں چمکنے لگیں۔ کلثوم گھبرا گھبرا کر انہیں آوازیں دے رہی تھیں۔ شرف الدین ان کی حالت دیکھ کر پڑوس سے ڈاکٹر کو لینے کے لیے دوڑا مگر ڈاکٹر کے آنے سے پہلے آفاق احمد نے دنیا سے ناطہ توڑ لیا۔

کلثوم اپنا سر پیٹنے لگیں۔ شرف الدین نے آفاق احمد کو سیدھا لٹا کر ان کی آنکھیں بند کیں اور چادر اوڑھا کر اپنی نم آنکھیں لیے وہاں سے ہٹ گیا۔ ذرا سی دیر میں سارا محلہ امنڈ پڑا ان کے رشتہ داروں کو بھی اطلاع کر دی گئی۔ محلے کی عورتیں بے ہوش کرن کو ہوش میں لانے کے لیے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھیں۔ ہوش میں آ کر جب کرن باپ کی کفن میں لپٹی لاش دیکھ کر چیخیں مارنے لگی۔

''میں نے ابو کو مار ڈالا۔ اپنے ابو کو مار ڈالا۔'' کلثوم بیٹی کی حالت دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ دو دو عورتیں کبھی ان کو اور کبھی کرن کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر غموں کے ان طوفانوں کے آگے بند باندھنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ ظہر کے بعد آفاق احمد کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

سوئم ختم ہوتے ہی شرف الدین نے بس پکڑی اور حیدر کے پاس روانہ ہو گیا۔ اسے اطلاع مل گئی تھی کہ دو روز پہلے ہی حیدر علی لندن سے واپس آ چکے ہیں۔

شرف الدین کی صورت دیکھتے ہی حیدر علی کو اندازہ ہو گیا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں سے عجیب سی وحشت برس رہی تھی آتے ہی وہ حیدر کے پاس پکڑ کر بیٹھ گیا۔

حیدر علی نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں بری طرح کانپ رہے ہیں۔ نوری بھاگ کر اس کے لیے پانی لے آئی اور جب اس کے حواس کچھ درست ہوئے تو اس نے رقت آمیز لہجے میں حیدر علی کو سب کچھ بتا دیا۔ حیدر علی کا چہرہ بار بار رنگ بدل رہا تھا۔ آفاق احمد کی موت کی خبر سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تو آخر اس ناہنجار نے اپنی اوقات دکھا دی۔'' وہ اضطرابی کیفیت میں مٹھیاں بھینچ کر کہنے لگے۔

''لیکن میری عقل پر کیوں پردہ پڑ گیا تھا۔ جو میں نے اس کی باتوں میں ایک معصوم بچی کی تقدیر پھوڑ دی اور ان کے سروں سے سائبان کھینچ لیا۔'' ضمیر ان کے وجود پر کوڑے برسا رہا تھا۔ چہرے سے کسی نے جیسے لہو کھینچ لیا تھا۔

''افسوس ایک عورت اپنے سہاگ سے محروم ہو گئی۔'' وہ زیر لب مستقل بڑبڑا رہے تھے۔

''آفاق صاحب آپ اطمینان رکھیے آپ کی بیٹی کو اگر میرے گھر میں کسی نے کوئی دکھ دیا تو اس پیدا کرنے والے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اور اسے ایسی سزا دوں گا کہ وہ قیامت تک یاد رکھے گا۔''

رخصتی کے وقت آفاق احمد کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر اپنے کہے ہوئے الفاظ ان کے ذہن میں بازگشت بن کر گونج رہے تھے۔

''ایسا ہی ہو گا۔ رب ذوالجلال کی قسم میں ان دونوں کو ایسی عبرت ناک سزائیں دوں گا کہ وہ مرتے دم تک نہیں بھولیں گے۔'' ان کا وجود جیسے زلزلوں کی زد میں تھا آنکھیں جل رہی تھیں اور حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ ساری رات وہ بے چین ہو کر ٹہلتے رہے۔ صبح ہوتے ہی وہ شرف الدین کو ساتھ لے کر نکل پڑے۔

سمیرا ہاتھ میں ٹی وی کا ریموٹ لیے کوئی میوزیکل پروگرام دیکھ رہی تھیں۔ حیدر علی آندھی طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئے تو وہ بری طرح چونک پڑیں اور جلدی سے ٹی وی کا سوئچ آف کر کے کھڑی ہو گئیں۔

ان کو دیکھتے ہی سمیرا کو اندازہ ہو گیا کہ ان کی گہرے سمندروں جیسی شخصیت میں ضرور کوئی طوفان مچل رہا ہے۔

''کرن کہاں ہے؟'' انہوں نے بیٹھتے ہی پہلا سوال کیا۔ سمیرا کی سانس رکنے لگیں تھوک نگلتے ہوئے آہستہ سے بولیں۔

''وہ میکے گئی ہے۔''

''کب......'' انہوں نے سمیرا کے چہرے پر نگاہیں گاڑھتے ہوئے پوچھا۔

''تین چار دن ہوئے۔'' سمیرا نے دھیمی آواز سے کہا۔
''لیکن پہلے تو وہ ایک دن سے زیادہ کبھی میکے میں نہیں رہی کیا تمہارے صاحبزادے اس کی موجودگی سے اُکتا چکے تھے وہ اسے لینے کیوں نہیں گئے۔'' حیدر علی نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔ سمیرا سٹپٹا گئیں ان کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگے۔ حیدر علی کے انداز کسی آنیوالے طوفان کا پیش خیمہ تھے۔ ان کا دل اندر سے گھبرا رہا تھا۔
''اگر کوئی بہانہ کرتی ہوں اور حیدر کو کوئی سن گن مل گئی ہے تو میں پکڑی جاؤں گی۔ خیریت اسی میں ہے کہ ان کو اصل بات بتا دی جائے۔''
''میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں سمیرا بیگم...... آخر تمہارے بیٹے نے اب تک کرن کو گھر لانے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی۔'' حیدر علی نے سوال دہرایا تو وہ ہلکے سے کھنکھار کر بولیں۔
''دراصل میاں بیوی کی آپس میں کوئی نوک جھونک ہوگئی تھی اور کرن کو مراد کی طرف سے کوئی غلط فہمی ہوگئی تھی۔ اسی لیے وہ ناراض ہو کر میکے چلی گئی، آجائے گی۔'' وہ بناوٹی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولی۔
''اچھا یا حقیقت کچھ اور ہے کہیں تم ماں بیٹے نے اس بیچاری کو مار پیٹ کے گھر سے تو نہیں نکال دیا۔'' حیدر علی نے ان کی بات کاٹ کر طنزیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔
سمیرا حیرانگی سے اُن کا منہ تکنے لگیں جو بات وہ ان سے چھپانا چاہتی تھیں وہ کھل کر سامنے آچکی تھی۔ حیدر علی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔
''سمیرا بیگم میں نے تمام عمر تم سے کسی اچھائی کی توقع نہیں کی اس کے باوجود میں تمہیں ہمیشہ سدھرنے کا موقع بھی دیتا رہا مگر تم پر اُس کا اُلٹا اثر ہوا سدھرنے کے بجائے تم پستیوں میں گرتی چلی گئیں اور اب تم نے اپنی اکڑ طنطنے اور غرور کی وجہ سے ایک بے قصور اور مظلوم لڑکی کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ گناہ کے زمرے میں اور میں ایک گناہ گار عورت کے ساتھ میں نام جڑا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا۔ لہٰذا میں تم کو اپنے پورے ہوش کے ساتھ آزاد کرتا ہوں میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔''
''خدا کے لیے حیدر مجھے اتنی بڑی سزا نہ دیجیے۔ میں آپ سے اپنے سارے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے معافی چاہتی ہوں مجھے معاف کردیں۔'' وہ بے حد ملتجی انداز سے بھرائی آواز میں کہنے لگیں۔
''مجھے تمہارے منہ سے اس وقت خدا کا نام سُن کر خوشی ہوئی مگر کیا تمہاری یہ معافی تلافی کرن کی روح پر لگے ہوئے زخموں کا مداوا کرسکتی ہے۔ کیا۔ کلثوم کا تڑپتا ہوا دل سکون پاسکتا ہے اور کیا آفاق احمد جو بیٹی کا دکھ دل میں لئے زیر قبر کے اندھیروں میں اُتر گئے۔ دوبارہ دنیا میں واپس آسکتے ہیں اگر یہ سب ممکن نہیں ہے تو پھر معذرت کے ان بہلاوؤں سے مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کیوں کررہی ہو۔ حیدر علی نے سمیرا کی التجا کو رد کرتے ہوئے ایک بار پھر طلاق کے الفاظ دہرائے۔ سمیرا ان کے پیروں میں جھک کر زاروقطار روتے ہوئے بولیں۔
''حیدر اپنے الفاظ واپس لے لیں۔ میں اس عمر میں رسوائیوں کا بوجھ اُٹھا کر کیسے چل سکتی ہوں۔''
''شرعی احکام بچوں کا کھیل نہیں ہوا کرتے سمیرا۔ ہم دونوں کے درمیان طلاق واقع ہوچکی ہے اور میں اب تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے تمہیں طلاق دیتا ہوں۔''
سمیرا نڈھال سی زمین پر ڈھے ہوگئیں۔ وہ ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
''میں اسے نہیں مانتی حیدر یہ سب جھوٹ ہے کہہ دیجیے یہ سب غلط ہے۔'' وہ ان کے قریب آکر ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگیں۔ حیدر علی نے غصے سے اپنا ہاتھ جھٹک کر کہا۔
''یہ کیا کررہی ہو اب میں تمہارے لیے نامحرم ہوچکا ہوں اب ان باتوں کا وقت گزر چکا ہے اور گزرا ہوا وقت دوبارہ کبھی واپس نہیں آتا۔'' اور پھر وہ دھپ دھپ کرتے ہوئے کمرے سے باہر جانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ چند قدم چل کر رُکے اور پلٹ کر بولے۔
''تم چاہو تو عدت اسی مکان میں گزار سکتی ہو عرصے میں تمہارے اخراجات کا بار میرے ذمے ہوگا۔ اور ہاں اگر اپنا سامان لے جانا چاہو تو وہ بھی لے جاسکتی ہو مگر کرن کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا ورنہ اس کا جواب تم سے پولیس آکر طلب کرے گی۔'' انہوں نے بڑی سفاکی سے کہا اور چلے گئے۔
سمیرا کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ سارے

وجود پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ دو تین روز بعد ہی انہیں احساس ہو گیا۔

حیدر علی کا گھر اس میں رہنے والے ملازم پاس پڑوس کے لوگ اور اونچی دیواروں والی مضبوط چھت سب ہی ان کے لیے اجنبی بن چکے ہیں۔

اور تب ایک شام وہ اپنا سامان لے کر زونیرا کے گھر آ گئیں۔ حالانکہ ان کی خواہش تو یہی تھی کہ وہ اپنی زندگی کے دن بھائی کے گھر رہ کر گزاریں لیکن وہ بھی ان کو اپنی زندگی سے دودھ میں پڑی ہوئی مکھی کی طرح نکال چکے تھے۔

مگر زونیرا ایک کائیاں تھی اس کی نظر سمیرا کے بینک بیلنس اور زیورات پر تھی۔ اس نے سمیرا کے آتے ہی ان کے زیورات یہ کہہ کر اپنے قبضے میں لے لیے کہ آج کل گھر میں زیور رکھنے سے چوری چکاری کا ڈر رہتا ہے اس لیے میں ان کو بینک کے لاکر میں رکھوا دوں گی۔''

سمیرا کو بہن کے گھر آئے ہوئے صرف تین روز ہوئے تھے وہ اخبار سامنے رکھے سرخیاں دیکھ رہی تھیں۔ اچانک ان کی نظر عاق نامے پر پڑی جو حیدر علی کی طرف سے تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے مراد کو اپنی ساری جائیداد سے عاق کر کے اپنی ولدیت سے بھی خارج کر دیا تھا۔ بینکوں کو بھی فوری طور پر ہدایات دے دی گئی تھیں کہ وہ مراد سے ہر قسم کا لین دین بند کر دیں ورنہ ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

اخبار میں چھپے الفاظ سمیرا کی آنکھوں کے سامنے دھندلے پڑنے لگے وہ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے دوبارہ اس تحریر کو پڑھنے لگیں یہ خبر ان کے ہوش و حواس پر بجلی بن کر گری تھی اور سب کچھ جلا کر راکھ کر گئی ان کے منہ سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی اور جسم کا آدھا حصہ صوفے کے نیچے لٹک گیا بے ہوشی کی حالت میں انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کرا دیا گیا۔

حیدر علی کے ذمے ابھی ایک اور کام باقی تھا اور وہ تھا جائیداد کا بٹوارہ جائیداد وغیرہ کی منصفانہ تقسیم کرنے کے بعد کچھ زمین انہوں نے چیریٹی فنڈز کو دے دیں۔ سکندر ہاؤس دونوں بہنوں کے نام کر دیا اور اپنا سارا بینک بیلنس کرن کے نام ٹرانسفر کرنے کے بعد ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اُن کے اخراجات کے لیے باغوں اور کھیتوں سے آنیوالی آمدنی کافی تھی وہ زندگی بھر گھر میں بیٹھ کر کھاتے تب بھی کوئی کمی نہ ہوتی۔ تمام صورت حال سے نمٹنے کے بعد ان کے اعصاب کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ رشتوں کو راکھ کا ڈھیر بنتے ہوئے دیکھنا معمولی بات نہ تھی۔ مگر حیدر علی کو اپنے فیصلوں پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

جس رات مراد کرن کے دل کو پیروں تلے چل کر جینی کے فلیٹ پر پہنچا تو وہ خوش ہو کر مراد کے بازوؤں میں جھول گئی اور اپنے گولڈن بالوں کو جھٹکا دے کر بولی۔

''یہ تم نے بہت اچھا کیا مراد جو گھر چھوڑ کر یہاں آ گئے اب ہم خوب عیش کریں گے۔ اور پھر شادی کے بعد ملکوں ملکوں کی سیر کرتے پھریں گے۔'' فیوچر کا پلان بناتے ہوئے اُس کی بھوری آنکھوں میں بڑی تیز سی چمک ابھر آئی تھی۔

''کیسے نہ تا تم تو میری زندگی سے بڑی خوش ہو سوئٹ ہارٹ تم دیکھنا میں شادی کے بعد تم کو پلکوں پر بٹھا کر رکھوں گا۔ اور ایک منٹ کے لیے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ مراد نے جینی کو اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ تین چار دن تک دونوں خوب موج مستیاں کرتے رہے۔ مگر ایک دن جب مراد بے خبر سو رہا تھا کہ جینی نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

''کیا بات ہے ڈیئر مجھے سوتے میں کیوں اٹھا دیا۔'' مراد نے خمار آلود آواز سے جینی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسے پڑھ لو پھر کوئی بات کرنا' وہ اخبار اُس کی طرف پھینکتے ہوئے بولی۔ حیدر علی کا عاق نامہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوا تھا۔ مراد نے جینی کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ وہ بے حد بدلی بدلی سی لگ رہی تھی اور اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے خالی تھا۔ مراد جلدی سے اُٹھ کر اخبار کو غور سے دیکھنے لگا۔

عاق نامے کا اشتہار پڑھتے ہی اس کا دماغ چکرانے لگا۔ جیسے کسی نے اسے گول چکر دے کر ہوا میں اُچھال دیا ہو اور وہ جا کر کسی گہری کھائی میں گر گیا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ زبان خشک ہو کر تالو سے چمٹ گئی تھی۔ جینی بڑے غور سے کھڑی مراد کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جس پر زلزلے کے آثار شدید طور پر واضح تھے۔ بڑی دیر کے بعد مراد کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

لب ہلے اور وہ صرف اتنا کہہ سکا۔
"تم پریشان نہ ہو جینی محبت کی منزل کو پانے کے لیے دولت کی اتنی اہمیت نہیں ہے اگر ہم دونوں کو ایک دوسرے سے سچی محبت ہے تو ہم اس سفر کا آغاز بھی ہنستے مسکراتے ہوئے کریں گے۔ اس کی آواز سے نقاہت ٹپک رہی تھی۔ جیسے وہ اندھے کنوئیں سے بول رہا ہو۔
جینی کے چہرے سے بھی مایوسی اور پریشانی نمایاں تھی۔ گہری سانس لے کر بولی۔
"لیکن مراد جذباتیت سے ہٹ کر سوچو تو اس حقیقت سے آنکھیں چرانا اب ممکن نہیں رہا۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا......" مراد نے تڑپ کر کہا۔
"دنیا میں سب کچھ دولت ہی تو نہیں ہے ہم دونوں مل کر حالات کا مقابلہ کرینگے۔ مجھے بھی کوئی چھوٹی موٹی نوکری تو مل ہی جائے گی۔"
"ہاں لیکن اس سے کیا بنے گا۔ زندگی محض اس دو کمروں کے فلیٹ اور سیکنڈ ہینڈ گاڑی تک ہی آکر نہیں رکتی ہے۔" وہ منہ پھیر کر بددلی سے کہنے لگی۔
"تو کیا اب تمہاری نظروں میں میری کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ تم نے مجھ سے نہیں میری دولت کی وجہ سے مجھ سے پیار کیا تھا۔ نہیں جینی خدا کے واسطے تم تو میرا ساتھ نہ چھوڑنا۔" وہ بڑی لجاجت سے بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔
"مراد تم خود سمجھ سکتے ہو کہ ایک بے سہارا جوان لڑکی کو محض محبت کے سہارے نہیں جیتا جا سکتا اس کے لیے دولت کا ہونا لازمی ہوتا ہے کھوکھلے رشتے تو ویسے بھی بوجھ بن جاتے ہیں۔ اس نے مراد کی آنکھوں میں ڈال کر کہا۔ مراد کے دل پر تیر سا لگا اس نے کمزور آواز میں کہا۔
"جینی تمہارا یہ روپ میرے لیے ناقابل برداشت بن رہا ہے۔ میں تو ساری کشتیاں جلا کر تمہارے پاس آیا تھا۔ ساری عمر تمہارے پیار کی چھاؤں میں بتانے کی تمنا لے کر اب میں کہاں جاؤں میرے لیے تو ہر دروازہ بند ہو چکا ہے۔" وہ رو دینے کے قریب تھا۔
"تو پھر ایک ہی صورت ہے۔ تم میرے پاس پے اِنگ گیسٹ کی حیثیت سے رہ سکتے ہو۔" جینی کا سرد لہجہ اور خشک رویہ مراد کا دل چیرے دے رہا تھا مگر اس کے پاس سر چھپانے کے لیے کوئی آسرا بھی تو نہ تھا۔ اس کے رحم و کرم پر زندہ رہنا تھا۔
"تھینک یو جینی...... تم نے میرے لیے اتنی رعایت کر کے میرے اوپر بہت بڑا احسان کیا ہے۔" مراد کے لہجے میں تلخی سمائی ہوئی تھی۔
دوسرے دن سے وہ جاب کے لیے کراچی کی سڑکوں پر مارا مارا پھرنے لگا۔ اس کے پاس نہ تو کوئی ہائی کوالیفیکیشن تھی اور نہ ہی کوئی تگڑی سفارش بھلا آسانی سے نوکری کیسے ملتی۔ آٹھ دن اسی طرح بھٹکنے کے بعد اسے کسی شاپ پر سیلز مین کی جاب ملی تو اس نے اسی کو غنیمت سمجھا۔ مہینہ ختم ہونے کے بعد اسے جو تنخواہ ملی وہ اس نے بڑی ایمانداری کے ساتھ جینی کے ہاتھ پر لا کر رکھ دی۔ اس نے ساری تنخواہ ہتھیالی اور روزانہ بس کے لیے تھوڑے بہت پیسے دے دیتی۔
جینی کا سلوک مراد سے دن بدن بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بڑا حقارت آمیز رویہ اپنائے ہوئے تھی۔
مراد کا دل جینی کے اس کٹھورپن پر آٹھ آٹھ آنسو روتا رہتا لیکن مجبوری نے اس کے پیروں میں ایسی زنجیر ڈال دی تھی کہ وہ گھٹ گھٹ کر ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ رات کو جب اپنا تھکن سے چور بدن لے کر سونے کے لیے لیٹتا تو اپنی بدنصیبی کے علاوہ اس کو اور نہ جانے کون سے دکھ تڑپانے لگتے۔ محبت کے اصلی رنگوں سے محروم ہو کر اسے کیسے کیسے درد تڑپا رہے تھے یہ تو اُس کا دل ہی جانتا تھا۔
ایک دن جینی کسی اجنبی نوجوان کو گھر میں لے کر آ گئی۔ جو اس کا ہم مذہب تھا۔ ڈیوڈ کو اس نے اپنا کزن کہہ کر مراد سے متعارف کرایا تھا۔ نہ جانے کیوں مراد کو ڈیوڈ اچھا نہیں لگا وہ جن نگاہوں سے جینی کو دیکھتا اس پر مراد کا خون کھول کر رہ جاتا۔ مگر وہ اپنے ہونٹ سینے پر مجبور تھا۔
کس منہ سے اپنا حق جتاتا۔ جینی تو اس کے ساتھ محبت کے سارے رشتے پہلے ہی توڑ چکی تھی۔ لیکن مراد کوشش کے باوجود جینی سے نفرت نہیں کر سکا وہ اسے آج بھی اپنے دل کے قریب محسوس ہوتی تھی۔ اسی لیے اُس کی ڈیوڈ سے بڑھتی ہوئی بے تکلفی مراد کی آنکھوں میں بری طرح کھٹکتی تھی۔ اور ایک دن اس کے صبر و برداشت کی حد ختم ہوگئی اور وہ جینی

سے ڈیوڈ کے ساتھ حد سے بڑھتی ہوئی بے تکلفی پر اعتراض کر بیٹھا۔ مگر جینی نے بڑی سرد مہری سے تیوریاں چڑھا کر جواب دیا۔

''میں تمہاری بیوی نہیں ہوں جو تم کو اس قدر برا لگ رہا ہے اگر تم سے نہیں دیکھا جاتا تو تم کہیں اور جاسکتے ہو۔ میں نے تمہیں روکا تو نہیں ہے۔'' مراد جینی کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

اس کی سرد مہری بے رحم آواز اور تلخ لہجہ مراد کو بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔ اس دن کے بعد سے مراد نے اپنی لٹی پٹی آرزوؤں کو تھپک تھپک کر سلانا شروع کر دیا تھا۔ جینی کی طرف سے اب وہ مایوس ہو چکا تھا۔ یہ بھی اس کی مہربانی تھی کہ وہ اسے برداشت کر رہی تھی ورنہ اس سے تو یہ بھی بعید نہ تھا کہ وہ اسے دھکے مار کر گھر سے نکال باہر کر دیتی۔

زندگی کا سفر اب اس کے لیے بے حد اذیت ناک تھا۔ پچھتاوے اس کا مقدر بن چکے تھے۔ اس بھری دنیا میں کوئی بھی نہ تھا جس کے پاس بیٹھ کر وہ دو گھڑی کے لیے اپنا غم غلط کر لیتا۔ وہ سارے دوست احباب جو بھی اس کے گرد منڈلایا کرتے تھے۔ وقت بدلتے ہی اس سے نظریں چرانے لگے تھے اگر کبھی راستے گلی میں کوئی مل بھی جاتا تو اس طرح کترا کر نکل جاتے جیسے اس کو پہچانتے تک نہ ہوں۔

اس دن سنڈے تھا۔ بارش ہو کر تھمی تو جینی گھر کا سودا سلف لینے کے لیے چلی گئی۔ ڈیوڈ بھیگے کپڑوں میں کھڑا بجلی کا مین سوئچ ٹھیک کر رہا تھا اچانک نہ جانے کیسے اس کو کرنٹ لگ گیا اور وہ کھڑے قد سے زمین پر گر گیا۔ آناً فاناً اُس کا جسم نیلا ہو گیا اور اسی جگہ ٹھنڈا ہو گیا۔ جینی گھر لوٹی تو ڈیوڈ کو مردہ دیکھ کر اس نے مراد کو ڈیوڈ کی موت کا ذمے دار ٹھہراتے ہوئے چیخ چیخ کر سارے محلے کو اکٹھا کر لیا۔ وہ پریشان ہو کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے لگا۔ لیکن کسی نے بھی اس کی باتوں کا یقین نہ کیا اسی وقت پولیس آئی اور ہتھکڑیاں پہنا کر اُس کو ساتھ لے گئی۔ وہ روتا چیختا رہا قسمیں کھاتا رہا۔

مگر کسی نے بھی کان نہ دھرے اس پر مقدمہ چلایا اور اسے سات سال قید کی سزا سنا دی گئی۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اس کی پہلی رات روتے روتے گزر گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔

جینی نے اسے ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل کر اس کے وجود کے پرخچے اڑا دیے تھے۔

حیدر علی نے ضمیر کے تقاضے پورے کرنے کے بعد اپنے ذہن پر پڑا ہوا بوجھ تو اتار کر پھینک دیا تھا۔ مگر ان کی ساری زندہ دلی نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ چہرے پر شگفتگی کے بجائے اضمحلال سا برستا ہوا دکھائی دیتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ دن سے ان کی بھوک بھی بالکل غائب ہو چکی تھی۔ اور رنگت میں زردیاں گھل چکی تھیں۔ مہربانو پریشان ہو کر ان کو بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھا چکی تھیں مگر ان کی پُراسرار بیماری کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اور جب ڈاکٹر اُس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوئے تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ کینسر ان کے جسم میں پنجے گاڑ چکا تھا۔ بوکھلا کر وہ ان کو لندن لے گئی لیکن وہاں جانے کے بعد بھی مایوسی کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

حیدر علی کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ مہربانو کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی مگر راضی برضا رہنے کے علاوہ کسی کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ ایک ڈاکٹر اور نرس چوبیس گھنٹے حیدر علی کے سرہانے موجود رہتے اور پھر ایک روز ڈاکٹر نے بھی سر ہلا کر مایوسی کا اظہار کر دیا اس کے خیال میں حیدر علی کی زندگی بس دو ایک ہفتے اور باقی رہ گئے تھے۔

اس روح فرسا انکشاف نے مہربانو کو اندر تک دہلا کر رکھ دیا وہ رو رو کر خدائے بزرگ و برتر سے ان کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ لیکن تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے ایک سرد و تاریک رات میں جب ہوائیں درختوں میں بین کرتی پھر رہی تھیں۔ حیدر علی بڑی خاموشی سے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ چاروں بیٹیاں جو باپ کی بیماری کی اطلاع ملتے ہی آ گئی تھیں اپنا دل پکڑے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ مہربانو صدمے سے بیہوش ہو چکی تھیں۔ حویلی کے کونے کونے آہوں کراہوں اور سسکیوں کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ کرن بھی آنکھوں میں آنسو لیے عظمت کے اس مینار کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے اس کے دل سے باپ کی شفقت کے نقوش دھندلا دیے تھے وہ ایک بار پھر یتیمی کے جھلستے صحرا

میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔
حیدر علی کی موت کسی عام آدمی کی موت نہ تھی کہ گمنامی کی نذر ہو جاتی۔ شہر سے نکلنے والے ہر چھوٹے بڑے اخبار نے اس خبر کو شائع کیا تھا۔
چالیسویں تک دوست احباب اور عزیز و اقارب کا آنا جانا لگا رہا اور پھر یہ لق ودق عمارت بھی اداسیوں کا لبادہ اوڑھ کر اپنے مکینوں کے غم میں شریک ہو گئی۔
وقت سرد و گرم سے بے نیاز ہو کر گزرتا رہا۔ سات برس گزر چکے تھے۔ کلثوم بھی مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر بستر پر لیٹ گئی تھیں۔ انہیں ہر وقت یہی فکر کھائے جاتی تھی کہ ان کے بعد کرن کا کیا بنے گا۔ وہ کرن پر زور ڈال رہی تھیں کہ اسے ان حالات میں زندگی گزارنے کے لیے کوئی ہم سفر تلاش کر لینا چاہیے۔ علماء کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اگر سات برس بعد شوہر کی خیر خبر نہ ملے تو عورت عدالت سے خلع حاصل کر کے دوسری شادی کر سکتی ہے۔ لیکن کرن یہ ذکر سنتے ہی بھڑک اٹھتی تھی۔ ایک بار وہ ماں کی خوشی کے لیے زندگی داؤ پر لگا چکی تھی۔ اور اب اس کے اندر قربانی دینے کا قطعی حوصلہ نہ تھا۔ کلثوم کرن کی باتیں سن کر ٹھنڈی سانس بھر کے خاموش ہو جاتیں اور ایک دن تنگ آ کر انہوں نے بھی اس کے سر سے اپنی مامتا کا آنچل ہمیشہ کے لیے ہٹا لیا۔
وہ تقدیر کا یہ بھرپور وار بھی بڑی بہادری سے سہہ گئی زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ حیدر علی کی کرم نوازیوں کی بدولت وہ ایک غریب اور مفلوک الحال لڑکی نہیں تھی بلکہ ایک امیر اور باشعور عورت بن چکی تھی۔ جسے دلی سکون کے علاوہ ہر چیز میسر تھی۔ اس نے اپنی زندگی کو بھلائی کے کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ فارغ وقت میں وہ نادار بچیوں کو پڑھاتی تھی یہ اس کا پرانا محلہ تھا جہاں اسے کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ہر شخص اسے عزت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ مرد و عورت سب ہی اس کے کردار کی پاکیزگی کے معترف تھے۔
کرن نے کلثوم کی زندگی ہی میں اس پرانے طرز کے مکان کو تڑوا کر اس کو خوبصورت بنگلے کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور اس کے لان کو بوڑھے مالی خدا بخش نے حسین اور دل فریب بنانے میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ وہ روزانہ شام کو آ کر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتی اور بڑی دلچسپی سے رنگ برنگے خوبصورت پھولوں کو دیکھا کرتی۔
اس دن بھی وہ ماربل کی سیڑھیوں پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی کہ گیٹ کو دھکا دے کر شرف الدین اندر آ گیا۔ وہ کسی بوڑھے کا ہاتھ پکڑے ہوئے قریب آنے پر کرن نے غور سے دیکھا تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ بوڑھا کوئی اور نہیں بلکہ مراد تھا جسے کرن نے اس کی براؤن آنکھوں کی وجہ سے پہچانا تھا۔ ورنہ اس کے اندر پہچان والی کوئی بات نہ تھی۔ اس کے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ گال پچک کر اندر دھنس گئے تھے۔ بھرا بھرا صحت مند جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے جسم پر معمولی سے کپڑے کی کریم شلوار اور قمیض تھی اور پاؤں میں خستہ سی چپل پہنے ہوئے تھا۔ کرن کے دل کے سارے زخم نئے سرے سے رسنے لگے۔
وہ مراد کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے شرف الدین سے کہنے لگی۔
"آج تم اِدھر کا راستہ کیسے بھول گئے۔" شرف الدین کے جواب دینے سے پہلے وہ بول اٹھا۔
"آج میں اس کو یہاں لے کر آیا ہوں کرن میں تم سے اپنی غلطیوں بلکہ مظالم کی معافی مانگنا چاہتا ہوں جو میں نے تمہارے اوپر ڈھائے تھے۔ معاف کر دو گی تو تمہارا مجھ پر احسان ہو گا۔ مراد کی آواز سے اس کے دل کا درد چھلک رہا تھا۔
"چھوڑیئے مراد صاحب اب ان جذباتی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ویسے بھی اب میں ماضی کی کسی یاد کو دہرانا نہیں چاہتی۔ سات برس میں دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہے اور آپ کو معافی مانگنے کا خیال آ رہا ہے۔" کرن کے لہجے میں طنز امڈ آیا تھا۔
مراد کے دل پر چوٹ سی پڑی اس نے کہا۔
"کرن میں تو بہت پہلے آ جاتا لیکن شاید قسمت کو ہی منظور نہیں تھا۔"
"ظاہر ہے زندگی کی رنگینیوں میں گم ہو کر تو انسان خود کو بھی بھولنے لگتا ہے۔" کرن نے سرد و سپاٹ لہجے میں کہا۔
"آپ کا اندازہ درست نہیں ہے چھوٹی بیگم یہ بے چارے تو جیل میں تھے۔ اس بدبخت عورت کو جیسے ہی پتہ

چلا کہ بڑے مالک نے انہیں جائیداد سے محروم کرکے عاق کردیا ہے اس نے فوراً ان سے نظریں پھیر لیں اور قتل کا جھوٹا الزام لگا کر سات برس کے لیے جیل بھجوا دیا تھا۔
شرف الدین نے مراد کی وکالت کرتے ہوئے کرن کی غلط فہمی کو دور کرنا چاہا۔ شرف الدین دوبارہ کہنے لگا۔
''وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ یہ مجھے اتفاق سے سڑک پر مل گئے اور میں ان کو اپنے گھر لے کر آ گیا۔ تب سے ان کی طبیعت بہت خراب ہے ہر وقت کھانسی اٹھتی ہے اور اب تو بخار بھی رہنے لگا ہے۔''
''تو پھر تمہیں ان کو یہاں لانے کے بجائے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے تھا۔''
مراد کے چہرے پر دکھ کی چھاپ گہری ہوگئی وہ گردن جھکا کر کہنے لگا۔
''کرن تم پریشان نہ ہو میں تم سے کوئی مدد مانگنے یا پریشان کرنے نہیں آیا تھا۔ میں تو اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے ایک بار تم سے معافی مانگ لوں تاکہ آسانی سے مر سکوں تمہیں خدا کا واسطہ کرن ایک بار سچے دل سے مجھے معاف کردو ورنہ میرا دم آسانی سے نہیں نکلے گا۔'' اس نے آگے بڑھ کر کرن کے لٹکتے ہوئے پیروں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔
وہ چونک کر پیچھے ہٹی اس کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے پیروں پر جلتے انگارے رکھ دیے ہوں۔
اس وقت مراد کو زور کی کھانسی اٹھی اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ شرف الدین پانی لینے اندر بھاگا مگر مراد بے ہوش ہو چکا تھا۔ یہ صورت حال کرن کے لیے بھی پریشان کن تھی۔ شرف الدین بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ کرن نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔
''میں ابھی ڈاکٹر رفیق علوی کو فون کرتی ہوں۔ وہ فزیشن ہونے کے علاوہ بہترین چیسٹ اسپیشلسٹ ہیں۔ وہ مراد کو بالکل ٹھیک کردیں گے۔''
ڈاکٹر علوی حیدر علی کے پرانے فیملی ڈاکٹر اور قریبی دوست تھے۔ انہوں نے کافی عرصہ سے باقاعدہ پریکٹس چھوڑ دی تھی۔ کلینک بیٹا چلا رہا تھا لیکن ان کے تجربے کی بنا پر اب بھی ان کے دیرینہ مریض ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ وہ کرن کے فون کرنے پر فوراً آ گئے۔ مراد کو پہچان کر وہ اُداس ہو کر بولے۔
''اِس کو تو حیدر علی نے عاق کردیا تھا یہ تمہارے پاس پہنچ گیا۔'' اور جب کرن نے ان کو صورتِ حال بتائی تو وہ افسردگی سے کہنے لگے۔
''افسوس زمانہ کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے کل تک جو لڑکا شہزادوں جیسی شان سے رہتا تھا آج کن حالوں کو پہنچ گیا ہے۔ وہ مراد کا معائنہ کرتے ہوئے بولے۔
''مجھے مراد کو ٹی بی کا شبہ معلوم ہوتا ہے مگر فی الحال کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اسے کچھ روز کے لیے میرے کلینک میں ایڈمٹ کرانا ہوگا تاکہ ایکسرے وغیرہ کی رپورٹ دیکھ کر صحیح علاج شروع کرایا جائے۔''
شرف الدین نے اُداسی سے کہا۔
''صاحب میں غریب آدمی ہوں ان کا مہنگا علاج نہیں کرا سکتا۔ آپ انہیں کوئی دوا یا انجکشن وغیرہ دے دیجیے۔''
''تم کو اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے جب میں دوسرے غریب لوگوں کا مفت علاج کرسکتا ہوں مراد تو پھر میرے عزیز دوست کا بیٹا ہے۔''
ڈاکٹر علوی نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ مگر کرن کہنے لگی۔
''ڈاکٹر انکل آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں یہ ذمے داری مجھے اٹھانے دیجیے۔''
''ٹھیک ہے تم جیسا مناسب سمجھو لیکن اس کے علاج میں دیر نہیں ہونی چاہیے اور ہاں اس سلسلے میں تم کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔'' ڈاکٹر علوی نے سنجیدگی سے کہا۔
کرن حیرانی سے بولی۔
''کیسا وعدہ ڈاکٹر انکل......''
''دیکھو کرن مراد ایک ٹوٹا پھوٹا اور بکھرا ہوا شخص ہے۔ تقدیر نے اس کے ساتھ جو بھیانک مذاق کیا ہے۔ اس کی وجہ سے مراد کے اعصاب جواب دے چکے ہیں اسے ایک ایسے مسیحا کی ضرورت ہے جو اس کے دل پر خلوص اور اپنائیت کا مرہم رکھ سکے اور یہ کام تمہارے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا تم کو مراد کو یقین دلانا ہوگا کہ تم اس کی تمام زیادتیوں کو فراموش کر چکی ہو اور سچے دل سے اس کو معاف بھی کردیا ہے۔''

"مگر انکل یہ بات درست نہیں ہے۔ میں نہ تو مراد کے دیے ہوئے زخموں کو بھولی ہوں اور نہ میرے اندر اس کو معاف کرنے کا حوصلہ ہے۔ اسی شخص کی وجہ سے میری گود ہمیشہ کے لیے سونی ہوگئی یہی میرے باپ کی موت کا ذمے دار ہے بتائیں انکل میں اس کو کس دل سے معاف کرسکتی ہوں۔" کرن نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"مگر کرن تم اس حقیقت کو کیوں بھول رہی ہو کہ اس کی تمام زیادتیوں کی تو اسے قدرت خود سزا دے چکی ہے۔ باپ نے اس کو اپنی شفقت سے محروم کرکے اپنے گھر کے دروازے اس پر بند کردیے اور اس جس کے لیے جذبات میں آکر یہ کر بیٹھا تھا اسی لڑکی نے اس کو جھوٹے الزام میں جیل بھجوادیا۔ ماں کا آخری دیدار بھی اس کے نصیب میں نہ تھا۔ دوست احباب نے الگ اس سے آنکھیں پھیرلیں۔ مجھے تو حیرت ہے وہ اب تک زندہ کیسے ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا مرچکا ہوگا۔ اب اگر تم نے بھی بے رخی برتی تو وہ جیتے جی مرجائے گا۔"

ڈاکٹر رفیق علوی نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں کرن کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے انکل آپ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے انسانیت اور ہمدردی کے ناطے میں اس کی جان بچانے کے لیے آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔"

"تھینک یو کرن مجھے تم سے یہی امید تھی۔" ڈاکٹر علوی نے خوش ہوکر کہا اور پھر اسی شام شرف الدین نے اسے لے جاکر ایڈمٹ کرادیا اور اس کی دیکھ بھال کے لیے خود بھی وہاں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

ڈاکٹر علوی جیسے انسان دوست اور قابل ڈاکٹر کی بھرپور توجہ بہترین علاج مہنگی دوائیں اور قیمتی انجکشن شرف الدین جیسے مخلص اور وفادار شخص کی بے لوث خدمت اور تیمارداری مراد کو آہستہ آہستہ صحت کی طرف لوٹانے لگی۔ سب سے زیادہ کرن کی موجودگی نے اس کی صحت پر اچھا اثر ڈالا تھا جو ایک فرض شناس نرس کی طرح اس کی دیکھ بھال کررہی تھی۔

مراد کا دل کرن کی عظمت کے سامنے ایک بار پھر جھکنے لگا تھا مگر ایک بات رہ رہ کر اس کے ذہن میں گردش کرتی رہتی تھی کہ سب کچھ کرنے کے باوجود کرن کی آنکھوں میں اس کے لیے وہ تاثرات کیوں نہیں دکھائی دیتے جن کو دیکھنے کا وہ بڑی شدت سے آرزومند تھا۔ وہ جب بھی کبھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر اپنے دلی تاثرات اس تک پہنچانے کی کوشش کرتا تو وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔ چہرے کا رنگ بدل جاتا اور کسی نہ کسی بہانے وہاں سے اُٹھ کر چل دیتی۔

کبھی کبھی جب وہ اس کا ٹمپریچر نوٹ کرنے آتی تو وہ جان بوجھ کر اپنی آنکھیں بند کرلیتا۔ کرن آہستہ سے اس کی پیشانی چھوکر دیکھتی تو اس کے رگ و ریشے میں مسیحائی کی تاثیر اُتر جاتی۔

ایک روز شرف الدین کسی کام سے اپنے گھر جانے لگا تو مراد نے کہا۔

"شرف الدین آتے وقت شلوار قمیض کا دھلا ہوا سوٹ لیتے آنا کھونٹی پر ٹنگا ہوگا۔" کرن وہیں کھڑی تھی۔ اس نے کہا لانے کی کوئی ضرورت نہیں کپڑے موجود ہیں۔ وہ وارڈروب کھول کر کھڑی ہوگئی۔

مراد نے بڑے اشتیاق سے وارڈ روب کا جائزہ لیا۔ شلوار قمیض کے سوٹ ایک خانے میں پریس کیے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔

ہینگروں میں پینٹ شرٹ اور میچنگ ٹائیاں لٹک رہی تھیں۔ دوسرے خانے میں شیونگ کا سامان کولون ہیراسپرے پرفیوم اور گلاسز وغیرہ نظر آرہے تھے۔ نیچے کی طرف جوتے، کھسے اور چپلیں وغیرہ قطار سے رکھی تھیں۔ مراد کی آنکھوں میں چمک لہرانے لگی۔ اس نے تشکر آمیز نظروں سے کرن کو دیکھ کر کہا۔

"تھینک یو کرن تم نے میری چیزوں کو کس قدر سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔"

"دراصل بابا سائیں نے جب میرا سامان گھر بھیجا تھا تو اس کے ساتھ یہ الماری بھی آگئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ جب کبھی آئے تو آپ کی امانت آپ کے حوالے کردوں گی۔" کرن نے مراد کی غلط فہمی دور کرنا چاہی۔

مراد کے چہرے پر تاریک سایہ منڈلانے لگا۔ کرن نے یہ کہہ کر مجھے اس بات کا احساس دلا دیا ہے کہ مجھے اس کا گھر خالی کردینا چاہیے۔" اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔

''مجھے پہلے اس بات کا کیوں نہیں احساس ہوا کہ اب میں کرن کے قابل نہیں ہوں۔''
مگر میں یہاں سے کہاں جاؤں گا۔ کیا میری قسمت میں ہمیشہ ایک نوکری کے ٹکڑوں پر زندگی گزار دینا لکھ دیا گیا ہے۔ اس نے سر جھٹک کر سوچا اور اس کی نگاہوں میں شرف الدین کا دو کمروں کا گھر ابھر آیا۔ جہاں چھت کے سوراخوں سے دھوپ ہر وقت کمرے میں بھری رہتی تھی۔ وہ بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔
اس کی آنکھوں کے آگے تپتا ہوا صحرا تھا۔ جہاں ہر طرف ریت اڑ رہی تھی۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب اس کی دھندلی آنکھیں بھر آئیں اور خود سے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اس رات وہ کھانا کھائے بغیر بستر پر لیٹ گیا۔ خوامخواہ زبردستی کی محبت سے خود کو بہلاتے ہوئے اس نے کچھ سہانے خواب پلکوں پر ڈرتے ڈرتے سجا تو لیے تھے لیکن کرن کے ایک ہی جملے نے ان خوابوں کو کرچیوں کی صورت بدل دیا تھا جو اس کی آنکھوں کو زخمی کر گئے تھے۔
اور اب ایک سوچ بڑی تیزی سے دماغ میں سما رہی تھی۔ مجھے جینے کا کوئی حق نہیں۔ دوسروں کے سر پر بوجھ بن کر مسلط ہونے سے بہتر ہے کہ زندگی سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ اس کے تن من دونوں طوفانوں کی زد پر تھے۔ زندگی کا ہر پڑاؤ انگاروں سے دہکنے لگا تھا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے ٹٹول کر سلیپنگ پلز کی چھوٹی سی شیشی نکالی اور اس میں جتنی ٹیبلیٹ تھیں ان کو پانی سے نگل کر لیٹ گیا۔
صبح ملازم مراد کا ناشتہ لے کر آیا تو وہ سر تک چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ اس نے مراد کو آوازیں دیں آہستہ سے ہلایا بھی لیکن اس نے کوئی جنبش نہ کی۔ اس نے جا کر کرن کو صورت حال بتائی تو اس کا دل کسی ان جانے خوف سے دھڑکنے لگا۔
وہ تیزی سے بھاگ کر کمرے میں آئی اور مراد کے سر سے چادر ہٹا کر دیکھنے لگی۔
مراد کی آنکھیں ادھ کھلی ہوئی تھیں چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور آسمانی نائٹ ڈریس اس کے پسینے سے بھیگے جسم کے ساتھ بھیگا ہوا تھا۔ کرن نے اس کی نبض ٹٹولی تو وہ بہت رُک رُک کر چل رہی تھی۔ اچانک اسے اپنی بے سروپا باتوں کا خیال آ گیا کسی نامعلوم سے خوف کی وجہ سے اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے ڈاکٹر رفیق علوی کو فون کرنے لپکی۔
''لیکن کل دوپہر تو میں اسے اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا پھر اچانک کیا ہو گیا۔'' ڈاکٹر علوی نے تشویش ناک لہجے میں سوال کیا۔
''میں کچھ نہیں جانتی ڈاکٹر انکل مگر آپ جلدی سے آ جائیں۔'' اس کے لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔
''آخر اچانک اسے ہو کیا گیا۔'' ڈاکٹر علوی نے آتے ہی اس کی نبض ٹٹولتے ہوئے مشکوک لہجے میں سوال کیا۔ نہ جانے کیوں ان کا دل بار بار یہ کہہ رہا تھا جیسے مراد کی اس حالت کی ذمہ دار کرن ہے۔ اچانک انہیں یاد آ گیا اور انہوں نے میز پر سے خواب آور گولیوں کی شیشی ہاتھ میں لیتے ہوئے اسے غور سے دیکھا جو بالکل خالی تھی۔
''او مائی گاڈ مراد نے خودکشی کر لی ہے۔'' بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔ اور پھر ایک تنبیہی سی نظر خاموش کھڑی کرن پر ڈال کر کہنے لگے۔
''تمہاری مراد سے آخری کیا بات ہوئی تھی۔''
کرن کا دل غیر معمولی انداز میں دھڑکنا شروع ہو گیا۔ اس نے سر جھکا کر وہ تمام گفتگو جو اس کے اور مراد کے درمیان ہوئی تھی۔ دھیمی آواز میں دہراتے ہوئے کہا۔ بس اس کے علاوہ اور میں نے کچھ نہیں کہا۔
''تم بھی حد کرتی ہو کرن اس بے چارے کے قدموں تلے زمین ہے نہ سر پر آسمان اور تم نے اس کو اتنی بڑی الماری لے کر گھر سے جانے کا حکم دے دیا۔'' وہ کرن کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہنے لگے۔
''سوری انکل میں نے تو بس ایسے ہی سرسری انداز سے یہ بات کہی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مراد کا اس پر اتنا گہرا اثر ہو گا۔'' اس کے لہجے سے ندامت جھلک رہی تھی۔
ڈاکٹر علوی نے مراد کا معدہ واش کرنے کے بعد اس کو انجکشن دیا اور چیک کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد ان کے متفکر چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی۔
''شکر ہے کہ انجکشن نے اپنا کام دکھا دیا۔ اور مراد کی نبض بہتر ہو رہی ہے کچھ دیر بعد اسے ہوش آ جائیگا۔''

اب مراد کو ہوش آنے لگا ہے۔ ڈاکٹر علوی نے کہا۔
مراد نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔
''ڈاکٹر انکل آپ بار بار مجھے کیوں بچا لیتے ہیں۔'' اس نے کمزور آواز میں کہا۔
''اور تم میری ساری محنت پر پانی پھیر دینا چاہتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خودکشی ہمارے مذہب اسلام میں کتنا بڑا گناہ ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ شیشی میں گولیوں کی مقدار بہت کم تھی ورنہ میں قیامت کے دن حیدر علی کے سامنے کیا منہ لے کر جاتا۔'' ڈاکٹر علوی نے پیار بھرے لہجے میں مراد کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ کرن کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اسے جھنجوڑ ڈالا ہو۔ اس کی آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ آہستہ آہستہ ہٹنے لگا۔
''جس عظیم انسان نے مجھ جیسی فضول اور ناکارہ ہستی کے لیے اتنی قربانیاں دیں آج میں اس کے بیٹے کو اپنے گھر سے نکال باہر کرنا چاہتی ہوں مجھ سے زیادہ ناشکرا اور احسان فراموش کون ہوگا۔ یہ سارا عیش و آرام روپیہ پیسہ مراد کے ہی باپ کی تو دین ہے جس پر میں قبضہ جمائے بیٹھی ہوں۔'' اس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہہ رہے تھے۔
''مجھ سے وعدہ کرو مراد کہ تم پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کرو گے۔'' ڈاکٹر علوی نے ہمدردی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔
''مگر میں اور کیا کرتا۔ اگر اتنے سارے دکھ کاٹنے کے بعد بھی عزت نہ ملے تو زندگی کا کیا فائدہ۔ آپ ہی بتائیں میں اس ذلت آمیز زندگی کا بوجھ کب تک اٹھاتا رہوں۔''
مراد کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے کانچ کی سی چبھن تھی۔ اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ ڈاکٹر رفیق علوی دیر تک اسے تسلیاں دیتے رہے۔ اور اس کو اچھی اور باعزت جاب دلانے کا وعدہ بھی کیا۔
فریش جوس پینے کے بعد مراد کافی بہتر لگ رہا تھا۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد وہ مطمئن ہو کر وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ کرن آ کر اس کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔
''معاف کرنا تمہیں میری وجہ سے بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔ مگر اب میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔''
مراد نے ہمت کر کے کرن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔
کرن کے چہرے پر نہ کوئی ناگوار تاثرات ابھرے اور نہ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔
''میں کل یہاں سے جا رہا ہوں کرن مگر تمہاری ہمدردی اور توجہ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا کرن مجھے بہت افسوس ہے کہ میں تمہیں کوئی خوشی نہ دے سکا۔ جب بھی اپنے وحشیانہ سلوک کا خیال آتا ہے تو مجھے خود سے نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور پھر سوچتا ہوں کہ شاید میرا گناہ گار وجود اس قابل ہی نہیں تھا کہ تم جیسی شریف اور پاکباز لڑکی میرے شانہ بشانہ چلتی۔'' مراد بھرائی ہوئی آواز میں اپنی غلطیوں کا اعتراف کر رہا تھا۔ کرن خاموش بیٹھی اپنے تیزی سے امنڈ کر بہنے والے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔
ایک مدت کے بعد اس نے ایک بار پھر مراد کی آنکھوں میں پیار کی چمک دیکھی تھی۔ لیکن اب کی بار ان میں کوئی کھوٹ نہ تھی۔ سچے اور خلوص جذبے جھلک رہے تھے۔ اس نے تڑپ کر آگے بڑھتے ہوئے مراد کے سرد ہاتھوں کو تھام کر کہا۔
''مراد میں تنہا رہتے رہتے تھک چکی ہوں۔ مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ اب میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔''
مراد کی تو جیسے سانسیں تھمنے لگیں اتنی بڑی خوشی اس سے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اپنے رب کی محبت کا قائل ہو گیا جو اپنے بندے کو کبھی بے سہارا نہیں چھوڑتا...... اس کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو رواں تھے۔
''کرن تم نے مجھے معاف کر دیا میں یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا ماضی داغدار ہے تمہیں شاید میرے کسی وعدے پر اعتبار نہ ہو مگر میں تمہیں اپنے رویے سے یقین دلاؤں گا کہ میں ایک سدھرا اور سلجھا ہوا مراد ہوں۔''
کرن نے سر اُٹھا کر مراد کی آنکھوں میں دیکھا۔
''مجھے یقین ہے کہ اب میں اور آپ ایک پُرسکون زندگی گزاریں گے۔'' اور پھر دھیرے سے اس کے سینے پر سر ٹکا دیا۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

اے اللہ

اے بلندیوں کے بادشاہ اے رب کائنات ہمارے دل اور ہمارے قدم اپنی رضا کی طرف پھیر دیجیے، آمین۔

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا

جب شیطان کو جنت سے نکالا جارہا تھا تو اس نے رب سے کہا کہ میں تیرے بندے کو اس وقت تک گمراہ کرتا رہوں گا جب تک ان کے جسم میں روح رہے گی۔

اس پر اللہ نے فرمایا:

''میں اپنے بندوں کو اس وقت تک بخشتا رہوں گا جب تک وہ مجھ سے استغفار کرتے رہیں گے۔''

زندگی

زندگی میں اگر کوئی پوچھے کیا کھویا اور کیا پایا؟

تو بلا جھجک کہہ دینا کہ

جو کھویا وہ میری نادانی اور......

جو پایا وہ میرے رب کی مہربانی......

موت انسان کو ضرور مار سکتی ہے

مگر

اچھے کردار، اچھے اخلاق والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں

دلوں میں

لفظوں میں

اور دعاؤں میں

راسب۔ لاہور

کیسے کیسے لوگ

کچھ لوگ دعاؤں کی طرح ہوتے ہیں

ابھی ہم سجدے میں سر جھکاتے ہی ہیں کہ وہ آنسوؤں کی طرح ہماری آنکھوں سے ٹپک پڑتے ہیں

کچھ لوگ آنکھوں کی طرح ہوتے ہیں

وہ ساتھ ہوں تو اندھیروں میں بھی راستہ مل جاتا ہے

کچھ لوگ گھروں کی طرح ہوتے ہیں

ہم جہاں بھی رہیں دل ان ہی کی سمت پلٹ آنے کو کرتا ہے

کچھ لوگ خیالوں کی طرح ہوتے ہیں

کہ انہیں بار بار پڑھ کر بھی دل نہیں بھرتا

کچھ لوگ آسمان کی طرح ہوتے ہیں

ہزار چاہنے پر بھی ہم انہیں چھو نہیں سکتے

کچھ لوگ دھڑکنوں کی طرح ہوتے ہیں

کہ اُن سے مل کر زندگی کا احساس ہوتا ہے

راحت وفا راجپوت۔ لاہور

اچھا بہن

لڑکی: اگر مجھ سے شادی کرنی ہے تو تمہیں ہر ماہ ہمارے گھر کا بجلی کا بل ادا کرنا ہوگا اور پاپا کو بیس لیٹر پیٹرول ڈلوانا ہوگا۔''

لڑکا: "اچھا بہن امی ابو کو میرا اسلام کہنا۔"

فضیلہ کریم ۔ زیارت

بخار

رسول ؐ نے فرمایا کہ بخار کو برا مت کہو کیونکہ وہ نبی آدم کے گناہوں کو ایسے دور کر دیتا ہے جیسے بھٹی لوہے کے میل کو دور کر دیتی ہے۔

نابینا پن

اگر کسی کو آپ میں کوئی خوبی نظر نہ آئے تو سیدھا اُسے گلے لگا لینا کیونکہ اندھوں کو محبت کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔

رازِ عدن ۔ بحرین

دو شعر

بات سجدوں کی نہیں خلوص نیت کی ہوتی ہے اقبال
اکثر لوگ خالی ہاتھ لوٹ آتے ہیں ہر نماز کے بعد

ہاتھ کی لکیریں بھی کتنی عجیب ہیں
کمبخت مٹھی میں ہیں لیکن قابو میں نہیں

عمرانہ ۔ کراچی

پاکستانیوں کی کچھ اچھی عادتیں

☆...... صابن جب ختم ہونے لگتا ہے تو نئے صابن کے ساتھ لگا دیتے ہیں۔

☆...... ٹوتھ پیسٹ ٹیوب کو رول کر کر کے استعمال کرتے ہیں۔

☆...... گھر میں رکھی خوبصورت کراکری صرف مہمانوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

☆...... سونے کی قیمت میں اضافے سے پریشان رہتے ہیں جبکہ سونا خریدنا بھی نہیں ہوتا۔

☆...... ٹی وی ریموٹ کے سیل تبدیل کرنے کے بجائے اس کو گھٹنے پر مار مار کر استعمال کرتے ہیں۔

☆...... پرانی قمیض کو نائٹ سوٹ بنا لیتے ہیں اور جب اس قابل بھی نہ رہے تو پوچا بنا لیتے ہیں۔

☆...... ایک بڑے شاپر میں بہت سارے شاپر ڈال کر رکھتے ہیں۔

کامران شیخ ۔ پنڈی

بدلہ

ان لوگوں سے مت ڈرو جو اپنا بدلہ لینا جانتے ہیں بلکہ ان لوگوں سے ڈرو جو اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔

اشعر عتیق ۔ کراچی

دو آدمیوں سے ہوشیار رہو

ایک وہ جو تم میں وہ عیب بتائے جو تم میں نہیں
دوسرا وہ جو تم میں وہ خوبی بتائے جو تم میں نہیں

کرن شہزادی ۔ راولپنڈی

رباعی

دکھ جی کے پسند ہوگیا ہے غالب
دل رُک کر بند ہوگیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہوگیا ہے غالب

سدرہ شیخ ۔ راولپنڈی

لطیفہ

ایک صاحب اپنی کار کے وہیل کیپ چرائے جانے پر بہت پریشان تھے آخر انہوں نے کار کے شیشے پر ایک چٹ لکھ کر لگا دی۔

"وہیل کیپ چرانے والے کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔" تھوڑی دیر بعد وہ صاحب جب واپس آئے تو وہیل کیپ وہیں پڑے تھے اور کار غائب تھی۔

نور العین ۔ اسلام آباد

غالب کہتے ہیں

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھے کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

یاسمین عمران۔ وزیر آباد

بشارت

نبی اکرمؐ نے جن 10 صحابہ کو دنیا ہی میں جنتی ہونے کی بشارت دی۔

"حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ، حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعد بن زیدؓ۔"

نارہ۔ ناروے

رات بستر پر جانے سے قبل یہ ضروری کام ضرور کریں

☆...... وضو
☆...... بستر کو جھاڑ لیں
☆...... آیت الکرسی پڑھیں
☆...... فجر کا الارم لگائیں
☆...... سونے کی دعا پڑھیں
☆...... سیدھے ہاتھ کروٹ پر سوئیں
☆...... معاف کریں اور بھول جائیں اور پھر سکون سے سو جائیں

فضا احمد۔ اسلام آباد

تنبیہہ

باپ نے بیٹے کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔
"دیکھو بیٹا! آج جو مہمان آرہا ہے اس کی ناک کے متعلق کوئی سوال مت کرنا۔"
جب مہمان گھر آگیا تو اُسے دیکھ کر بیٹے نے باپ کو کہا۔
"آپ تو کہتے تھے ان کی ناک کا ذکر نہ کرنا اِن کی تو ناک ہی نہیں ہے۔"

لاریب صدیقی۔ کراچی

بھول

دو ڈاکو بینک لوٹنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔
پروگرام سیٹ کرتے ہوئے پہلے ڈاکو نے کہا۔
"پہلے ہم بینک نمبر 1 لوٹیں گے پھر بینک نمبر 2 پھر بینک نمبر 4۔"
دوسرے ڈاکو نے کہا...... "تم بینک نمبر 3 تو بھول ہی گئے۔"
پہلے ڈاکو نے جواب دیا۔ "میں بھولا نہیں ہوں ہم جو بینک لوٹیں گے اس کی رقم بینک نمبر 3 میں جمع کرائیں گے۔"

شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

سنہری جملہ

میرا بیٹا تب تک میرا بیٹا ہے جب تک اس کی بیوی نہیں آجاتی اور میری بیٹی تب تک میری بیٹی ہے جب تک میری زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔

حمیرا ظفر۔ کراچی

سچی باتیں

دریا کے پانی اور آنکھ کے پانی میں صرف جذبات کا فرق ہوتا ہے۔
اپنا بچہ روئے تو دل میں درد ہوتا ہے اور دوسرے کا بچہ روئے تو سر میں۔
تہجد کے وقت آنکھ کھلے تو سمجھ لو آسمان سے کال آئی ہے سمجھدار ہو تو وصول کرلو۔
سچ پر چلنے والوں کا ہر قدم شیطان کے سینے پر ہوتا ہے۔
جتنی محنت سے لوگ جہنم خریدتے ہیں اس سے

آدھی محنت میں جنت ملتی ہے۔

ثمرہ علوی۔ پشاور

شعر

تصویر میں نے مانگی تھی شوخی تو دیکھیے
اک پھول اس نے بھیج دیا ہے گلاب کا

آفتاب۔ لندن

حیرت انگیز

حیرت انگیز باتوں کے بارے میں ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ نئی نسل کے لیے بالکل حیرت انگیز نہیں ہوتیں۔

نمرہ خان۔ کھاریاں

دلچسپ قرآنی معلومات

☆...... قرآن کریم میں 4 مسجدوں کے نام ہیں۔
☆...... مسجد الحرام، مسجد اقصیٰ، مسجد قبا، مسجد ضرار
☆...... قرآن کریم میں 4 پہاڑوں کے نام ہیں
☆...... طور، جودی، صفا، مروہ
☆...... قرآن کریم میں 4 دھاتوں کے نام ہیں
☆...... سونا، چاندی، تانبا، لوہا
☆...... قرآن کریم میں تین سبزیوں کے نام ہیں
☆...... پیاز، لہسن، ککڑی
☆...... قرآن کریم میں 3 درختوں کے نام ہیں
☆...... بیری، زیتون، کھجور

رضوانہ کوثر۔ لاہور

کالی مرچ

حد ہے کالی مرچ 1500 روپے کلو اگر گوری ہوتی تو کتنے نخرے کرتی۔

ثمر۔ کراچی

لطیفہ

ایک نوجوان پرانے کھنڈروں کی سیر کر رہا تھا کہ اچانک ایک گولی زناٹے کے ساتھ اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی گھبراہٹ میں نوجوان اوندھے منہ زمین پر گر پڑا، کچھ ہی دیر میں ایک حسین خاتون نے آکر اس سے کہا۔

''معاف کیجیے گا میں اپنی غلطی پر بے حد شرمندہ ہوں دور سے میں آپ کو اپنا شوہر سمجھی تھی۔''

زیب فضل۔ کوئٹہ

غزل

نہ فیصلہ تمہارا ہے، نہ فیصلہ ہمارا ہے
یہ وقت کے قزاق نے چھپا کے تیر مارا ہے
فقیہہ شہر! شب کو جو سفر میں میرے ساتھ تھا
وہ میں نے تیرے آستاں پہ خواب لا کے وارا ہے
پسِ غبارِ وقت یوں پکارتا ہے کون اب!
یہ ہجر و غم کا سلسلہ نجانے کیوں گوارا ہے
ستارگاں کی بزم میں اُداس چاند دیکھنا
نجانے کیسا خواب ہے، نجانے کیا اشارہ ہے
ہمیں یہ خواب تتلیاں تلاشنا ہیں عمر بھر
کہ ہاتھ خالی نکلے ہیں، چراغ ہے نہ تارہ ہے

شاعر: احمد سجاد بابر۔ لودھراں

غلطی اور حماقت میں فرق

ایک صاحب کسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بار بار غلطی اور حماقت کے الفاظ استعمال کر رہے تھے کہ حاضرین میں سے ایک شخص نے اٹھ کر پوچھا۔

''جناب، غلطی اور حماقت میں کیا فرق ہے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''اگر آپ مسجد میں اپنا پرانا جوتا بھول کر کسی کا نیا جوتا پہن لیں تو اسے غلطی کہتے ہیں اور اگر نیا جوتا بھول کر پرانا جوتا پہن لیں تو اسے حماقت کہتے ہیں۔''

صوفیہ احمد۔ میلسی

نئے لہجے نئی آوازیں

بھول گئی

اپنے دل کا حال سنانا بھول گئی
کیا تھی دل کی بات بتانا بھول گئی
تجھ کو دیکھا تو یہ آنکھیں بھیگ گئیں
اور نینوں سے نیر بہانا بھول گئی
جن گلیوں میں تیرا آنا جانا تھا
ان گلیوں میں آنا جانا بھول گئی
میں تو اب بھی وصل کی لمبی راتوں میں
آنکھوں میں کچھ خواب سجانا بھول گئی
بھول گئی تم کون سے رستے آتے ہو
ان رستوں پہ پھول بچھانا بھول گئی
بھول گئے تم دیس پرائے بھول گئے
میں بھی تیری آس لگانا بھول گئی
آج فریدہ فری اس نے آنا تھا
بالوں میں بھی پھول لگانا بھول گئی

شاعرہ: فریدہ جاوید فری۔ لاہور

واہمہ ہی حقیقت تھی

سیاہ شب حیات میں وہ جگنوؤں کا نور تھا
قلزم کفار میں صداقتوں کا طُور تھا
مگر......
وہ دل کے دیس میں کسی کا بت سجائے تھا
اگرچہ میرے پاس تھا
پر کسی کی روح بسائے تھا
قرین دل جو آیا وہ
تو واہمہ اک تھا فقط
جو......اس قدر عظیم تھا
حریصِ جسم تھا فقط!

شاعرہ: راحت وفا راجپوت۔ لاہور

بے خبر......

بھیگی ہیں پلکیں کیوں اسے کیا معلوم
رات بے چین کٹی اسے کیا معلوم
وہ ہے بے خبر میرے دل کے درد سے
دھڑکنیں ادھوری ہیں اسے کیا معلوم
میرے قریب ہوتے ہوئے بھی دور ہے
فاصلے کیا ہوتے ہیں اُسے کیا معلوم
چاند کے گرد ستاروں کا ہے کیوں ہجوم
چاندنی سے منور ہے دنیا اسے کیا معلوم
اس کی سادگی میں بھی معصومیت ہے
میں اس سے کیوں روٹھی ہوں اسے کیا معلوم

شاعرہ: شبانہ نسیم۔ جہانگیر آباد کراچی

زندگی کی ناؤ

زندگی کی ناؤ نے وقت کے سمندر میں
ڈوبتا ابھرتا سا ایک جزیرہ اُلفت کا
کھوج ہی لیا آخر
کہ جہاں پہ ہر شب ہی
یاد کی گھٹاؤں سے بارشوں کا خطرہ ہے
ناامیدی کے طوفاں جب کبھی بھی آتے ہیں
یہ ڈوب جاتا ہے
خودرو آس کی بیلیں خواب کے گھنے پن میں
خواہشوں کے پیڑوں سے پھر بھی لپٹی رہتی ہیں
آرزو کے پھولوں سے یہ مہکتا رہتا ہے
انتظار کی کلیاں بھی چٹکتی رہتی ہیں
سب ہی اس جزیرے کے حسن پر فدا ہو کر
دو گھڑی کو رکتے ہیں ٹھہرتا نہیں کوئی

اور کچھ ہیں ہم جیسے......
چاہتوں کے سائے میں
چند لمحے بتانے کو اس کے بَن میں پھرتے ہیں
ساتھ اِس جزیرے کے ڈوبتے ابھرتے ہیں
شاعرہ: خولہ عرفان۔ کراچی

اور کچھ نہیں ہوتا

پچھلے چند سالوں سے جب بھی عید آتی ہے
عید سے ذرا پہلے......
میری بے قرار آنکھیں، جا کے ٹھہر جاتی ہیں
بے رنگ ہتھیلی پر، سُونی سی کلائی پر
نہ ہی کوئی چوڑی ہے، نہ ہی رنگِ مہندی ہے
میرا خود سے وعدہ تھا ایسی عید آئے گی
جس میں ساتھ ہوں گے ہم
خوشبوؤں میں گھر کے میں
سرخ چوڑیاں پہنے، مہندی بھی لگاؤں گی
خوب گنگناؤں گی......
کب وہ عید آئے گی، جس میں ساتھ ہوں گے ہم
اور کچھ نہیں ہوتا
عید سے ذرا پہلے
یاد بہت آتے ہو
شاعرہ: فرح علی۔ کراچی

میری بھی عید، عید کر دو نا

دیکھو رمضان بھی اب مکمل ہے
اور اب عید آنے والی ہے
مجھ سے مل کر مجھے خوشی دے دو
غم کو مجھ سے بعید کر دو نا......
تم ہتھیلی پہ میرا نام لکھو
ایسی ساعت سعید کر دو نا
ساتھ تم میرا عمر بھر دو گے
کوئی وعدہ وعید کر دو نا
اب کے آ جاؤ بس مجھے ملنے
میری بھی عید، عید کر دو نا
شاعر: عماد حسین انصاری۔ کراچی

دکھ

مجھے اکثر یہ بات بے چین رکھتی تھی
آخر تمہارے دل و دماغ میں ایسا کیا چل رہا ہے
پر تمہارے ہونٹوں پر
بات کیوں نہ آئی کہ
تمہارے دل کے کونے میں
کوئی اور بھی رہتا ہے
جس سے میں لاعلم ہوں؟
کاش! تم مجھے پہلے بتا دیتے
تو آج اتنا نہ دکھ ہوتا
شاعر: مہیسر عامر۔ لاڑکانہ

غزل

تیرگی میں روشنی مہنگی پڑی
چاند سے بھی دوستی مہنگی پڑی
اب زمیں پہ پھر رہے ہیں در بدر
آسماں سے دشمنی مہنگی پڑی
لائی ہوں دونوں جہاں دے کر اُسے
کیا محبت بھی کبھی مہنگی پڑی
عمر بھر کے دُکھ گنوانے پڑ گئے
زندگی میں اِک خوشی مہنگی پڑی
ایک دل تھا اور وہ جاتا رہا
اہلِ دل کو دل لگی مہنگی پڑی
ہم نے تمثیلہ اٹھائے دکھ ہی دکھ
سچ ہے یہ زندگی مہنگی پڑی
شاعرہ: تمثیلہ لطیف۔ پسرور

منی اسکرین

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

م ش خ

قارئین گرامی ARY ڈیجیٹل نیٹ ورک کی جانب سے عید کا پُرخلوص سلام قبول کیجیے جب آپ اس آرٹیکل کو پڑھ رہے ہوں گے تو آپ کو عید کی خوشیاں ہر جانب بکھری نظر آئیں گی۔ رمضان میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لیے ARY نیٹ ورک نے خوبصورت پروگرام ناظرین کو دکھائے۔ شان رمضان اپنی مثال آپ تھا تو جیتو پاکستان لاجواب تھا۔ QTV نے داتا دربار سے جو لائیو تراویح کا اہتمام کیا۔ اُس کو ناظرین کی بڑی تعداد نے پسند کیا۔ اور کیوٹی وی سے ایسے خوبصورت پروگرام پیش کیے گئے کہ جنون جوش سے ہر آنکھ اشکبار تھی اور اس میں کوئی شک نہیں خہ اس کے مذہبی پروگرام لائق تحسین تھے اور اس کے پروگراموں میں خداوند کریم سے گڑگڑا کر دعائیں بھی مانگی گئیں اور خدا کرے ہمارے اور ملک کے لیے مانے جانے والی دعائیں قبول ہو آمین ثم آمین آیئے ناظرین اب حلتے ہیں ARY ڈیجیٹل نیٹ ورک کے پروگرام کی طرف سیریل ''اب کر میری رفو گری'' کو ناظرین بہت پسند کر رہے ہیں کیونکہ عثمان پیرزادہ ٹی وی کے بہت سینئر فنکاروں میں شمار ہوتے ہیں جب بھی کسی سیریل میں آتے ہیں رنگ جما کر جاتے ہیں۔ حمیرا اظہر کا اپنا انداز ہے اور یہ بھی کافی عرصے سے شائقین کے دلوں میں جگہ بنائے ہوئے ہیں۔ سکینہ سموں کی اداکاری تو اپنی مثال آپ ہے۔ سیریل ''اب کر میری رفو گری'' کو تحریر کیا ہے سارہ ریاض نے جبکہ ہدایت عدنان وائی قریشی کی ہیں۔ یہ سیریل ARY ڈیجیٹل سے دیکھائی جا رہی ہے۔ سیریل ''تم یاد آئے'' کے حوالے سے گزشتہ دنوں اداکار ندیم سے ایک مقامی ہوٹل میں تفصیلی ملاقات ہوئی ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اداکار ندیم نے بتایا کہ آج کل کے نوجوان ٹی وی آرٹسٹ بھی اچھی پرفارمنس دے رہے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ARY ڈیجیٹل کی سیریل ''تم یاد آئے'' میں مجھے کام کرنا بہت اچھا لگا اور لوگوں نے میرے کام کو پسند کیا ایک فنکار اپنے پرستاروں سے بس یہ توقع رکھتا ہے۔ ثانیہ سعید سے ملاقات ARY میں ہوئی انہوں نے سیریل ''تم یاد آئے'' کے حوالے سے بتایا کہ بندیم صاحب بڑے فنکار ہیں مجھے اُن کے ساتھ کام کرنا بہت اچھا لگا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سیریل ''تم یاد آئے'' میں لوگ ندیم صاحب کو پسند کر رہے ہیں۔ سیریل 'تم یاد آئے' بہت

ARY ڈیجیٹل سے دیکھائی جارہی ہے ARY ڈیجیٹل سے آن ایئر ہونے والی سیریل ''میرا یار ملا دے'' اپنی مثال آپ ہے اور شائقین ٹی وی میں بہت پسند کی جارہی ہے اس سیریل میں فیصل قریشی نے اچھی اداکاری کر کے ثابت کر دیا کہ وہ بھی اب سینئرز میں شامل ہو گئے ہیں جبکہ فردوس جمال نے اس سیریل میں اپنے آپ کو منوالیا ہے اور سینئر اداکارہ عائشہ خان نے اپنے کردار کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے خوبصورت اداکاری کر کے اپنے کردار میں جان ڈال دی ہے اداکارہ دیکھائی جارہی ہے اس سیریل کو تحریر کیا ہے خائزہ افتخار نے جبکہ ہدایت ندیم بیگ کی ہیں۔ سیریل ''انابیہ'' مقبولیت کی جانب رواں دواں ہے انابیہ ایک خوبصورت لڑکی ہے مگر ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے ناسور کی لپیٹ میں آجاتی ہے نیلم منیر نے اپنے کردار میں ڈوب کر اداکاری کی ہے اور وہ اس میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ وسیم عباس ٹی وی کے علاوہ فلم کے بھی منجھے ہوئے اداکار ہیں اور اُن کو اداکاری ورثے میں ملی ہے عنایت حسین بھٹی مرحوم اور کیفی مرحوم انڈسٹری کے بڑے نام

ARY زندگی کی سیریل 'دل ہاری' میں روبینہ اشرف اور ARY ڈیجیٹل کی سیریل 'تم یاد آئے' میں ثانیہ سعید

سجل علی نے خوبصورت اداکاری کر کے اپنے آپ کو منوانے کی پوری کوشش کی ہے۔ سیریل 'میرا یار ملا دے' ARY ڈیجیٹل سے دیکھائی جارہی ہے۔ سیریل 'دل لگی' تو اپنی مثال آپ ہے ہمایوں سعید اور مہوش حیات کی خوبصورت اداکاری نے اس سیریل میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ مہوش حیات اچھی رقاصہ تو ہیں مگر انہوں نے ARY کی سیریل 'دل لگی' میں خوبصورت اداکاری کر کے اپنے آپ کو بحیثیت اداکارہ کے بھی منوالیا ہے۔ سیریل 'دل لگی' ڈیجیٹل سے تھے اور ان کا تعلق بھی انہی ناموں سے جڑا ہوا ہے وسیم عباس ٹی وی پر آئے اور چھا گئے انابیہ سیریل میں اُن کی اداکاری قابل تعریف ہے اس سیریل کو تحریر کیا ہے عاطف علی نے یہ سیریل ڈیجیٹل سے دیکھائی جارہی ہے۔ سیریل 'کھوٹ' کا تذکرہ نہ کرنا زیادتی کے زمرے میں ہوگا کیونکہ فردوس جمال نے اپنی اداکاری کی خوبصورت روایات کو برقرار رکھا جبکہ جاوید شیخ فن کا چراغ لیے اس سیریل میں آئے اور چھا گئے ماریہ واسطی اچھی اداکارہ ہیں۔ انہوں نے سیریل 'کھوٹ' میں

خوب اداکاری کی اسلم شیخ ٹی وی کے بڑے اداکار ہیں۔ انہوں نے اس سیریل میں اپنے کردار کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کیے۔ ژالے سرحدی نے بہت اچھی اداکاری کی اور یوں سیریل 'کھوٹ' میں چار چاند لگ گئے سیریل کھوٹ ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جارہی ہے آیئے اب چلتے ہیں ARY زندگی کے پروگراموں کی طرف سیریل ''بے درودیوار'' میں فیصل رحمان نے جم کے اداکاری کرکے اپنے آپ کو منجھا ہوا اداکار تسلیم کروالیا اُس کی وجہ شاید

عمران بیگ نے سوپ 'بے گناہ' پر بہت محنت کی ہے اور پھر مصنف دلاور خان نے بھی خوبصورت تحریر لکھ کر سوپ میں جان ڈال دی اور شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ اسے شوق سے دیکھ رہے ہیں۔ قاضی واجد سینئر فنکار ہیں اور اُن کی برجستہ اداکاری نے تمام فنکاروں میں سیکھنے کا جذبہ اُجاگر کیا ہے۔ سوپ بے گناہ ARY زندگی سے دیکھایا جارہا ہے قارئین گرامی اب چلتے ہیں QTV کے روح پرور پروگراموں کی طرف 'بصیرت القرآن' پیر سے لے کر جمعرات تک صبح نو بجے

ARY ڈیجیٹل کی سیریل 'دل لگی' میں ہمایوں سعید اور مہوش حیات

یہ ہے کہ اس سیریل کے ہدایت کار عثمان پیرزادہ ہیں۔ جو خود بھی بہت بڑے ٹی وی آرٹسٹ ہیں اور ثمینہ اعجاز ہمیشہ اچھی تحریریں لکھتی ہیں اور ظاہر ان تمام چیزوں سے یکجا ہوکر سیریل 'بے درودیوار' کو بہترین سیریل کی قطار میں لاکھڑا کیا۔ ARY زندگی سے آن ایئر ہونے والے سوپ 'بے گناہ' کو ناظرین ٹی وی بہت شوق و ذوق سے دیکھ رہے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ہدایت کار

'قرآن سنیے اور سنایئے'' پیر سے جمعہ شام چار بجے 'میری پہچان' پیر اور منگل شام سات بجے 'روحانی دنیا' رات بارہ بجے 'دین اور خواتین' بدھ اور جمعرات شام سات بجے 'ذوق نعت' ہفتہ شام سات بجے 'ترتیل القرآن' جمعہ صبح 11 بجے 'روشنی' رات 10 بجے منگل سے جمعرات 'کتاب اور قلم' پیر رات 8 بجے 'صبح بخیر' بروز اتوار 10 بجے QTV سے پیش کیے جائیں گے۔

☆☆......☆☆

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

'بلائنڈ لو'

عیدالفطر کے موقع پر ریلیز ہونے والی فلم 'بلائنڈ لو' میں متیرا ایک آئٹم سانگ پیش کررہی

ہیں جس کا نام ہے 'برجوانی' یہ فلم متیرا کی لولی وڈ ڈیبو فلم ہے۔ متیرا کا کہنا ہے کہ یہ فلم عید پر دوستوں اور مداحوں کے لیے عیدی ہوگی۔

صبا قمر بھی بولی وڈ کو پیاری

فواد خان کے بعد اب صبا قمر اور عدنان صدیقی بھی بالی وڈ میں اپنا جادو جگائیں گے۔

عدنان صدیقی فلم 'مام' میں سری دیوی کے شوہر کا کردار ادا کررہے ہیں جبکہ صبا قمر مشہور بھارتی اداکار عرفان خان کی بیوی کے روپ میں نظر آئیں گی۔ صبا قمر کا کہنا ہے کہ ان کی فلم ایک اچھی فیملی پکچر ہے جو تمام گھر والے ایک ساتھ بیٹھ کر

دیکھ سکتے ہیں۔

اُڈاری

احسن خان کہتے ہیں کہ ڈرامہ اڈاری میں وہی کچھ دکھایا جارہا ہے جو ہمارے معاشرے میں

ہوتا ہے۔ معاشرتی بدصورتی دکھانے کا مقصد صرف لوگوں میں شعور پیدا کرنا ہے۔ اس سے قبل طوائف، نشے، کرپشن، شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے غیر عورتوں اور مردوں سے تعلقات پر لاتعداد ڈرامے بنائے جاچکے ہیں اب اڈاری کے ذریعے ماؤں کو پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ اپنی بچیوں کے معاملے میں کسی پر بھروسہ نہ کریں۔

تانیہ ویلز اِن کراچی

برطانوی گلوکارہ تانیہ ویلز اگست میں پاکستان کا دورہ کریں گی۔ ان کو اردو زبان سے

بہت محبت ہے اسی لیے انہوں نے اردو سیکھی ہے اور اس میں گانے بھی گاتی ہیں۔ نصرت فتح علی خان ان کے پسندیدہ گلوکار ہیں۔ انہوں نے یہ تمام بات چیت اسکائپ کے ذریعے کراچی پریس کلب میں رکھی گئی ایک کانفرنس میں کی۔

تیری میری لو اسٹوری

فلم تیری میری لو اسٹوری کی شوٹنگ ناران میں چل رہی ہے اور اب اپنے آخری مراحل میں داخل ہوگئی ہے جواد بشیر کی یہ فلم ایک ہلکی پھلکی

رومانوی فلم ہے جو ناظرین کو یقیناً بہت پسند آئے گی فلم کی کاسٹ میں عشنا شاہ اور محبّ مرزا کے علاوہ سلمان شاہد اور لیلیٰ زبیری شامل ہیں۔ امید ہے کہ یہ فلم اپنے خوبصورت مناظر اور مضبوط اسکرپٹ کی وجہ سے دیکھنے والوں کو بہت پسند آئے گی۔

ہوٹل بند ہوگیا

اداکارہ میرا اپنی فلم 'ہوٹل' کی ناکامی پر دل

برداشتہ ہوکر رو پڑیں۔ میرا نے یہ فلم چار سال قبل

شروع کی تھی اور انہیں یقین تھا کہ یہ فلم اچھا بزنس کرے گی مگر فلم شائقین کو بالکل متاثر نہ کرسکی اور یوں میرا جی کے بلند و بانگ دعوے اور بے شمار پیسہ سب ڈوب گیا۔

تقریب رونمائی

لائیک فادر لائیک سن کی تقریب رونمائی ایبٹ آباد میں ہوئی یہ کتاب پاکستانی فلمی صنعت

کے مایہ ناز اداکار آصف خان اور ان کے صاحبزادے ارباز خان جو خود ایک بہت بڑا نام ہیں پشتو فلموں کا ان کو سوانح حیات اور فنی زندگی پر مشتمل ہے۔ نامور فلمی ستاروں اور ہزارہ کے مشہور گلوکاروں کی شرکت نے اس تقریب کو چار چاند لگا دیے۔

بھائی وانٹڈ

پاکستان فلم انڈسٹری کے مایہ ناز ڈائریکٹر سید

نور ان دونوں کراچی کے علاقے لیاری میں اپنی فلم بھائی وانٹڈ کی عکس بندی میں مصروف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ لیاری کا مثبت چہرہ دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں ان کی یونٹ کی آمد پر علاقہ مکینوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ سید نور سندھ پولیس اور رینجرز کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے کام میں حائل مشکلات کو دور کیا...... فلم کی کاسٹ میں معمر رانا اور دانش نواز سر فہرست ہیں۔

عمر شریف کا اسپتال "ماں"

عمر شریف صاحب نے ماں' اسپتال مکمل کرلیا ہے اور 11 جولائی کو اس کا شاندار افتتاح کیا

جائے گا۔ اورنگی میں بنایا جانے والا یہ اسپتال غریب عوام کے لیے ماں کی آغوش ثابت ہوگا ان خیالات کا اظہار عمر شریف صاحب نے صحافیوں کو اسپتال کا دورہ کراتے ہوئے کیا۔ انہوں نے مزید کہا یہ کراچی پر میرا قرض تھا جو پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اسپتال کے گائنی وارڈ کا نام ابھی نہیں رکھا گیا ہے جس پہلے بچے کی اس وارڈ میں پیدائش ہوگی اسی کے نام پر وارڈ کا نام رکھا جائے گا۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

بریڈ حلوہ

اجزاء

ڈبل روٹی	10 سے 12 سلائسز
دودھ	6 کپ
چینی	ڈیڑھ کپ
گھی	چار کھانے کے چمچ
ہری الائچی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
کاجو	4 کھانے کے چمچ

ترکیب:

سب سے پہلے ڈبل روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ فرائنگ پین میں گھی ڈال کر اس میں ڈبل روٹی کے ٹکڑے تل لیں، جب وہ گولڈن ہونے لگیں تو انہیں الٹ پلٹ ضرور کریں، پھر اس میں دودھ اور چینی بھی ڈال دیں، اچھی طرح سب چیزوں کو مکس کریں۔ دھیمی آنچ پر مستقل چمچ چلا کر ڈبل روٹی کو میش کرتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب حلوہ گاڑھا ہوجائے تو گھی میں تلے ہوئے کاجو اور الائچی پاؤڈر کو چھڑک دیں، بریڈ حلوہ تیار ہے۔

اسپائسی چکن کٹلٹس

اجزاء

مرغی (بغیر ہڈی)	آدھا کلو
آلو	ایک عدد (بڑا چوکور ٹکڑوں میں کاٹ لیں)
پیاز	2 کپ (چاپ کرلیں)
ہری مرچیں	تین عدد (چاپ کرلیں)
پودینہ	2 کھانے کے چمچ (چاپ کرلیں)
انڈہ	ایک عدد
بریڈ کرمبز	ڈیڑھ کپ

ترکیب:

مرغی کو دھوکر بوائل کرلیں اور پھر ریشے الگ کرلیں، آلو کو بھی بوائل کرلیں اور میش کرکے رکھ دیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کرکے اس میں پیاز ڈالیں، پھر ادرک لہسن پیسٹ ڈال کر فرائی کریں۔ ہری مرچیں اور ریشہ کی ہوئی چکن ڈال دیں، ساتھ ہی میش کیے ہوئے آلو بھی شامل کردیں۔ پھر اس میں ہلدی پاؤڈر، سرخ مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، گرم مسالحہ پاؤڈر، نمک اور کالی مرچ پاؤڈر شامل کریں۔ اچھی طرح مکس کریں، پھر اس میں ہرا دھنیا اور پودینہ شامل کرکے مکس کریں۔ چار سے پانچ منٹ تک پکائیں، چولہے سے اُتارلیں اور ٹھنڈا ہونے دیں۔ ایک پیالے میں انڈا پھینٹ لیں اور پلیٹ میں بریڈ کرمبز ڈالیں۔ تیار مکسچر سے بالز بنا کر انہیں اپنی مرضی کا شیپ دے کر پہلے انڈہ پھینٹ

لیں اور پھر بریڈ کرمبز میں کوٹ کریں، پھر فرائی کرلیں۔ جب گولڈن ہو جائیں تو ڈش میں نکال لیں، ٹماٹو کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

لال آلو

اجزاء

آلو	ایک کلو (چھوٹے، ابلے ہوئے)
کشمیری لال مرچ	دس عدد
املی کا گودا	ایک کپ
ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ (بھون کر پیس لیں)
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ (بھون کر پیس لیں)
نمک	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
چاٹ مسالہ	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
چینی	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ
کڑی پتے	پچیس عدد
ہرا دھنیا	گارنشنگ کے لیے

ترکیب:

کشمیری لال مرچوں کو گرائنڈر میں پیس کر ان کا پیسٹ بنالیں۔ پھر ایک پین میں تیل گرم کر کے اس میں زیرہ، کڑی پتے اور لہسن ادرک شامل کر کے ایک منٹ فرائی کریں۔ پھر اس میں لال مرچوں کا پیسٹ، املی کا گودا، نمک، چینی، بھنا اور پسا ہوا دھنیا، بھنا اور پسا ہوا زیرہ شامل کر کے بھونیں۔ یہاں تک کہ تیل، مسالے سے الگ نظر آنے لگے۔ اب اس میں اُبلے ہوئے آلو شامل کر کے ایک سے دو منٹ تک فرائی کریں۔ پھر اوپر سے چاٹ مسالہ چھڑک کر ایک بار پھر اچھی طرح چمچہ چلائیں۔ آخر میں باریک کٹا ہوا ہرا دھنیا چھڑک کر پانچ منٹ کے لیے دم پر لگادیں۔ مزیدار چٹ پٹے لال آلو تیار ہیں۔

روٹی یا سادہ چاولوں کے ہمراہ نوش کریں۔

پالک قیمہ

اجزاء

قیمہ	آدھا کلو
تیل	آدھا کپ
پیاز	ایک عدد (سلائس کی ہوئی)
نمک	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ (کٹا ہوا)
دہی	آدھا کپ
پالک	آدھا کلو
میتھی کی گٹھی	چار عدد (چھوٹی)
سویا	ایک گٹھی
دودھ	آدھا کپ
ہری مرچ	حسبِ ضرورت
ہرا دھنیا	حسبِ ضرورت

ترکیب:

پالک کو اچھی طرح دھو کر میتھی اور سویا کی گٹھی کے ساتھ چوپر میں دو سے تین بار پیس لیں۔ اب تیل گرم کر کے اس میں پیاز بادامی کرلیں۔ پھر اس میں لہسن ادرک پیسٹ اور قیمہ شامل کر کے اچھی طرح فرائی کرلیں۔ اب اس میں نمک، ہلدی، زیرہ اور لال مرچ پاؤڈر شامل کریں اور ایک سے دو منٹ تک فرائی کریں۔ پھر آدھا کپ پانی شامل کر کے ڈھانپ دیں اور قیمہ گلنے تک پکائیں۔ اس کے بعد دہی شامل کر کے اچھی طرح فرائی کرلیں۔ اب پالک، میتھی اور سویا کے مکسچر کو دودھ کے ساتھ شامل کریں۔ آخر میں ہری مرچیں اور ہرا دھنیا ڈال کر دم پر لگادیں۔

بے بی کارن رائس

اجزاء

باسمتی چاول	ایک کپ
بے بی کارن	12 سے 14 عدد
زیرہ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
دار چینی	ایک چھوٹا ٹکڑا
تیز پتہ	ایک عدد (چھوٹا)
ہری الائچی	2 سے 3 عدد
لونگ	2 سے 3 عدد
پیاز	درمیانی (چاپ کریں)
ہلدی، سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
دھنیا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
پانی	2 کپ
نمک	حسب ضرورت
تازہ دھنیا	1 سے 2 کھانے کے چمچ
تیل	دو کھانے کے چمچ
پیسٹ بنانے کے لیے	ٹماٹر ایک عدد (درمیانہ)
دھنیا	ایک چوتھائی کپ
ہری مرچیں	دو دو عدد
ادرک	آدھا انچ (چاپ کریں)
لہسن	3 سے 4 عدد (چاپ کریں)

ترکیب:

سب سے پہلے چاولوں کو پانی میں 30 منٹ کے لیے بھگو دیں۔ گرائنڈر میں پیسٹ بنانے کے لیے ٹماٹر، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، ادرک، لہسن ڈالیں۔ مشین چلا دیں، چٹنی تیار ہے (اس چٹنی کو تیار کرنے کے دوران پانی نہیں ڈالنا ہے) اس کے بعد ایک دیگچی میں تیل ڈال کر گرم کریں اور تمام ثابت مسالہ اس میں ڈال دیں۔ پھر اس میں پیاز ڈالیں، جب وہ ہلکا گولڈن ہو جائے تو اس میں بنایا ہوا چٹنی پیسٹ شامل کر دیں۔ ہلکی آنچ میں دو منٹ تک اس چٹنی کو پکائیں۔ پھر اس میں ہلدی، سرخ مرچ پاؤڈر، سلائس کیے ہوئے بے بی کارن ڈال کر مکس کریں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس میں چاول شامل کر دیں اور اس میں ڈیڑھ سے دو کپ جتنا پانی ڈالیں۔ ساتھ ہی نمک بھی شامل کر دیں۔ اس موقع پر نمک ضرور چیک کریں، نمک تھوڑا تیکھا ہونا چاہیے۔ پھر ڈھکن ڈھک کر پانی خشک ہونے تک اسے پکائیں۔ چاولوں کو چمچ کی مدد سے نیچے کریں۔ جب ایک کنی رہ جائے تو دم پر رکھ دیں۔ تیار ہو جائے تو پلیٹ میں نکال کر بھٹے کے سلائس سے گارنش کریں۔ بے بی کارن رائس تیار ہیں۔

چیزی گارلک بریڈ

اجزاء

بریڈ سلائسز	4 سے 5 عدد
مکھن	دو کھانے کے چمچ
لہسن	تین سے چار عدد
چیز	آدھا کپ
کالی مرچ پاؤڈر	حسب ضرورت
کُٹی لال مرچ	حسب ضرورت
اوریگینو	حسب ضرورت
نمک	حسب ضرورت

ترکیب:

اوون کو 200 ڈگری پر پری ہیٹ کرلیں۔

ایک باؤل میں دو کھانے کے چمچ مکھن ڈال دیں، ساتھ ہی چٹکی بھر نمک ڈال دیں۔ لہسن کو چاپ کر کے مکھن میں اچھی طرح مکس کرلیں۔ اب چیز کو کدو کش کرلیں (آدھا کپ) پھر اس میں اوریگینو، کٹی لال مرچ، کالی مرچ ڈال کر مکس کرلیں۔ بیکنگ کو گریس کرلیں، سلائسز پر مکھن والا مکسچر لگائیں اور پانچ سے چھ منٹ تک بیک کریں۔ گرما گرم چیزی گارلک بریڈ تیار ہے۔

☆☆......☆☆